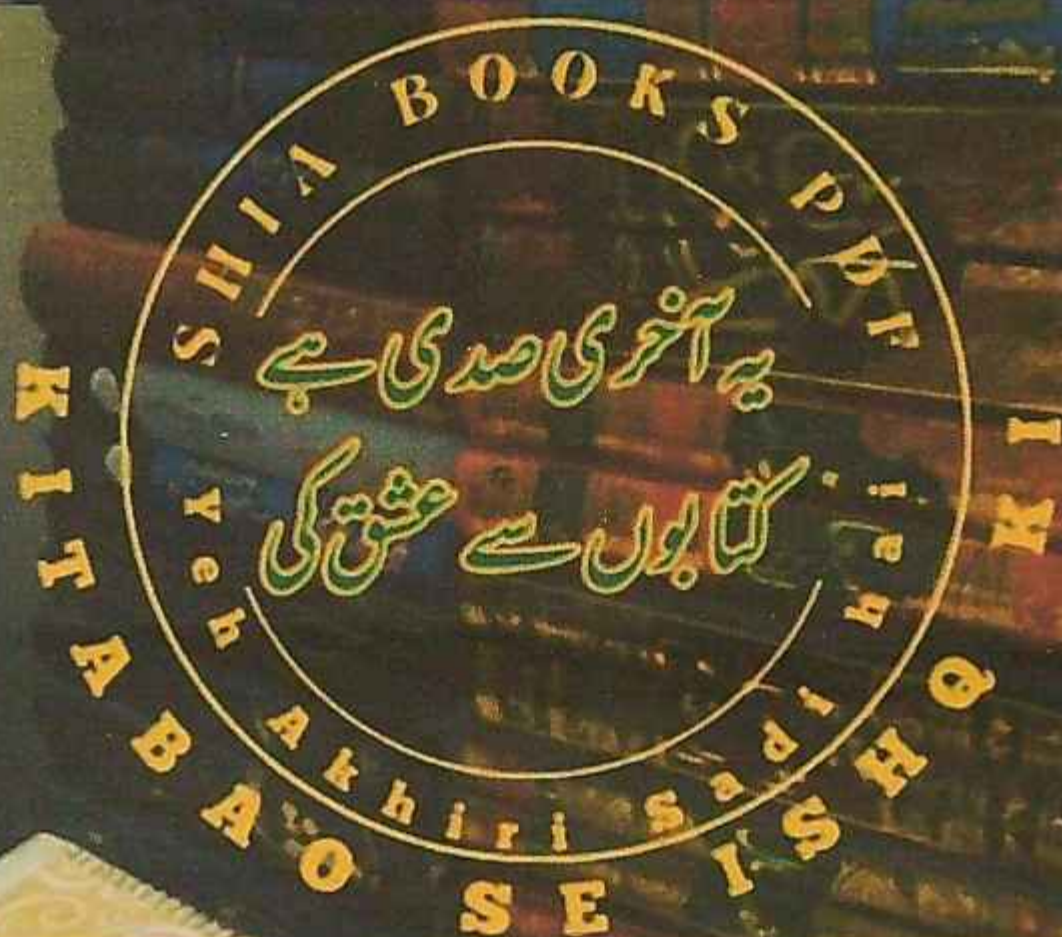


بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

Shia Books PDF منظر ایلپاء

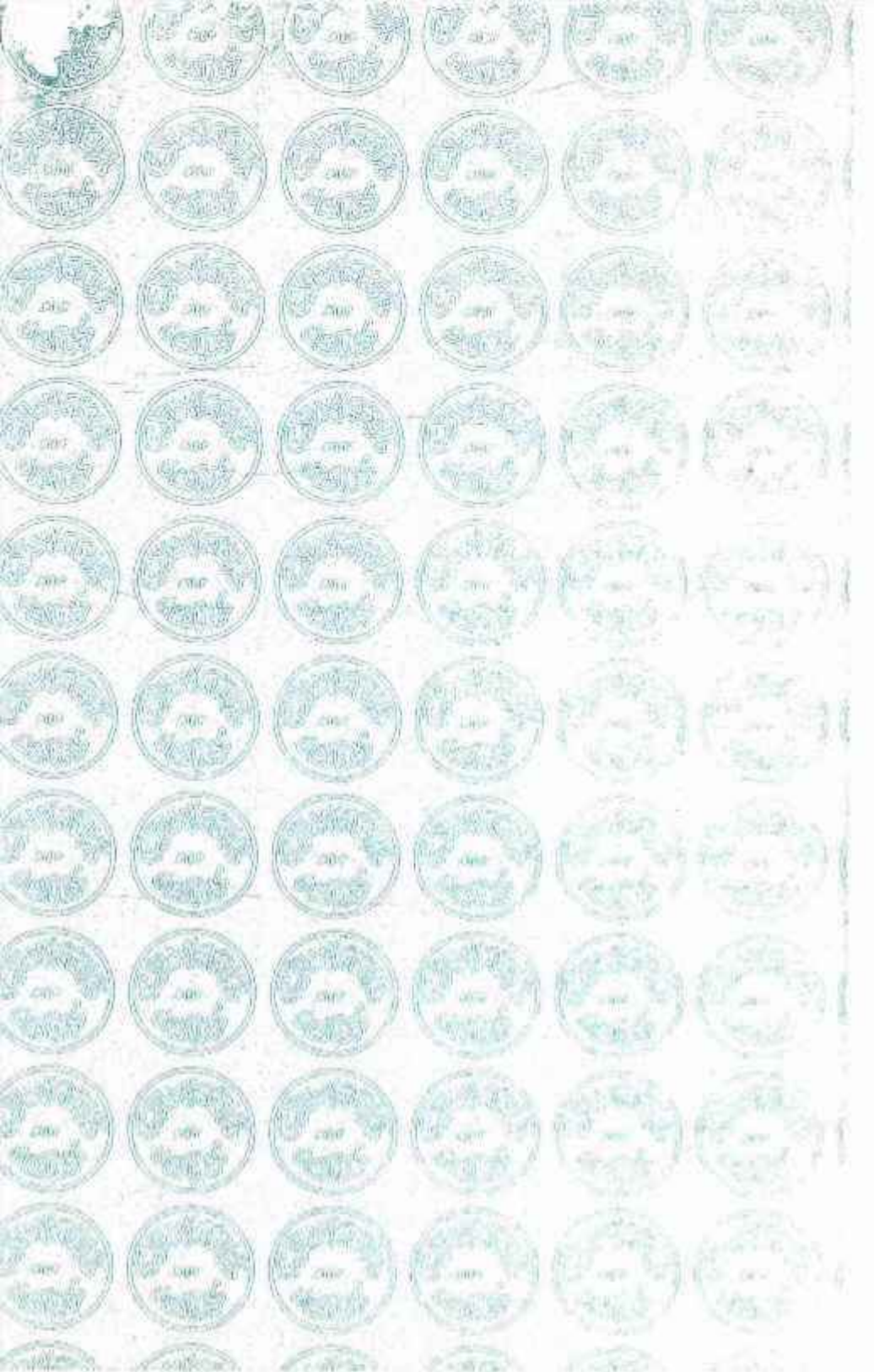


MANZAR AELIYA
9391287881
HYDERABAD INDIA

انبیاءِ قرآن

(آدم، نوح، ابراہیمؑ)

سید علی شرف الدین موسوی علی آبادی





180

مختار آقا خان بابا کی تحریر

تاریخ تالیف ۱۲۸۰ھ

طبع ۱۳۰۰ھ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب ----- انبیاء قرآن (آدم، نوح، ابراہیم)

تالیف ----- سید علی شرف الدین موسوی علی آبادی

ناشر ----- دار الثقافة الاسلامیہ پاکستان

سال طباعت ----- ذی الحجۃ المحرم ۱۴۲۳ھ، ق

عرضِ ناشر

حمد و ستائش اس ذات باری تعالیٰ کے لئے مختص ہے، جو ہر غیب و نہان سے واقف ہیں:

﴿وَمَا تَحْصِرُ مِنْ غَيْبٍ مِّنْ أَمَّا مَاهَا وَسَاتِحَلُّ مِنْ أُنْثَىٰ وَلَا تَضَعُ
الْأَعْلَامُ﴾ ”اس کے علم کے بغیر نہ کوئی پھل اپنے شکوفوں سے لگتا ہے اور نہ کوئی مادہ حاملہ
ہوتی ہے اور نہ جنتی ہے“ (فصلت/۴۷)

جو اپنے بندوں کی سرفرازی سے واقف و آگاہ ہے:

﴿وَيَعْلَمُ مَا تَخْفُونَ وَمَا تَعْلَنُونَ﴾

”اور وہ تمہارے پوشیدہ اور ظاہری اعمال کو جانتا ہے؟“ (نمل/۲۵)

حمد اس ذات کیلئے جس کے قبضہ میں بندوں کی رگ حیات ہے:

﴿مَنْ ذَا الَّذِي يَحْضَرُكَ﴾ ”کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی پیشانی اللہ کی

گرفت میں نہ ہو“ (ہود/۵۶) (خمن ۳۱)

حمد اس ذات کیلئے جس نے انسان کو دو گراں بہا جنتوں سے نوازا، جن میں سے ایک جنت باطنی
ہے جسے روایات میں عقل کہا گیا ہے، حمد اس ذات کیلئے جس نے انسانوں کی عقل کی تربیت و
رہنمائی کیلئے دوسری جنت یعنی انبیاء کو مبعوث کیا، حمد اس ذات کیلئے جس نے اپنی ندائے حق کو تمام
بندوں تک پہنچایا، حمد اس ذات کیلئے جس نے ہر لمحہ، ہر جگہ کوئی نہ کوئی ڈرانے اور بشارت دینے والا
بھیجا ہے۔

تمام تعریفیں اس ذات جلال و جمال کیلئے مخصوص ہیں جس نے مخلوق تراپی

(خاک) کو موجود ملائکہ قرار دیا، تمام اطاعت و بندگی اس ذات لایزال کیلئے مختص ہے جس کی اطاعت و فرمانبرداری سے جو بھی سرکشی کرتا ہے وہ مردود و ملعون قرار پانے کے مستحق ہے، تمام تعریفیں اس ذات کیلئے لائق و سزاوار ہیں جس نے زمین و آسمان میں اپنی نعمتوں کے ڈھیر لگا کر انسان سے خطاب کیا میری نعمتیں تمہارے حساب و کتاب سے باہر ہیں:

﴿وَان تَعْدُوا نَعَمْتَ اللّٰہِ لَا تَحْصُوهَا﴾ ”اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو شمار نہ کر سکو گے“ (ابراہیم/ ۳۲) دوسری آیات میں فرمایا یہ سب تمہارے لئے مسخر ہیں۔

حمد و ثنا اس ذات کیلئے سزاوار ہے جس نے اپنے ان بندوں کیلئے جو اپنے جہل و نادانی کی وجہ سے اس کی اطاعت و بندگی سے بھٹکتے ہیں ان کیلئے ایک ایسے دروازے کا اعلان کیا جس سے وہ دوبارہ اسکی اطاعت و بندگی میں داخل ہو سکتے ہیں اس دروازہ کا نام ”توبہ“ ہے۔ وہ ذات تنہا توبہ قبول ہی نہیں کرتی بلکہ توبہ کرنے والوں کو دوست بھی رکھتی ہے:

﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الشّٰوِیِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ﴾ ”بیشک خدا توبہ کرنے والوں اور پاک و صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے“ (بقرہ/ ۲۲۲)

حمد اس ذات کیلئے ہے جس نے تمام عبادتوں کو ہدایت و رہبری سے جوڑا ہے، اس ہدایت و رہبری کو ہمہ وقت جاری رکھی، جس کی مثال حضرت نوحؑ ہیں آپؑ فرماتے ہیں میں نے اپنی قوم کی دن رات کھلے اور پوشیدہ طور پر ہدایت و رہنمائی کی:

﴿قُلْ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَ نَهَارًا﴾ ”نوحؑ نے کہا: پروردگار! میں نے اپنی قوم کو رات دن دعوت دیتا رہا“ (نوح/ ۵)

﴿ثُمَّ اِنِّیْ اَعْلَنْتْ لَہُمْ وَ اَسْرَرْتُ لَہُمْ اَسْرَارًا﴾

”پھر میں نے انھیں علانیہ طور پر اور نہایت خفیہ طور پر بھی دعوت دی“ (نوح/ ۹)

ہدایت و رہبری کرنے والوں کو قرآن کریم میں مختلف ناموں سے پکارا گیا ہے سب سے زیادہ جس نام یا صفت سے نوازا گیا ہے وہ صفت ”نبی“ ہے، ”نبی“ یعنی جسے خدا نے خبر دی ہو۔ خدا کی طرف سے سب سے پہلے خبر پانے والے حضرت آدم صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن کریم میں انھیں نبی کے نام سے یاد نہیں کیا گیا، حضرت آدم صلی اللہ علیہ وسلم ”شجر ممنوعہ“ کے قریب ہوئے، جسکی وجہ سے آپ کے اس عمل کو مقام انبیاء اور ان کی ذات کے منافی قرار دیا جاتا ہے لہذا ہم نے مناسب سمجھا اے اس کتاب کی بحث نبوت و رسالت اور قصہ آدم میں بیان کیا جائے:

آدم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن کریم میں کبھی نسیان عہد، عہد کو بھولانے کا ذکر آیا ہے:

﴿وَلَقَدْ عَهِدْنَا لَآدَمَ أَنْ لَا يَتَّبِعِ الْفِتْنَىٰ وَلَمْ يَنْصَرِفْ﴾

”اور تحقیق ہم نے اس سے پہلے آدم سے عہد لیا تھا لیکن وہ بھول گئے اور ہم نے ان

میں کوئی عزم نہیں پایا“ (طہ/۱۱۵)

کبھی اعتراف ظلم اور طلب مغفرت کا ذکر آیا ہے:

﴿وَرَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾

”اے اپنے آپ پر ظلم کیا اور اگر تو نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم نقصان

اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے“ (اعراف/۲۳)

قرآن کریم نے آدم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خطا و لغزش کی نسبت دی ہے ایسی نسبت کسی اور نبی کے بارے میں نہیں دی گئی دیگر انبیاء کے بارے میں خطا و لغزش کی تفسیر و توجیہ دیگر آیات اور دلائل عقل سے ممکن ہے لیکن حضرت آدم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایسا ممکن نہیں یہاں بقول عرفانہ ”پائے استدلال ہاں چوبین بود“ کا معاملہ ہے لہذا علماء کرام نے آیات قرآنی سے صرف نظر کرتے ہوئے اپنے سابقہ عقائد کو بنیاد بنا کر عیسائی آدم کو ترک اولیٰ قرار دیا ہے، ہم نے مناسب سمجھا اس کتاب میں بحث عصمت انبیاء کو بھی بیان کریں۔

فلسفہ و حکمت بعثت انبیاء و مرسلین کفر و شرک کے ساتھ جہاد کرنا ہے اس مقابلہ کا آغاز حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہوا، ابراہیم خلیل اس کے شہسوار ہیں اس کتاب میں حسب تسلسل حضرت نوح اور حضرت ابراہیم خلیل کا قصہ بیان ہوا ہے لہذا ہم نے مناسب سمجھا شرک و مشرکین کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی جائے، انبیاء کرامؑ گرچہ خدا کی طرف سے خبر کے ساتھ بشارت اور ڈرانے والے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ عام انسانوں کیلئے بندہ خدا بننے کیلئے نمونہ کامل بھی ہیں ہم جب تک ان کی زندگی کے نشیب و فراز کے واقعات کو سامنے نہیں رکھیں گے اس وقت تک سعادت سے ہمکنار اور بندہ خدا نہیں ہو سکتے ان کی اقتداء اور پیروی کیلئے قصص انبیاء کا مطالعہ ضروری ہے قصص انبیاء سے آگاہی کے لئے ہمارے پاس معتبر مآخذ و مصدر صرف قرآن کریم ہے قرآن کریم میں تسلسل انبیاء میں آدم صلی اللہ کا ذکر سب سے پہلے ہوا ہے مؤلفین و مصنفین قصص انبیاء نے حضرت آدمؑ کے بعد حضرت ادریسؑ کا ذکر کیا ہے چنانچہ ان کی نبوت کے بارے میں قرآن کریم میں دو آیات موجود ہیں گرچہ ان کی نبوت قرآن سے ثابت ہے لیکن تسلسل میں آدمؑ کے بعد ان کی نبوت کا ہونا مشکوک ہے کیونکہ خداوند عالم نے بعثت انبیاء کا آغاز حضرت نوحؑ سے کرنے کا ذکر کیا ہے لہذا سب سے پہلے ”اولی العزم“ نبی حضرت نوح علیہ السلام ہیں قصص انبیاء کا آغاز حضرت نوحؑ سے ہوتا ہے ہم نے کتاب اور وقت کی ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کتاب کی اختتام حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام قہرمان توحید و بت شکن پر کیا ہے۔

انسان قوت ارادہ، قدرت تخیل اور اعلیٰ درجہ کا ہونے کے حامل ہونے کے باوجود اپنی زندگی میں ایک مثالی نمونہ اور ”اسوۂ حسنہ“ کی سرپرستی میں کچھ دیر زندگی گزارنے کا نیاز مند اور محتاج ہے، اعلیٰ درجہ کا ہونے سے سند یافتہ قانون دان بھی کچھ دیر کسی تجربہ کار وکیل کی شاگردی میں رہنے کے محتاج مند ہیں علوم طب میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہونے والے بھی مرض و دوا کی تشخیص کیلئے ایک تجربہ کار طبیب کے ساتھ رہنے کے محتاج ہیں چہ جائے کہ انسان جو ماورائے حواس

مولاً و معبود کی عبادت و بندگی کرنے اور رضایت خوشنودی حاصل کرنے کیلئے کسی بندہ صالح کی پیروی کرنے کا محتاج نہ ہو، ظالم و طاغی سے مقابلے، جاہل و نادان انسانوں کے طرف سے درپیش مشکلات کا مقابلہ کرنے ان سب سے احسن طریقے سے نمٹنے کیلئے اعلیٰ کردار کے حامل انسان کی پیروی کرنے کی ضرورت ہے، کاروان بشری میں مثالی نمونے اور سیرت طیبہ کے حامل انسان انبیاء کرام ہیں لہذا اپنی زندگی کو رضائے خدا پر گامزن اور ان مثالی نمونوں کی پیروی کرنے کیلئے ہم قصص انبیاء کے محتاج ہیں جہاں خداوند عالم نے سورۃ محمدہ کی آیت ۴ اور ۶ میں فرمایا: ابراہیم اور آپ پر ایمان لانے والوں کی زندگی ”اسوۃ حسنہ“ ہے ان کی پیروی کرنے کا حکم بھی دیا ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ﴾ ”تم لوگوں کیلئے ابراہیم

اور ان کے ساتھیوں میں بہترین نمونہ ہے“ ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾

”تحقیق انہی لوگوں میں تمہارے لئے ایک اچھا نمونہ ہے“

خداوند متعال کی عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت دو آنکھیں ہیں چنانچہ حق سبحانہ تعالیٰ نے ان دو نعمتوں کا بار بار ذکر کیا ہے وہ ذات بہتر جانتی ہے کہ کس حکمت کے تحت اس نے انسان کو دو آنکھیں عنایت کی ہے حالانکہ ایک آنکھ سے بھی دیکھا جاسکتا تھا، ایک آنکھ خراب ہونے سے انسان کو دشواری و مشکل پیش آتی، پھر انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ آنکھ کتنی بڑی نعمت ہے۔ آنکھوں سے محروم انسان کیلئے یہ بارونق دنیا قبر کی مانند ہے خداوند متعال نے جسطرح انسان کو مادیات دیکھنے کیلئے ظاہری آنکھیں دی ہیں اسی طرح اس نے حقائق و معارف کو درک کرنے کیلئے بھی اسے دو آنکھوں سے نوازا ہے لیکن مادی آنکھوں کے برعکس اگر وہ ان دو آنکھوں میں سے صرف ایک آنکھ سے بھی محروم ہو جائے تو وہ بد بخت اور جہنمی بن جاتا ہے اس کیلئے خیر نہیں ہوتی۔ لیکن بد قسمتی سے عام طور پر اکثر و بیشتر انسان ان دو آنکھوں کے ہوتے ہوئے بھی صرف ایک آنکھ سے ہی دیکھتے ہیں دوسری آنکھ کو ہمیشہ بند رکھتے ہیں ایک آنکھ سے دیکھنے والے کو روایات میں ”دجال“ کہا گیا ہے

و جال وہ ہے جو صرف مفاد کی آنکھ سے دیکھتا ہے اور انسان کی مفاد کی آنکھ ہی کو صرف استعمال کرتا ہے جیسا جب مفاد پرست انسان کا مفاد بنتا تو وہ دیندار بن جاتا ہے اسی طرح کبھی دیندار انسان مفاد کی خاطر دین کو چھوڑ کر کلمہ اور بے دین ہو جاتا ہے اسکی مثال ایسی ہے جیسے کسی کے پاس دور اور نزدیک دیکھنے والا چشمہ ہوں اور وہ نزدیک دیکھنے کیلئے دور کا چشمہ استعمال کرے۔ دین و دیانت میں بھی صرف ایک آنکھ سے دیکھا نہیں جاسکتا۔

باب اعتقاد میں ایک بحث، بحث عصمت ہے جب اہل تشیع کہتے ہیں کہ ہمارے آئمہ معصوم ہیں تو اہل سنت بہت چڑتے ہیں اور کہتے ہیں یہ غلط بات ہے پیغمبرؐ کے بعد کوئی معصوم نہیں یعنی ہر شخص غلطی کر سکتا ہے لیکن جب انہی کے سامنے کوئی شخص خلفاء و اصحاب پر تنقید کی انگلی اٹھاتا ہے تو انہیں غصہ آتا ہے اور جواباً کہتے ہیں یہ کیسے ممکن ہے خلفاء و صحابہ غلطی کریں وہ خود نہ تنہا غلطی نہیں کرتے بلکہ ان کی پیروی کرنے والے بھی جنت جاتے ہیں اسی طرح ایک اور کلمہ جو ہمارے ہاں رائج ہے جب کوئی سنی خلافت و خلفاء کا نام لیتا ہے تو اہل تشیع بہت غصہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں خلفاء اور خلافت سنیوں کا کام ہے ہم خلافت کے قائل نہیں ہمارے ہاں امامت ہوتی ہے لیکن جب کوئی شخص یہی لفظ خلافت پیغمبرؐ کیلئے حدیث سے بیان کرتا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا علیؑ میرا خلیفہ ہے تو اس وقت یہ نعرے بلند کرتے ہیں اگر خلافت کا لفظ صرف علیؑ کے ساتھ اچھا اور سزاوار ہے لیکن اگر دوسرے کہیں تو کہتے ہیں خلافت ہمارے مذہب میں نہیں، اسی طرح جب کوئی عالم یہ حدیث نقل کرتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا علماء میرے خلفاء ہیں تو اس وقت بھی انہیں اچھا لگتا ہے کیونکہ جانشینی پیغمبرؐ کے تمام امتیازات مقام اور عزت انہیں ملیں گیں لیکن جب نبی کی ذمہ داریوں کی بات آتی ہے تو کہتے ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم نبی بن جائیں، ہم نبی تو نہیں کہ سارے دین کے کام ہم کریں ہمارے ہاں کچھ ایسی ہی صورت حال ہے اگر امام نبی یا مرجع کی نمائندگی کرنا فوائد اور امتیازات تک ہو تو اچھا ہے اور انہیں اس میں مزہ آتا ہے لیکن جب ذمہ

دار یوں کی بات آتی ہے تو کہا جاتا ہے اس وقت ایسے اقدام کرنا قطعاً مصلحت نہیں ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے کم از کم اس کام کو میری زندگی میں نہیں ہونا چاہئے۔

نقاد گرامی قدر

ہماری اس قسم کی کاوش کو نقد و تنقید کا نشانہ بنانے والے دو گروہ موجود ہیں۔ ان میں ایک گروہ جو صرف مجھ سے تنقید نہیں کرتے بلکہ وہ معاشرے میں ہر اس فرد کے مخالف ہیں جو انحراف کی نشاندہی کرنے اور اس پر قلم اود زبان کھولنے والا ہوں۔ اس سلسلے میں ہماری تسلی کے لئے قرآن کریم کی وہ آیات ہیں جن میں خداوند متعال نے اپنے پیغمبرؐ سے فرمایا ”اگر ان لوگوں نے آپ کو جھٹلایا ہے تو آپ سے پہلے والوں کو بھی جھٹلایا ہے“ اس ملک میں بڑے بڑے جید اور زاہد علماء گزرے ہیں اور اب بھی موجود ہیں جب وہ نادان دوستوں اور دشمن کی سہام مسموم کا نشانہ بننے سے محفوظ نہیں رہے تو ہمارے جیسے قد و قامت اور علم و اہلیت سے محروم بے یار و مددگار کی کیا حیثیت ہے کہ ان کے نقد و تنقید سے بچ سکیں لہذا میں ان کے نقد و تنقید کو یکسر مسترد نہیں کرتا کیونکہ ان کی تنقید میرے انتقادات کا جواب ہے۔

دوسرا گروہ ان افراد کا ہے جو اس معاشرے میں ان خرافات و انحرافات کے ازالے کے حق میں ہے اور ان کا کہنا ہے کہ ان خرافات کو ختم ہونا چاہئے اس سلسلے میں وہ ہماری کتابیں خرید کر پڑھتے بھی ہے لیکن وہ اس وقت ہماری کتابوں و تحریر کے بارے میں اسی طرح نقد کر رہے ہیں جو کسی ایسے شخصیت پر کی جاسکتی ہے جو علم و فکر کے بلند مقام پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ کثیر وسائل اور ذرائع کی بھی حامل ہو۔ اگر ہماری شخصیت ایسی ہوتی تو انکی تنقید ٹھیک تھی ہم ایسی ہی صورت میں ایسی تحریر پیش کر سکتے تھے جو عیب و نقص سے نمرأ ہونے کے ساتھ ساتھ قارئین کی استطاعت کے مطابق ہوتی، انکی اس تنقید سے یہ ظاہر ہوتا ہے گویا یہ بھی دوسرے گروہ کے ساتھ ہیں۔

ہم نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس لئے نہیں تھا کہ ہم اس میں اہلیت کے حامل ہیں بلکہ

ہمارا یہ اقدام اس لئے تھا کہ انحراف اور باطل کی کچھ آواز دُب جائے۔

آخر میں اپنے مالک و معبود برحق کے حضور میں سرسجدہ شکر ہوں کہ اس نے مجھے نعمت صحت، سلامتی اعضاء و جوارح اور حواسِ ظاہری و باطنی سے نوازنے کے ساتھ اپنے پسندیدہ دین اور رہبرانِ حقیقی سے دفاع کرنے کی توفیق عنایت کی، میں اسکی اس نعمتِ عظمیٰ کا شکر کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ اس نے مجھے اس سلسلہ میں ایسے مخلص و باصفادوست و احباب کی معاونت میں رکھا، جنکی معاونت میں وہی منطق شامل تھی، جسے ذاتِ باری تعالیٰ نے اپنے رسولوں کی زبان سے کہلوایا ہے کہ: ہم تجھ سے کسی قسم کے اجر کے خواہاں نہیں، کیونکہ یہ خدمات مادی اجرت سے بالا ہیں۔ ایسے موقع پر مجھے اپنے مالک و معبود کے سامنے تقصیر کو تباہی پر شرمندگی ہوتی ہے۔ لہذا میں خدائے بزرگ و برتر سے مغفرت کا خواہاں ہوں۔

ساتھ ہی خداوند متعال سے دعا ہے اس کتاب کی تالیف میں جتنے بھی تیرے نزدیک پسندیدہ حقائق درج ہیں اسکی اجر میں میرے ساتھ میرے معاونین کرام کو بھی برابر کا شریک قرار دے کیونکہ وہ ان حقائق کو صفحہ قرطاس پر لانے میں برابر کے شریک ہیں۔ اگر اس میں کوتاہی یا نغوذ باللہ کوئی غلط بیانی ہے تو ان برادران کو اس تقصیر سے معاف رکھنا۔ جن برادران نے اس کتاب کی تدوین میں معاونت کی وہ یہ احباب ہیں جناب برادر خادم حسین صاحب سلمہ، جناب برادر مبشر حسین صاحب سلمہ، جناب برادر فیاض حسین صاحب، جناب برادر محمد جاوید صاحب، جناب برادر سید ناصر علی شاہ نقوی صاحب، جناب برادر محمد باقر صاحب، خدا ان سب کو حفظ و امان میں رکھے اور اس عالم میں اجرِ جلیل و جمیل سے نوازیں اور انبیاء و اولیاء کی قرب و جوار نصیب کریں و آخر دعونا الحمد للہ رب العالمین۔

سید علی شرف الدین موسوی علی آبادی

ذی القعدة المحرم ۱۴۲۳ھ ہجری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله الذي جعلنا من المتمسكين بالقرآن العظيم و بنبيه و صفيه و نحيبه
و حبيبه و سيدنا و امام الانبياء و الائمة المعصومين و اصحابه
المتحججين عليهم صلوة الله و صلوة المصلين تبرأ من اعدائهم و اعداء الله
اجمعين من الآن الى قيام يوم الدين

تقديم:

قصص انبياء و مرسلين ان قصوں کہانیوں جیسا نہیں جو دنیا کے قصہ سازوں اور کہانی نویسوں
کے وہم و خیالات سے بنائی گئی فرضی شخصیات کے کارناموں پر مشتمل ہیں جو اپنے زمانے میں ایک
انوکھی شخصیات تھے جیسے رستم و اسفندیار وغیرہ۔ قرآن کریم نے قصص انبیاء کو نقل کرتے ہوئے جو
تصویر کشی کی ہے اس میں انبیاء وہ ذوات ہیں جن کی تاسی اور پیروی کرتے ہوئے ہر انسان اعلیٰ
مرتبہ انسانیت اور عبودیت و بندگی خدا پر فائز ہو سکتا ہے۔ چنانچہ انبیاء کرامؑ نے ایسے انسانوں کو
تربیت دے کر اپنے احکام سے نزدیک کر کے دکھایا۔ جیسا کہ پیغمبر اسلامؐ کی حیات طیبہ میں آیا ہے
کہ آپؐ نے علیؑ کی وہاں تک تربیت کی کہ ان کو نفس رسولؐ کہلانے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ انبیاء
نے ہمیشہ لوگوں کو یہی بتایا ہے کہ ہم مبشر ہیں۔ ہم آپ اور خدا کے درمیان میں رابطہ کے طور پر ہیں۔
ہم آپ کیلئے پیغام لے کر آتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس ذات نے ہمیں آپ تک رابطہ کیلئے
انتخاب کا اعزاز بخشا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشرف الانبیاءؑ ہوتے ہوئے خداوند متعال نے قرآن کریم
میں ابراہیمؑ خلیلؑ کو وہ مقام و منزلت بخشی کہ بندگی خدا میں ان کی تاسی اور پیروی کرنے کا حکم ہے۔
یہاں سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ دین اسلام میں تمام انبیاء ہدف واحد کے حامل ہیں۔ ان میں

زمان کوئی اختلاف پیدا نہیں کرتا۔

قصہ ابراہیم خلیلؑ میں ایک چیز جو قرآن نے نقل کی ہے وہ یہ ہے کہ دعوت الی اللہ میں کسی قسم کی تنظیم سازی، ادارہ سازی اور انجمن سازی کی گنجائش نہیں ہے۔ ہر انسان داعی حق ہے لہذا قرآن کریم میں ابراہیم کو یہ لقب بخشا ہے کہ وہ خود اپنی جگہ ایک امت تھے۔ ہمیشہ داعیان حق صرف خود کو خدا کے حضور میں جوابدہ سمجھ کر آگے بڑھتے ہیں تاکہ وہ اس دنیا میں انہیں توفیق سے نوازیں اور آخرت میں اس کے حضور سرخرو ہو جائیں۔ اس کے خلاف اب تک جو بھی اجتماعی دعوت یا اجتماعی شکل و صورت کی دعوت وجود میں آئی ہے، چاہے وہ انجمن و تنظیم کی صورت میں ہو یا اجتماع کی صورت میں۔ وہاں حاکم ایک خود پرست اور خود غرض انسان رہا ہے۔ جس نے ایک گروہ کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ ایسے انسانوں کا طغیان ایک انفرادی انسان کے طغیان سے بہت خطرناک ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک انفرادی انسان کے طغیان کا دائرہ اسکی اپنی سوچ فکر، مال و دولت اور اولاد ہے جو اپنی جگہ محدود ہیں۔ یعنی اسکا طغیان ایک محدود پیمانے پر ہوگا۔ جبکہ تنظیم ایک گروہ کی حمایت حاصل کر کے قوم پر مسلط ہوتی ہے یعنی وہ ایک قوم کے اوپر حکومت کرنا چاہتی ہے، تنظیمی افراد میں سے کسی کو آپ یہ کہتے ہوئے نہیں سنیں گے کہ وہ خود کو خدا کے حضور جوابدہ سمجھتا ہے بلکہ وہ خود کو ملت و قوم کے سامنے جواب دہ قرار دیتے ہیں، یہ افراد تنظیم کے آئین اور دستور کے سامنے خود کو جوابدہ سمجھتے ہیں۔ ان کے تنظیم کا دستور اور آئین انہی کا خود ساختہ ہے جس پر انہی میں سے ایک خود پرست انسانوں کا ٹولہ حاکم ہوتا ہے۔ جو انہیں خوش بھی کر سکتا ہے اور آمریت کا مظاہرہ بھی کر سکتا ہے۔ لیکن جو افراد خود کو خدا کے سامنے جوابدہ قرار دیتے ہیں، ان کے نفس سے کسی بھی وقت آمریت جنم نہیں لے سکتی۔

نبوت و رسالت

اصول عقائد میں حسب تسلسل آیات قرآنی "توحید کے بعد نبوت ہے، نبوت وہ مقام و منصب

الہی ہے جسے خداوند متعال خلق خدا کی ہدایت و رہبری کیلئے انسانوں میں سے کسی کو عطا کرتے ہیں انسان کی رہبری و ہدایت کیلئے خدا کی طرف سے منتخب ہونے والی ہستیوں کے منصب کے مختلف و متعدد زاویے سے گونا گوں اعتبار کے حامل ہیں جنہیں مختلف ناموں سے قرآن کریم میں یاد کیا گیا ہے مثلاً نبوت، رسالت، امامت، ولایت، خلافت وغیرہ، لیکن اس تسلسل اصطفیٰ اور انتخاب الہی میں درجہ نبوت کو ہی اولیت حاصل ہے شاید اسی وجہ سے اعتقادات میں نبوت کو مرکزیت کا درجہ حاصل ہے لہذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ”نبوت“ کے لغوی اور اصطلاحی معنوں کے علاوہ اس منصب سے متعلق تمام ضروری ابحاث پر بات کی جائے۔ اس مقام پر ہم یہ واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم کی آیات میں ان کلمات کا استعمال (نعوذ باللہ) شعراء اور ادیب حضرات کے کلمات کے استعمال جیسا نہیں بلکہ یہاں ہر کلمہ میں حقائق پوشیدہ ہیں۔ علمائے اعتقاد نے بحث نبوت میں دو قسم کے ابواب کھولے ہیں:

۱۔ نبوت عامہ

۲۔ نبوت خاصہ

لیکن عقائد پر لکھی گئی کتابوں میں ان دونوں ابواب سے متعلق تسلی بخش بحث کا فقدان ہے یہ دونوں ابواب متعدد زاویہ نگاہ سے تشریح و توضیح طلب ہیں لہذا دین و مذہب کے سخن گو حضرات باب نبوت میں سیکولر اکیڈمیوں سے فارغ التحصیل لوگوں کے سوالات کا صحیح جواب نہیں دے پاتے یا جواب دینا مشکل ہو جاتا ہے، ہم خود بھی اسی مشکل میں مبتلا ہیں تاہم ان صفحات کے توسط سے ذمہ دار افراد کی توجہ اس جانب مبذول کرنا چاہتے ہیں۔

باب نبوت عامہ میں علمائے اعتقاد صرف ایک قسم کی بحث سے متعلق چند سطور یا چند صفحات لکھ کر گزر جاتے ہیں وہ اس ضمن میں قاعدہ لطف، ضرورت ہدایت و رہبری، نجات از شقاوت، طلب سعادت اور تنہا عقل و علم کے ذریعہ انسان کی سعادت تک پہنچنے سے مجر و ناتوانی کی بات کر کے

آگے بڑھ جاتے ہیں وہ ضرورت انبیاء کو تو لازم و ضروری گردانتے ہیں لیکن اس سے متعلق دور قدیم اور دور جدید میں کئے جانے والے متعدد سوالات کے بارے میں گفتگو نہیں کرتے ہیں اس سلسلے میں مختلف گروہوں نے درج ذیل سوالات اٹھائے ہیں جو بحث و تشریح اور جواب طلب ہیں۔

۱۔ خداوند متعال نے انسان کو دیگر مخلوقات سے افضل و اشرف قرار دیا ہے، کیوں دوسری مخلوقات کی طرح اسکو اپنے حال پر نہیں چھوڑا؟ اگر وہ اس مخلوق کو بھی بطریق اولیٰ اپنے عقل و علم کے بھروسے پر چھوڑتے تو اسے کیا مشکل پیش آتی اور اس کو اس کی اپنی حالت پر نہ چھوڑنے کی صورت میں خود خدا کی خدائی میں کیا فرق پڑتا؟۔

۲۔ انسان کی عقل اور اس کا علم اور تجربات اسکی سعادت و ہدایت کیلئے ناکافی ہیں تو خود خدا نے تمام انسانوں کے ساتھ بطور مستقیم تکلم نہیں کرتا اور وحی رابطہ کے دروازے سب کیلئے کیوں نہیں کھولتا تاکہ ہر انسان بلا امتیاز خدا سے رابطہ کر کے اپنے مسائل حل کر دے، ایسا کرنے میں اسکے لئے کیا حرج تھا؟۔

۳۔ جن ہستیوں کو خداوند متعال نے ہدایت و رہبری کیلئے اسی نوع انسانی سے اور اسی قوم سے منتخب کیا ہے، اگر یہ ذوات اپنی صلاحیت و اہلیت کی بنیاد پر اس درجے پر فائز ہوئی ہیں تو اس صورت میں کیوں بہت سی نابھد روزگار ہستیاں صلاحیت و اہلیت مسلمہ کے باوجود اس مقام پر فائز نہیں ہوئیں؟ دوسری طرف اگر یہ بنیاد صحیح ہے تو ختم نبوت کی کیا دلیل ہے کیونکہ انسانی صلاحیت کی رشد و نمو اب بھی جاری ہے۔

۴۔ اگر ان ذوات کو ان کی اپنی صلاحیت و اہلیت کے بغیر خدا نے انتخاب کیا ہے تو ان کی چند ان فضیلت نہیں بنتی کیونکہ خدا اگر ان کو چھوڑ کر کسی اور کو منتخب کرتا تو وہ بھی ان جیسے ہوتے۔

اس جیسے اور سینکڑوں سوالات و استفسار دور قدیم سے عصر جدید کے انسان کے ذہنوں میں ابھرتے ہیں لیکن ان سوالات کی مثال تفننی سی ہے جسے ابھی تک سیرابی نصیب نہیں ہوئی ہے کیونکہ

حوزات علیہ دین و مذہب کے مبلغین نے فیصلہ کیا ہے کہ استخارے اور فاتحہ کے علاوہ دیگر مسائل میں قرآن کی طرف رجوع نہیں کریں گے کیونکہ ان کے خیال میں قرآن کے معانی ان کی سمجھ میں نہیں آتے یا یہ ابھی تک فقہ کے اجتہاد سے فارغ نہیں ہوئے ہیں تاکہ وہ اس سلسلہ کے سوالات کے جوابات کیلئے استثنائی کمیٹی تشکیل دے سکیں، ہماری اتنی وسعت نہیں کہ ہم جواب گوئیں ہمارا مقصد صرف یہاں ارباب بست و اختیار کی توجہ کو اس مسئلہ کی طرف مبذول کرنا ہے اسی طرح جہاں تک ہماری گنجائش ہے تو ہم انشاء اللہ چند صفحات سیاہ کریں گے۔

فلسفہ و ضرورت بعثت انبیاء

علمائے اعتقاد، فلاسفہ و متکلمین اور دانشمندان ادیان سماوی نے باب اعتقاد میں اثبات وجود باری تعالیٰ اس کی وحدانیت، ذات و صفات اور خالقیت میں یکا نگشت کے بعد دوسرا اصل ”نبوت“ کو قرار دیا ہے۔ خداوند تعالیٰ اپنے اور بندوں کے درمیان واسطہ اور رابطہ کیلئے انہی میں سے کسی کو انتخاب اور اصطفیٰ کرتا ہے خود انسانوں ہی میں سے کسی فرد کو انتخاب کرنے کی ضرورت کے حوالے سے بہت سے علماء اور مفکرین نے اپنے اپنے زاویہ فکر و نگاہ سے دلائل و براہین پیش کئے ہیں لیکن یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ ان تمام دلائل و براہین پر بحث کی جاسکے جبکہ ان میں سے بعض کا ذکر تو انکے سقم اور خدوش ہونے کی بنا پر نہیں کیا جاسکتا لہذا ہم صرف چند دلائل کو اختصار کے ساتھ پیش کرنے پر ہی قناعت کریں گے۔ کسی مدعا کو ثابت کرنے کیلئے کثرت دلائل، مصنف اور مولف کے معلومات میں وسعت کی دلیل تو بن سکتی ہیں، لیکن صرف دلیل میں موجود قوت، قدرت اور مسلمہ اصولوں کے استناد ہی اصل مدعا کا مضبوط ثبوت ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے مدعا کے اثبات میں موجود تمام دلائل کو نقل قرطاس کرنے سے ہمیشہ گریز کرتے رہے ہیں۔

وجود باری تعالیٰ اور اس کی ذات و صفات میں وحدانیت کو تسلیم کرنے کے بعد جب انسان اپنی ذات کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو خود کو اس کائنات اور اس میں موجود دیگر مخلوقات سے ممتاز پاتا ہے وہ

اپنے اندر تین ایسی باتیں پاتا ہے جو اسے اپنے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتی ہیں:

۱۔ ہدف خلقت کائنات بالخصوص خود انسان کا کیا ہدف ہے۔

۲۔ ”حریت اور آزادی“ انسان اپنے اندر دوسری مخلوق کی نسبت ایک قسم کی آزادی اور خود بخاری دیکھتا ہے۔

۳۔ انسان کی عقل و ادراک درپیش مسائل میں عاجز و ناتوان ہے۔

مندرجہ بالا تین نکات کی وجہ سے انسان خود کو کسی ایسی ہستی کا محتاج و نیاز مند پاتا ہے جو اپنے جیسے دیگر انسانوں سے ہر صفت میں ممتاز و مکرم ہو، جس کا ربط خود اس کے پیدا کر نیوالے خالق سے قائم ہو۔ کسی بھی انسان کو اگر بغیر بتلائے یا اس کی مرضی کے بغیر یا حالت غفلت میں کسی اور جگہ منتقل کیا جائے تو ہوش میں آتے ہی اس کے ذہن میں یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ اے یہاں کس نے لایا ہے۔

۲۔ کیوں لایا ہے۔

۳۔ کب تک یہاں رہنا ہے۔

۴۔ یہاں سے آگے کہاں جانا ہے۔

۵۔ آگے اس کا انجام کیا ہوگا۔

اس دنیا میں بسنے والے ہر انسان کے سامنے بھی یہ پانچ سوال جواب طلب ہیں کیونکہ وہ یہاں اپنی مرضی سے نہیں آیا اور نہ ہی اس سلسلے میں اسے پہلے سے بتایا گیا تھا اُسے عالم غفلت میں اس دنیا میں لایا گیا ہے، ہوش تو بعد میں آیا ہے ہوش میں آنے کے بعد انسان جب کائنات میں غور کرتا ہے تو اسے اس کائنات کی بہت سی چیزوں کے معین اہداف نظر آتے ہیں مثلاً اگر چار دیواری میں ہوتا ہے تو سمجھتا ہے کہ یہ اسکی رہائش کیلئے بنائی گئی ہے، سبزی وغیرہ کو دیکھتا ہے تو سمجھ لیتا ہے کہ یہ کھانے کیلئے بنائی گئی ہیں، شمس و قمر اور انکی روشنی سب کی کچھ نہ کچھ غرض اور غایت دیکھتا ہے۔ یہ سب کچھ

دیکھنے کے بعد وہ سوچتا ہے، میری خلقت جو ان سب چیزوں سے افضل و اشرف ہے آخر اس کا ہدف کیا ہو سکتا ہے؟ اس سلسلے میں جب وہ معاشرے میں موجود اپنے سے زیادہ سمجھدار اور دانشمند لوگوں کی زندگیوں کا مشاہدہ کرتا ہے یا ماضی میں گزرنے والی عظیم شخصیات، عقلاء، فلاسفہ اور دانشوروں کی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے ان کی زندگی کی سرگرمیاں اور سمت و جہت متضاد و متصادم اور متناقض نظر آتی ہیں یہ دیکھ کر اس کی حیرانی اور سرگردانی اور بڑھ جاتی ہے اور اسکے سوالات کی شدت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ اپنی غرض خلقت سے متعلق سوالات کو دہراتا ہے لیکن جب کہیں سے بھی اسے اپنی غرض تخلیق کے بارے میں جواب نہیں ملتا بلکہ یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ ”تمہاری خلقت کی کوئی غرض نہیں“ تو اسے کسی ایسی ہستی کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے جو اسے اس کے ہدف خلقت کی طرف رہنمائی اور رہبری کرے۔ ضرورت بعثت انبیاء کی یہ پہلی دلیل ہے۔

انسان کے اندر جب ہوش و حواس پیدا ہوتا ہے، فکری حس اس میں جب نمود و ظہور پاتی ہے، تو وہ خود کو دوسری مخلوقات سے جدا اور ممتاز پاتا ہے وہ کائنات کی ہر چیز کو مجبوری کی حالت میں گردش میں دیکھتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ کائنات کے دوسرے موجودات اپنے اعمال خود منتخب نہیں کر سکتے یا ایسا کرنے کیلئے آزادی نامی کوئی چیز نہیں رکھتے۔ سورج، چاند، ستارے سب حرکت میں ہیں اور انکی حرکت میں ذرہ برابر بھی کمی بیشی نہیں دیکھی کیونکہ یہ اپنی حرکت میں مجبور ہیں جس طرح کوئی انسان اگر جیل خانے کے دروازے پر بیٹھا ہو تو اسے یہی نظر آتا ہے کہ روز انداز اس دروازے سے کتنے ہی مجبور آدمیوں کو باندھے ہوئے اندر لے جایا جاتا ہے اور کتنوں ہی کو باہر لایا جاتا ہے لیکن جیل کے محافظ خود کو آزاد سمجھتے ہیں حیوانات اور حشرات کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے لیکن یہ حضرت انسان دیگر حیوانات سے مختلف ہے اپنے اعمال و کردار اور گفتار میں آزاد ہے ہر انسان کے حرکات اور سکونات دوسرے سے مختلف اور متضاد ہوتے ہیں پس معلوم ہوا کہ انسان دوسری مخلوقات سے ہٹ کر ایک مختار موجود ہے بلکہ کسی حد تک خود مختار ہے وہ اپنے اندر اس بات کو واضح اور روشن طور پر ملموس و

محسوس کرتا ہے وہ جس فعل کو انجام دینا چاہتا ہے اسے تمام تر مقدمات اور تیاریوں کے ساتھ اپنی مرضی سے انجام دیتا ہے اور جس کام کو نہیں کرنا چاہتا، سمجھانے کے باوجود کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا یہاں تک کہ بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جنہیں ظلم اور تشدد کے ذریعہ بھی اس سے ترک نہیں کروایا جاسکتا، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان ایک کام کو انجام دینے کا تمام تر ارادہ ظاہر کرنے کے باوجود منحرف ہو جاتا ہے اور کبھی منہی ارادہ ظاہر کرنے کے باوجود بعد میں اسی کام کو کر گزرتا ہے غرض مدعا ئے بیان یہ ہے کہ انسان ایک آزاد موجود ہے۔

اس کے اندر موجود آزادی کی یہ صفت اور ساتھ ہی دو اور صفات یعنی جلب منفعت (تمام فائدے والی چیزوں کو اپنی طرف کھینچنا) اور دفع ضرر (نقصان والی چیزوں کو اپنے سے دفع کرنا)۔ انسان کو غیر محدود آزادی استعمال کرنے کی طرف دعوت دیتی ہیں چونکہ دوسرے انسانوں میں بھی یہ صفت موجود ہے لہذا کہیں نہ کہیں دو انسانوں میں تصادم اور ٹکراؤ ہونا حتمی ہے چنانچہ ان حاملان آزادی کی حدود کا تعین ہونا چاہے کہ کس کو کہاں تک آزادی حاصل ہے، دنیا کے ٹھڈ اور کافر آزادی مطلق کے داعی بھی یہ کہتے ہیں کہ ایک کی آزادی کی حدود دوسرے کی آزادی پر ختم ہوتی ہے آزادی کا بے دریغ استعمال ایک کے حق میں اور دوسرے کے خلاف ہے جو ظلم ہے لہذا یہ حد بندی اور تعین آزادی دونوں کی باہمی رضامندی سے بھی طے پا سکتی ہے اور کوئی تیسرا فریق بھی اس کام کو انجام دے سکتا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ چونکہ دونوں فریق فائدے کو جلب اور نقصان کو دور کرنا چاہتے ہیں اس لئے مفادات میں ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو جاتی ہے لہذا کسی نہ کسی کی جانب داری کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے، جب کالامی نتیجہ یہ ہوگا کہ حدود کا تعین انصاف سے ہٹ کر ہوگا۔ اس صورت حال سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا نظام موجود ہو جو دونوں میں سے کسی سے بھی وابستہ نہ ہو تاکہ جانب داری کا تصور ذہن سے نکل جائے صرف اتنا بھی کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس قانون اور نظام کا اجراء اور نفاذ کرنے والا مجری بھی نفع اور نقصان کی طمع سے پاک ہو لیکن انسانوں

میں کسی ایسی غیر جانب دار ہستی کا پایا جانا تقریباً ناممکن ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا کے غیر جانبداری کے ساختہ نظاموں میں ہر جگہ جانبداری کی بو آتی ہے لہذا یہ کام کوئی ایسی ہستی ہی انجام دے سکتی ہے جو خلق و مافصحا سے بے نیاز ہو، صرف خدا کے نیاز پر باقی ہو، اسی کی منتخب کردہ ہو اور اپنا ہر عمل نفع اور نقصان سے ماوراء محض فرض شناسی کی بنیاد پر انجام دے، یہ صورت حال ضرورت بعثت انبیاء کی دوسری دلیل ہے۔

نبوت خاصہ

نبوت خاصہ میں بھی دو قسم کی بحث موضوع گفتگو علماء اعتقاد میں قرار پائی ہیں:
 ۱۔ خداوند متعال نے کتنے انبیاء انسانوں کی ہدایت کیلئے مبعوث کیے ہیں۔

اس سلسلہ میں علمائے اعتقاد باب اعتقاد میں خداوند متعال کی طرف سے منتخب انبیاء کی تعداد عقل اور قرآن کریم اور معتبر و مستند روایات خاموش ہیں گرچہ مشہور یہ ہے کہ ان کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار تھی لیکن اس کی کوئی مستند دلیل پیش نہیں کی گئی بلکہ اجمال گوئی پر اکتفاء کیا گیا ہے۔

”نبوت“ لغت اور آیات قرآن میں

کتب لغات عربی، بالخصوص قرآنی تعلیمات کیلئے وضع شدہ کتابوں مثلاً مفردات راغب، قاموس قرآن، عمدة الفاظ، التحقیق فی کلمات القرآن وغیرہ میں کلمہ ”نبوت“ کی اصل کے بارے میں دو نظریہ پائے جاتے ہیں:

۱۔ نبوت کو مادہ ”نبا“ سے لیا ہے جس کے معنی خبر دینے کے ہیں ان علماء کا کہنا ہے کہ نبا کا ہمزہ ”ی“ میں تبدیل کرنے سے ”نبی“ بن جاتا ہے چونکہ اس کی اصل نبا ہے اور نبا کے معنی خبر دینے کے ہیں اس لئے اس نظریہ کے حامی علمائے لغت اپنے مدعا کے ثبوت میں مندرجہ ذیل آیات قرآنی پیش کرتے ہیں:

﴿نبی عبادی انی انا الغفور الرحیم﴾ ”میرے بندوں کو خبر کر دو کہ میں بہت بخشنے والا ہوں“ (حجر/۳۹) ﴿قال نبانی العلیم الخبیر﴾ ”آپ نے کہا خدائے علیم وخبیر نے مجھے خبر دی“ (تحریم/۳) ﴿عن النبء العظیم﴾ ”بہت بڑی خبر کے بارے میں“ (باء/۲) ﴿ونبئهم عن ضیف ابراهیم﴾ ”ان کو ابراہیم کے مہمانوں کے بارے میں اطلاع دے دو“ (حجر/۵۱) ﴿قل هو نبوا عظیم﴾ ”کہہ دیجئے کہ یہ قرآن بہت بڑی خبر ہے“ (ص/۶۷) ﴿نمنا بتاویلہ﴾ ”ذرا اس خواب کی تعبیر تو بتاؤ“ (یوسف/۳۶)

ان تمام آیات میں لفظ نباء خبر دینے کے معنوں میں آیا ہے۔ جس ہستی کو خداوند متعال منتخب کرتا ہے اس کا پہلا کام ہی غیب سے خبر دینا ہے۔ اسی لئے اسکو ”نبی“ کہتے ہیں۔

۲۔ انکے بالمقابل صاحب السان العرب، تاج العروس اور بعض دیگر ماہرین لغت نے نبوت کو مادہ ”نبی“ ”نبی“ پر تشدید والے لفظ نبی سے مشتق قرار دیا ہے انکا کہنا ہے نبی درحقیقت (ن، ب، ی، ء) تھا ہمزہ ”ی“ میں تبدیل اور مدغم ہوا تو نبی بنا، جس کے معنی بلند مرتبہ یا بلند درجہ کے ہیں۔ چنانچہ اہل عرب زمین سے اونچے ٹیلے کو ”نمّہ“ کہتے ہیں جو شخص منتخب قرار پائے گا اور خدا کی طرف سے خبر دے گا یقیناً اس کا درجہ دیگر انسانوں سے بلند ہوگا۔

وہ ماہرین لغت جو نبی کو مادہ نمّہ سے مشتق گردانتے ہیں اور اس سے بلند درجہ مراد لیتے ہیں، اپنے اس مدعا کیلئے قرآن کریم کی وہ آیات پیش کرتے ہیں جن میں اس کلمہ کا استعمال بعض بلند مناصب کے بعد ذکر ہوا ہے۔ اس سلسلے میں وہ استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قاعدہ تکلم کے مطابق ”خاص“ کا ذکر ہمیشہ ”عام“ کے بعد ہوتا ہے۔ لہذا نبی کو اگر خبر دینے والا سمجھا جائے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ تو خدا سے رابطہ کا پہلا اور خاص مقام ہے جبکہ زیر نظر آیات میں خداوند متعال نے کچھ اور بلند مقامات کے ذکر کے بعد نبی کا ذکر فرمایا ہے مثلاً سورہ مبارکہ مریم میں صدیق کے بعد نبی کا ذکر فرمایا ہے اور اسی طرح سورہ مریم کی آیت ۳۰ میں حضرت عیسیٰ کو پہلے صاحب کتاب کہا ہے اس کے

بعد نبی ہونے کا ذکر کیا ہے:

﴿قال انسى عبدالله اننى الكتب وجعلنى نبيا﴾ ”بچے نے کہا: میں اللہ کا بندہ ہوں

اس نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے“ سورۃ آل عمران ۳۹ میں بھی آخر میں

نبی کا ذکر ہوا ہے جبکہ سورۃ مریم میں ”رسول“ کے بعد ”نبی“ کا ذکر کیا گیا ہے۔

بعض دیگر افراد کا کہنا ہے کہ مذکورہ بالا دونوں نظریوں میں کوئی اختلاف و تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ جو شخص خدا سے خبر حاصل کر کے بندوں تک پہنچاتا ہے وہ کوئی معمولی انسان نہیں ہوتا۔ ایسا شخص یقیناً بلند مرتبہ اور بلند درجہ پر فائز ہوگا۔ لہذا لفظ ”نبی“ کو مادہ ”باء“ سے مشتق گردانا بھی صحیح ہے اور مادہ ”نہوہ“ سے سمجھنا بھی ٹھیک ہے بعض نے کہا ہے ”نبی“ بروزن فعلیل ہے اور فعلیل صفت مشبہ سے ہے یہ فاعل کے معنوں میں بھی آتا ہے یعنی خدا کی طرف سے خبر دینے والا اور اسی طرح مفعول کے معنوں میں بھی یعنی خدا سے خبر لینے والا۔ یہ دونوں صفات اس کے اندر موجود ہیں یعنی نبی خدا سے خبر لیتا بھی ہے اور خدا کی طرف سے خبر دیتا بھی ہے لہذا نبی بروزن فعلیل مادہ بناء سے ہے جس کے دو معانی ہو سکتے ہیں:

- ۱۔ خبر لینے والا و وصول کرنے والا یا جس کی خبر دیا جاتا ہے اور اس صورت میں فعلیل بھی مفعول ہے
- ۲۔ خبر دینے والا اس وقت فعلیل بھی فاعل ہے ان آیات میں ”نبی“ دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے:

علماء اعتقاد کا کہنا ہے بعض نبی وہ ہیں جن کو خدا نے خبر دی ہیں جیسے حضرت آدم صلی اللہ علیہ وسلم خدا نے فرمایا: ﴿يا ادم اسكن انت وزوجك الجنة﴾

حضرت آدم کے بارے میں ہے لیکن یہ نہیں آیا ہے کہ حضرت آدم نے کسی کو خدا کی طرف سے خبر دی ہو اس پر ہم بعد میں بحث کریں گے، غرض یہ تھی ”نبوت“ کے لغوی معنی جو بیان ہوا۔

نبوت کے اصطلاحی معنی

علمائے اعتقاد نے نبی کی تعریف اس طرح کی ہے ”نبی اس انسان کو کہتے ہیں جو خدا سے بغیر واسطہ بشر کے خبر لیتا ہے“ فاضل مقداد نے کتاب ”حادی عشر“ کی شرح میں فرمایا: نبی وہ انسان ہے جو خدا کی طرف سے خبر دیتا ہے“ اس تعریف کے مطابق مندرجہ ذیل خبر دینے والے لوگ تعریف ”نبوت“ سے خارج ہیں:

۱۔ غیر خدا کی طرف سے خبر دینے والا نبی نہیں کہلائے گا۔

۲۔ عالم اور امام کو بھی نبی نہیں کہہ سکتے کیونکہ آئمہ اور علماء دونوں نبی کے توسط سے خبر دیتے ہیں یعنی امام اور علماء دونوں کا واسطہ بشر سے ہے۔

۳۔ ملائکہ خدا کی طرف سے خبر دیتے ہیں، لیکن نبی نہیں ہیں کیونکہ وہ انسان نہیں ہیں۔ صاحب تفسیر المیزان علامہ طباطبائیؒ نے تعریف نبوت بیان کرتے وقت اس قول کو ترجیح دی ہے کہ نبوت مادہ بناء بمعنی خبر سے مشتق ہے کیونکہ یہ شخص (نبی) خدا سے بذریعہ وحی خبر لیتا ہے اور بندوں تک اسکی خبر پہنچاتا ہے۔

علماء اعتقاد کے درمیان اس بات میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ نبی اور رسول کے درمیان کیا فرق ہے علاوہ ازیں خود لفظ رسول کے معنی کے بارے میں بھی مختلف نظریہ پائے جاتے ہیں تاہم منصب اور مقام کے حوالہ سے اختلافی نقطہ نظر پیش کرنے سے پہلے ہم ان دونوں کے لغوی معنوں کے درمیان موجود فرق کو واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

رسول

لغت میں، جیسا کہ قاموس قرآن مفردات راغب اور تحقیق فی کلمات القرآن میں آیا ہے ”رسول“ مادہ ”رسل“ سے ماخوذ ہے جو کسی کو آہستگی سے اٹھانے یا اسے اپنے حال پر چھوڑنے کے

معنوں میں استعمال ہوتا ہے یہ کلمہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ کسی کو آرام اور نرمی کے ساتھ کسی کی طرف بھیجنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے مادہ رسول ان سات معنوں میں استعمال ہوا ہے: مسلط کرنا، بعثت کرنا، بھیجنا، فتح کرنا، نکالنا، متوجہ کرنا، اپنے آپ کو چھوڑنا اور نازل کرنا۔ صاحب مفردات قرآن نے بھی رسول کے معنی بھیجنا یا بعثت کرنا بیان کئے ہیں

لفظ رسول کھولنے کے معنوں میں بھی ذکر ہوا ہے:

﴿مبايعة الله للناس من رحمة فلا ممسك لها۔ وما يسك۔ فلا مرسل له من بعده﴾ ”اللہ انسانوں کیلئے جو رحمت کا دروازہ کھول کے دے تو کوئی اسکو بند کرنے والا نہیں اور جو بند کر دے تو اس کے بعد کوئی اسکو کھولنے والا نہیں“ (فاطر/۲) رسول، کسی چیز کو اس کے اختیار کے بغیر چھوڑنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے:

۱۔ بارش کیلئے استعمال ہوا ہے:

﴿وارسلنا السماء عليهم مدراراً وجعلنا الانهر تجري من تحتهم﴾ ”اور ہم نے ان پر آسمان سے موسلا دھار بارشیں برسائیں اور ان کے نیچے نہریں جاری کر دیں“ (انعام/۶) ﴿يرسل السماء عليكم مدراراً﴾ ”وہ تم پر آسمان سے موسلا دھار بارش برسائے گا“ (نوح/۱۱)

۲۔ ہوا چھوڑنے کو بھی رسول کہتے ہیں:

﴿والله الذي ارسل الرياح فتنشیر سحابا ففسقنه الى بلد ميت فاحيينا به الارض بعد موتها﴾ ”اللہ ہی وہ ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا تو وہ بادلوں کو منتشر کرتی ہیں پھر ہم انہیں مردہ شہر کی طرف لے جاتے ہیں اور زمین کو مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کر دیتے ہیں“ (فاطر/۹)

۳۔ پرندہ: ﴿وارسل عليهم طيرا ابابیل﴾ ”اور ان پر اڑتی ہوئی ابابیل کو بھیجا“ (نمل/۳)

۴۔ کسی چیز کو اس کے حال پر چھوڑ دینے کیلئے استعمال ہوا ہے جیسے شیطان:

﴿وَرَسُولَنَا الشَّيْطَانُ عَلَى الْكُفْرَيْنِ تَوَزَّهُمْ أَزًّا﴾ ”ہم نے شیاطین کو کفار پر مسلط کر رکھا ہے جو انھیں اکساتے رہتے ہیں“ (مریم/۸۲)

اس حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں، کوئی بھی چیز مادی ہو یا روحانی، اچھی ہو یا بری انسان ہو یا شیطان، ملک ہو یا جماد کو چھوڑنے کو رسول کہتے ہیں۔

۵۔ عام انسان کی طرف سے کسی اچھے یا برے مقصد کیلئے بھیجے کو بھی رسول کہتے ہیں:

﴿فَارْسَلْنَا فِرْعَوْنَ فِي الْمَدَائِنِ حَاشِرِينَ﴾ ”پھر فرعون نے مختلف شہروں میں لشکر جمع کرنے والے روانہ کر دئے“ (شعرا/۵۳)

۶۔ یہ نگہ مرضی اور اختیار پر چھوڑنے والوں کیلئے بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسے ملائکہ:

﴿فَارْسَلْنَا الْبَهَارُ وَخَنَافَتُمُثِلَ لَهَا بِشَرِّ اسْوَيَا﴾ ”ہم نے اپنی روح کو بھیجا جو ان کے سامنے ایک اچھا خاصا آدمی بن کر پیش ہوا“ (مریم/۱۷) ﴿اللَّهُ بِصُفْطَىٰ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ﴾ ”اللہ ملائکہ اور انسانوں میں سے اپنے نمائندے منتخب کرتا ہے“

(ج/۷۵) ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ﴾ ”بے شک یہ ایک معزز فرشتے کا بیان ہے“

(نکوہ/۱۹) ﴿وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا﴾ ”اور جب ہمارے فرستادے لوط کے پاس

پہنچے“ (ہود/۷۷) ﴿اِنَّ رُسُلَنَا بِكُتُبٍ مَّا تَعْمُرُوْنَ﴾ ”تم جو مکاری کرتے ہو

ہمارے فرشتے انکو لکھ جاتے ہیں“ (یونس/۲۱) ﴿قَالُوْا نَبْلُوْطُ اِنَّا رَسُلُ رَبِّكَ﴾ ”تو

فرشتوں نے کہا کہ اے لوط ہم آپ کے پروردگار کے نمائندے ہیں“ (ہود/۸۱)

﴿وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا اِبْرٰهِيْمَ بِالْبَشْرٰی﴾ ”اور جب ہمارے فرشتے ابراہیم کے

پاس بشارت لے کر آئے“ (عنکبوت/۳۱) ﴿وَوِیْرَسَلْ عَلَیْکُمْ حَفْظَہٗ﴾ ”اور تم سب پر

نگہبان فرشتے بھیجتا ہے“ (انعام/۶۱) ﴿وَمَا اَرْسَلُوْا عَلَیْہِمْ حٰفَظٰتِیْنَ﴾ ”حالانکہ انہیں

ان کا گمان بنا کر نہیں بھیجا گیا تھا“ (مطفئین/۳۳) ﴿ہرسل علیکما شواظ من نار﴾
 ”تمہارے اوپر آگ کا سبز شعلہ اور دھول چھوڑ دیا جائے گا“ (رطن/۳۵)
 ﴿والمرسلت عرفا﴾ ”ان کی قسم جنہیں تسلسل کے ساتھ بھیجا گیا ہے“ (مرسلات
 ۱/۱) ﴿بلی ورسلسنا لدیہم یکبون﴾ ”ہاں ہاں ہمارے فرشتے سب کچھ لکھ رہے
 ہیں“ (زخرف/۸۰)

یہاں سے ان افراد کو جو کسی کی طرف حامل پیغام ہوتے ہیں انہیں ”رسول“ کہتے ہیں علماء نے
 رسول کے یہ معنی بیان کرنے کیلئے درج ذیل کے آیات سے استفادہ کیا ہے، چنانچہ اس مناسبت
 سے رحمان ورحیم اللہ تبارک تعالیٰ کی طرف سے بھیجے گئے انبیاء کرام کو رسول کہتے ہیں:

﴿انارسلنا الیکم رسولاً شاہدا علیکم کما ارسلنا الیٰ فرعون رسولاً﴾ ”(اے
 لوگو) ہم نے تمہاری طرف ایک رسول تم پر گواہ بنا کر بھیجا ہے جس طرح ہم نے فرعون
 کی طرف ایک رسول بھیجا تھا“ (زل/۱۵) ﴿فاتیا فرعون فقولانا رسول رب العلمین
 ﴾ ”آپ دونوں فرعون کے پاس جائیں اور اس سے کہیں: ہم رب العالمین کے
 رسول ہیں“ (شعرا/۱۶) ﴿ما کہ ۳۲، مؤنون ۵۱، ہود ۸﴾ ﴿هو الذی ارسل رسولہ بالہدی و
 دین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ﴾ ”وہ خدا جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور
 دین حق کیساتھ بھیجا تاکہ اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب بنائے“ (توبہ/۳۲)
 ﴿هو الذی ارسل رسولہ بالہدی و دین الحق﴾ ”وہی خدا ہے جس نے اپنے
 رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا“ (فتح/۲۸) ﴿هو الذی ارسل رسولہ
 بالہدی﴾ ”وہی خدا ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت کے ساتھ بھیجا“ (صف/۹)
 ﴿رسالو لا ارسلنا الینا رسولاً﴾ ”پروردگار تو نے ہماری طرف رسول کیوں نہیں
 بھیجا“ (احزاب/۱۳) ﴿کما ارسلنا فیکم رسولاً منکم﴾ ”جس طرح ہم نے تمہارے

درمیان تمہیں میں سے ایک رسول بھیجا ہے“ (بقرہ/۱۵۱)

﴿وَمَا نُرْسِل بِالْآيَاتِ إِلَّا تَحْوِيلًا﴾ ”ہم تو نشانیوں کو صرف ڈرانے کیلئے بھیجتے ہیں“
(نبی اسرائیل/۵۹)

مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ ”رسول“ لفظ ”نبی“ کی نسبت عام ہے کیونکہ یہ مختلف مقامات پر کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

انبیاء و مرسلین مندرجہ ذیل پیغام لائے ہیں:

- ۱۔ آیات الہی کی تلاوت
- ۲۔ لوگوں کے عقائد اور افکار اخلاق صفات نفسانیہ اور اعمال و عادات کا تزکیہ کرنا۔
- ۳۔ تعلیم کتاب
- ۴۔ حقائق و معارف
- ۵۔ دین اور دنیا سے متعلق گزشتہ حاضر اور آئندہ سے متعلق ضروری مسائل۔

نبی اور رسول میں فرق

علمائے اعتقاد نے بعض روایات کو بنیاد بنا کر نبی اور رسول میں فرق کا ذکر کرتے ہوئے بیان فرمایا ہے کہ نبی جس پر خدا کی طرف سے وحی نازل ہوئی ہو، لیکن ضروری نہیں کہ اس وحی کو دوسروں تک پہنچانے کا بھی حکم دیا گیا ہو یعنی وحی ہو سکتی لیکن تکلیف تبلیغ کا حکم نہیں۔

اسکے برعکس اگر وحی ہو اور ساتھ ہی ابلاغ وحی کا بھی حکم ہو تو ایسی وحی کے حامل کو رسول کہتے ہیں۔ یہ فرق مندرجہ ذیل حقائق کے پیش نظر مقدس و مردود معلوم ہوتا ہے:

- ۱۔ انسانی معاشرہ کے لئے کسی نظام اور قانون کا ہونا لازمی ہے اور اس نظام کو کامیابی سے چلانے کے لئے کسی ہادی یا رہبر کا وجود بھی ناگزیر ہے لہذا خدا پر لازم آتا ہے کہ اپنے بندوں میں سے کسی کو ہدایت اور رہبری کے لئے منتخب کرے اور چونکہ عملاً محال ہے کہ خدا ہر کس و نا کس

پر اپنے احکامات بلا واسطہ وحی کرے لہذا اس خلا کو پر کرنے کیلئے انہی انسانوں میں سے منصب نبوت کے لئے کسی کا منتخب ہونا ایک استثنائی ضرورت ہے لیکن کسی شخص پر وحی تو ہو، مگر دوسروں کو ہدایت کرنیکا حکم نہ ہو، یہ بات بعید از قیاس ہے کیونکہ مقام نبوت کیلئے کسی فرد کو منتخب کرنے میں پھر کیا حکمت قرار پائے گی؟

۲۔ جب خداوند عالم نے اپنے کچھ بندوں کو بلا واسطہ احکام شریعت وحی کرتا ہے تو کیونکر دیگر بندوں کو اس احکام کے پہنچانے سے محروم رکھ سکتا ہے۔

۳۔ وہ ہستی کہ جسے خداوند عالم نے اپنی خبروں کے ابلاغ کیلئے منتخب کیا ہو، یہ خبر اگر وہ دیگر بندگان خدا تک نہ پہنچائے تو ایسی صورت میں اس کے ساتھ ہمارا کوئی واسطہ اور رشتہ ہی نہیں رہے گا اور جب کوئی تعلق ہی نہیں ہوگا تو پھر اس کا احترام بھی ہمارے لئے ضروری نہ رہے گا۔

۴۔ علمائے اعتقاد نبی اور رسول میں فرق بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ”نبی عام ہے جبکہ رسول خاص یعنی ہر رسول نبی ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں“ قانون تکلم و مخاطب کے لحاظ سے عام کا ذکر پہلے ہونا چاہئے اور خاص کو بعد میں جبکہ قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات میں نبی کا ذکر بعد میں ہوا اور رسول کا پہلے:

﴿انہ کان محصا وکان رسولاً نبیاً﴾ ”وہ میرے مخلص بندے اور رسول و نبی تھے“ (مریم/۵۱) ﴿وکان رسولاً نبیاً﴾ ”اور ہمارے بھیجے ہوئے رسول و نبی تھے“ (مریم/۵۳) ﴿وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی﴾ ”اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا رسول یا نبی نہیں بھیجا ہے“ (نہ/۵۲)

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ منصب نبوت خاص ہے اور منصب رسالت عام۔

۵۔ سورہ بقرہ آیت ۲۱۳ میں خداوند عالم نے بعثت نبی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ نبیوں کو انسانوں کے لئے بشیر و نذیر بنایا گیا ہے:

﴿فَبِعِثِّ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مِبْشَرِينَ وَمُنْذِرِينَ﴾ ”اللہ نے بشارت دینے والے اور تنبیہ کرنے والے انبیاء بھیجے“

۶۔ انبیاء کی تعداد کا ذکر کرتے ہوئے علمائے اعتقاد بعض روایات کی بنیاد پر کہتے ہیں کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء مبعوث ہوئے ہیں جبکہ رسولوں کی تعداد تین سو تیرہ (۳۱۳) بتائی جاتی ہے اگر یہ مان لیا جائے کہ تمام نبیوں نے تکلیف ابلاغ نہیں کی پھر فقط ۳۱۳ رسولوں کی تعداد بشر کی ہدایت کیلئے ناکافی ہے۔

۷۔ اگر عمل تبلیغ کو بجالانا صرف رسولوں ہی کی ذمہ داری ہے اور انھوں نے ہی ہمیں خبر الہی سے آگاہ کیا ہے تو باب اعتقاد میں ایمان بہ رسالت کا ذکر ہونا چاہئے تھا جبکہ یہاں ایمان بہ نبوت کا حکم ہے۔

۸۔ بہت سی آیات و روایات سے استدلال کرتے ہوئے متعدد علماء اور عرفاء نے بیان فرمایا ہے کہ انھیں الہام یا القائے قلب ہوا، القاء قلب وحی الہی کی اقسام میں سے ایک قسم ہے اس اصول کے تحت تو ان علماء اور عرفاء کو بھی بنی کہا جاتا ہے جبکہ انھیں نبی نہیں کہا جاتا۔

۹۔ کثیر آیات و روایات کے تحت اگر خلق خدا جادہ مستقیم سے منحرف ہو جائے، انحراف اور بدعنوانیوں کو فروغ ملے، سنتیں مٹ جائیں تو ایسی صورت میں ہر عالم دین پر تبلیغ دین واجب ہو جاتی ہے جس سے پہلو تچی اور فرار کرنیکی صورت میں وہ مستحق عذاب الہی ٹھہرے گا تبلیغ کے اس فریضے کے باوجود علماء رسول نہیں کہلا سکتے۔

۱۰۔ اصول کافی میں رسول اور نبی کے فرق کے سلسلے میں نقل ہے:

”نبی وہ ہے جو خواب میں وحی لیتا ہے، آواز سنتا ہے مگر ملائکہ کو دیکھتا نہیں۔ جبکہ رسول وہ ہے جو خواب میں وحی لیتا ہے، آواز بھی سنتا ہے اور ملائکہ کو دیکھتا بھی ہے“

اس روایت کے تحت رسول اور نبی میں فرق تبلیغ احکام کرنے اور نہ کرنے میں نہیں ہے بلکہ یہ فرق

ملائکہ کو دیکھنے اور نہ دیکھنے میں ہے۔

۱۱۔ رسول جیسا کہ آیات قرآنی میں بھی آیا ہے، حاملِ پیغام کے بھیجنے کو کہتے ہیں اسکی وضاحت مفرداتِ راغب اصفہانی میں اس طرح کی گئی ہے ”رسول مادہ رسل سے ہے رسالت پیغام کو کہتے ہیں لہذا اصل پیغام ”رسالت“ کہلاتی ہے بھیجنے والے کو ”مرسل“ کہتے ہیں جسکی طرف بھیجا جائے اسے ”مرسل الیہ“ کہتے ہیں اور جسے بھیجا جائے اسے ”رسول“ کہتے ہیں اسی لئے انسان اور ملائکہ دونوں ہی رسول کہلاتے ہیں“ پس معلوم ہوا کہ حاملِ پیغام ہونے کی وجہ سے پیغمبر کو رسول کہا جاتا ہے، لفظ رسول کا استعمال تنہا انسان و ملائکہ تک محدود نہیں بلکہ قرآن کریم میں پرندہ، ہوا، عذاب وغیرہ کے لئے بھی یہ مادہ استعمال ہوا ہے۔ ملاحظہ کریں:

﴿وہو الذی ارسل الريح بشرا بین یدی رحمتہ﴾ ”اور وہ تو ہے جس نے اپنی رحمت (بارش) کے آگے ہواؤں کو خوشخبری دینے کیلئے بھیجا ہے“ (فرقان/۳۸) ﴿وارسل علیہم طیرا ابایل﴾ ”اور ان پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیجے“ (نیل/۳) ﴿فارسلنا علیہم رجزا من السماء بما کانوا یظلمون﴾ ”ہم نے ان پر آسمان سے عذاب بھیجا اسلئے کہ وہ ظلم کرتے تھے“ (اعراف/۱۶۲)

۱۲۔ اگر رسول اسے کہتے ہیں جسے تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے تو سورۃ بقرہ تیسرے پارے کی پہلی آیت میں خداوند عالم نے جو صریحاً یہ فرمایا ہے کہ بعض رسول دوسرے رسولوں پر فضیلت رکھتے ہیں: ﴿تلك الرسول فضلنا بعضهم علی بعض﴾ تو پھر یہ فضیلت کس بنیاد پر ہوگی۔

۱۳۔ آخری بات یہ ہے کہ طول تاریخ میں ہمیں ایک بھی ایسے نبی کا ذکر نہیں ملتا جس پر وحی ہوئی ہو مگر حکم تبلیغ نہ ہوا ہو۔

نبوتِ اکرام و استحقاق کے درمیان فرق

بعض مفکرین کا خیال ہے کہ نبوتِ صلاحیت اور قابلیت رکھنے والوں کا استحقاقی مقام ہے اس

کے بالمقابل بعض کا خیال ہے کہ نبوت کے حامل افراد کو عام انسانوں پر کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے کیونکہ خدا جسے چاہتا ہے اسے نبی بنا دیتا ہے اگر ہمیں نبی بنانا تو ہم بھی نبی بن جاتے۔

یہ دونوں نظریہ جداگانہ طور پر راہِ مستقیم سے منحرف انحراف ہر صلاحیت اور قابلیت رکھنے والے انسان کو اس منصب کا مستحق نہیں بن سکتا اگر ایسا ہے تو ان انبیاءِ بزرگ کے قصہ نبوت کی کیا تفسیر کریں گے جہاں حضرت موسیٰ "اولیٰ العزم" پیغمبر کو پیدا ہوتے ہی خداوند متعال نے ماں کی گود سے اٹھا کر اس کے دشمن فرعون دعوائے الوہیت رکھنے والے لٹھ اور کافر کے گھر میں پرورش کی، اور وہاں سے بے یار و مددگار شہر مدین میں حضرت شعیب کی دامادی میں دیا۔

اسی طرح اس اولیٰ العزم نبی کو یاد کریں جہاں وہ نبی اور اس کی بیوی اولاد پیدا ہونے سے مایوس ہو چکے تھے انھیں اس عمر میں ایک نبی سے نوازا جس عمر میں عادی طور پر کسی کے ہاں بچہ ہونا ممکن نہیں، یہ نبی حضرت ابراہیم خلیل اللہ ہیں:

﴿الحمد لله الذي وهب لي على الكبر اسماعيل واسحق﴾

”ثناءِ کامل ہے اس اللہ کیلئے جس نے عالم پیری میں مجھے اسماعیل اور اسحاق عنایت

کئے“ (ابراہیم/۲۹)

اسی طرح جب حضرت زکریا اور ان کی بیوی کی عمر صاحب اولاد ہونے سے گزر چکی تھی تو خداوند عالم نے انھیں ایک بیٹے سے نوازا جس کا نام حضرت یحییٰ تھا اور وہ نبی بھی تھے اور اس سے بھی تعجب خیز واقعہ اس نبی کا ہے جس کی نانی کو اولاد سے معذور و مایوس ہونے کی عمر میں ایک بیٹی سے نوازا اور اس بیٹی سے خداوند متعال نے بغیر شوہر ایک بیٹا بخشا جس کو گہوارے ہی سے نبوت کے مقام پر پہنچایا جس کا نام حضرت عیسیٰ ہے۔ کیا یہ انبیاءِ صلاحیت اور استحقاق کے مراحل سے گزرے ہیں یا کہ صرف اکرامِ الہی کا ثمر ہیں، اس کے مقابل میں یہ کہنا کہ جن کو خدا اکرام سے نوازتا ہے وہی برگزیدہ ہوتے ہیں اس میں ان کا اپنا کوئی کردار نظر نہیں آتا، یہ بھی ایک غلط منطق ہے کیونکہ سورہ

بقرہ اور سورہ سجدہ کی آیت ۲۴ میں واضح طور پر ملتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو خداوند متعال نے ناقابلِ تحمل امتحان اور آزمائش سے گزارنے کے بعد اولیٰ العزم نبی بنایا:

﴿وَجَعَلْنَاهُمْ أُمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لِمَنْصُورٍ﴾ ”اور ہم نے ان میں کچھ لوگوں کو امام اور پیشوا قرار دیا ہے جو ہمارے امر سے لوگوں کی ہدایت کرتے ہیں“

یہاں سے یہ نتیجہ آسانی سے اخذ کیا جاسکتا ہے کہ بعثت نبوت اور نبی الوہیت اور ربوبیت الہی کا تقاضا ہے جو کبھی بچپن میں، کبھی بڑھاپے میں، کبھی جوانی میں، کبھی بغیر زحمت اور کبھی مشقتوں اور زحمتوں کے بعد عطا ہوتا ہے۔

نبی کی تعریف میں علماء اعتقاد نے فرمایا ہے نبی وہ انسان ہے جو خداوند متعال سے بغیر واسطہ بشر کے وحی لیتے ہیں یہاں اس قید کے بارے میں گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔

انبیاء انسان و بشر ہیں

انسان: انسان کو اس کی استعدادِ صلاحیت فضائل اور کمالات کا حامل ہونے کی وجہ سے ’انسان‘ کہتے ہیں:

پہلی صفت ”انسان“ اس بشریت کے پتکے کے اندر ایک حقیقت پوشیدہ ہے جو ان بشری خصوصیات اور تقاضوں سے بلند و ارفع ہے لیکن عام طور پر بشری تقاضے اس پر غالب ہے لہذا اسے انسانی تقاضے کی طرف جانے نہیں دیتے اسے اپنی طرف کھینچتے ہیں اس صورت میں اس انسان کی حالت ایسی ہے جو ان آیات میں بیان ہوئے ہیں:

۱۔ انسان جدل ہے:

﴿وَكَاذِبًا كَثِيرًا﴾

”مگر انسان بڑا ہی جھگڑا لٹاوت ہوا ہے“ (کہف/۵۴)

۲۔ انسان کفور ہے:

﴿ان الانسان لکفور مبین﴾ ”یہ انسان یقیناً کھانا شکر ہے“ (زخرف/۱۵)

۳۔ انسان خلوع ہے:

﴿ان الانسان خلق خلوعاً﴾ ”انسان یقیناً کم حوصلہ خلق ہوا ہے“ (مہارج/۱۹)

۴۔ انسان ضعیف ہے:

﴿وخلق الانسان ضعیفاً﴾ ”کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے“ (نہاء/۲۸)

۵۔ انسان عجول ہے:

﴿وکان الانسان عجللاً﴾ ”اور انسان بڑا جلد باز ہے“ (اسراء/۱۱)

۶۔ انسان مخلوق مٹی ہے:

﴿ان خلقکم من تراب ثم اذا انتم بشر تنتشرون﴾ ”اُس نے تمہیں مٹی سے

بنایا پھر تم انسان ہو کر (زمین میں) پھیل رہے ہو“ (روم/۲۰) ﴿والله خلقکم من

تراب﴾ ”اللہ نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا“ (فاطر/۱۱)

۷۔ انسان ظلوم و کفار ہے:

﴿ان الانسان لظلوم کفار﴾

”انسان یقیناً بڑا ہی بے انصاف ناشکر ہے“ (ابراہیم/۳۴)

۸۔ انسان اتور ہے:

﴿وکان الانسان قنوراً﴾ ”اور انسان بہت تنگ دل واقع ہوا ہے“ (اسراء/۱۰۰)

۹۔ انسان قنوط ہے:

﴿وان مسه الشر فیسوس قنوط﴾ ”جب کوئی آفت آ جاتی ہے تو مایوس ہوتا ہے

اور اُس توڑ بیٹھتا ہے“ (نعلت/۴۹)

۱۰۔ انسان ممنوع ہے:

﴿وَإِذَا مَسَّ الْخَبِيرَ مَنُوعًا﴾

”اور جب آسائش حاصل ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے“ (معارف/۲۱)

۱۱۔ انسان طافی ہے:

﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَافٍ يُكَفِّرُ﴾ ”انسان تو یقیناً سرکشی کرتا ہے“ (علق/۶)

۱۲۔ انسان کنود ہے:

﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ﴾ ”یقیناً انسان اپنے رب کا ناشکرا ہے“ (عادیات/۶)

۱۳۔ انسان حب مال رکھتا ہے:

﴿وَإِنَّهُ لَحَبَّ الْخَبِيرِ لَشَدِيدٌ﴾ ”اور وہ مال کی محبت میں سخت ہے“ (عادیات/۸)

۱۴۔ انسان کفرانِ نعمت ہے:

﴿وَلَقَدْ كَفَرْنَا مِنْ عَذَابِ شَدِيدٍ﴾

”اور اگر ناشکری کرو تو میرا عذاب یقیناً سخت ہے“ (ابراہیم/۷)، یونس/۱۲

”بشر“:

اسی طرح اسے جسم و جسمانیات ظاہر محسوسات میں آنے والی شکل و صورت کے حوالے سے بشر کہتے ہیں حقیقت میں بشر اس کے ظاہری چمڑے کا نام ہے خداوند عالم نے انسان کی خلقیت کا جب ذکر کیا تو ہمیشہ بشر کے حوالے سے بتایا ہے:

﴿وَإِنَّكُمْ مِنْكُمْ لَمِنْ مَعْلُومٍ﴾ ”اور اسی نے تمہیں ہر اس چیز میں سے دیا جو تم نے اس سے مانگی

اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو شمار نہ کر سکو گے انسان یقیناً یہی بے انصاف

”ناشکرا ہے“ (ابراہیم/۳۳)

﴿وہو الذی خلق من الماء بشراً﴾ ”اور وہی ہے جس نے پانی سے ایک بشر کو پیدا کیا“ (فرقان/۵۴) ﴿انسی عالق بشرًا من طین﴾ ”میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں“ (س/۱۷)

خلقت کے حوالے سے: انسان ۶۵ بار قرآن میں آیا ہے اس میں انسان کا ظاہری بدن چمڑے شکل و صورت مراد نہیں بلکہ اس کی باطنی استعداد صلاحیت جو اسکے اندر پوشیدہ ہے مراد ہے: خداوند عالم نے چند آیات کریمہ میں مختلف زاویے سے اس نقطے پر اصرار کیا ہے:

۱۔ اگر ہم انسانوں کی ہدایت کیلئے ملائکہ بھیجتے تو ہم انہیں بھی بشریت کا لباس پہنا کر بھیجتے:

﴿ولو جعلنہ ملئکۃ لجعلنہ رجلاً للینسنا علیہم ما یشہون﴾

”اور اگر ہم اسے فرشتہ قرار دیتے بھی تو مردانہ شکل میں قرار دیتے اور ہم انہیں اسی شبہ میں مبتلا کرتے جس میں وہ اب مبتلا ہیں“ (انعام/۹)

۲۔ ہم نے ہر نبی کو اسی قوم سے انتخاب کیا ہے:

۳۔ ہم نے ان قوموں کی طرف انہی کے بھائی کو بھیجا ہے:

﴿والسّٰی عادیٰ احامہم ہوداً﴾ ”اور قوم عاد کی طرف ہم نے انہی کی برادری کے ایک فرد ہود کو بھیجا“ (اعراف/۶۵) ﴿والسّٰی مدینٰ احامہم شعیباً﴾ ”اور اہل مدین کی طرف ہم نے انہی کی برادری کے ایک شعیب کو بھیجا“ (اعراف/۸۵) ہود: ۶۱، ۶۲، ۸۳، نمل: ۴۵، صافات: ۲۶، شوریٰ: ۱۰۶، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۶۱۔

۴۔ تمام قوموں نے انبیاء کو یہ کہہ کر مسترد کیا کہ تم جیسے بشر ہو:

﴿قالوا انتم الابرار مثلنا تردون ان تصدقنا عما کان یعبداہا تو نا﴾

”وہ کہنے لگے: تم تو ہم جیسے بشر ہو تم ہمیں ان معبودوں سے روکنا چاہتے ہو جن کی ہمارے باپ دادا پوجا کرتے تھے“ (ابراہیم/۱۱۰) ﴿الذین ظلموا ہل

هذا لا بشر مثلکم ﴿ اور ظالم آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں: یہ شخص بھی تم جیسا بشر ہے ﴿ (غل/۱۰۳) حجر ۳۳، انبیاء ۳، مومنوں ۲۳، ۳۳، ۳۲، ۳۲، شوریٰ ۵۳، ۱۸۶، یسین ۱۵، تغابن ۶، مدثر ۳۵، ہود ۲۷، اسراء ۹۳، بقرہ ۲۳۔

۵۔ انبیاء نے کہا ہم تم جیسے بشر ہیں:

﴿قالت لهم رسولهم ان نحن الا بشر مثلکم﴾ ”ان کے رسولوں نے ان سے کہا: بے شک ہم تم جیسے بشر ہیں“ (ابراہیم/۱۱) ﴿قل انما انسا بشر مثلکم یوحی الی انما الہکم الہ واحد﴾ ”کہہ دیجئے: میں تم ہی جیسا ایک انسان ہوں مگر میری طرف وحی آئی ہے کہ تمہارا معبود تو بس ایک ہی ہے“ (کہف/۱۱۰)

انبیاء قرآن کریم میں فرماتے ہیں ہم بشری خصوصیات اور تقاضے میں تمہارے برابر ہیں۔

تمام انبیاء انہی ہیں

ہمارے معاشرے میں عقائد کو دلائل و برہان سے اخذ کرنے کے بجائے عقیدت کے دروازے سے حاصل کرنے کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے جس چیز کو خداوند عالم نے ثبوت وحی کے لئے بطور دلیل پیش کیا ہے، ہم اسی کی رد میں تقاریر اور لکھتے ہیں لہذا اس مقام پر ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ پہلے لفظ ”انہی“ کی کچھ وضاحت ہو جائے اور اسکے بعد وحی کی اصل حقیقت کو بھی سمجھ لیا جائے۔

تمام انبیاء عام انسانوں کی مانند بشر ہیں، عام انسان اور بشر ہونے کے علاوہ تمام انبیاء امی ہیں۔ انہی کا مطلب یہ ہے کہ علم و ادب سیکھنے کیلئے انھوں نے نہ کسی دوسرے انسان کے سامنے زانوئے تلمذانہ کیا اور نہ کبھی ہاتھ میں قلم اور تختی اٹھائی لہذا نزول وحی سے پہلے وہ ان پڑھ ہی ہوتے ہیں کیونکہ عالم ہونے کیلئے تین صورتیں ہی ہیں اور چوتھی صورت نہیں ہے:

۱۔ علم اس کا ذاتی ہو جیسے علم خداوند متعال لہذا علم اسکی صفات ذاتی میں سے ہے

۲۔ علم کسی ہو، یعنی دوسرے انسان کی شاگردی کر کے حاصل کیا ہو جیسا کہ تمام علماء اور نوابغ کا

علم۔

۳۔ علم خدا کی طرف سے موبہ اور وحی کے ذریعے ملا ہو جیسے نبی کا علم لہذا نبی نبی بننے سے پہلے ان پڑھ ہے۔ اسی لئے حضور بار بار فرماتے تھے:

”لوگو ہم نے تمہارے درمیان ایک عرصہ تک زندگی گزاری ہے، تم لوگ اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم نے کسی سے کچھ نہیں سیکھا، جو کچھ ہم بیان کر رہے ہیں یہ کلام الہی ہے جو اس نے بذریعہ وحی نازل فرمایا ہے“

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ”امی“ تھے:

کلمہ ”امی“ قرآن کریم میں ایک مرتبہ حضرت محمد کی صفات میں بیان ہوا ہے:

۱۔ ﴿الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ﴾

”(پس آج یہ رحمت اُن لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر، نبی امی کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے“ (اعراف/۱۵۷)

۲۔ یہ کلمہ اُس قوم کی صفت میں چند بار تکرار ہوا ہے جس میں پیغمبر اسلام مبعوث ہوئے:

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ﴾ ”وہی ہے جس نے اُمیوں کے اندر ایک

رسول خود انہی میں سے اُٹھایا“ (جمہ/۲) ﴿وَقُلْ لِلَّذِينَ آمَنُوا وَالْكِتَابِ وَالْأُمِّيِّينَ

اسْلَمْتُمْ فَإِنْ اسْلَمُوا فَقَدْ اهْتَدَوْا﴾ ”پھر اہل کتاب اور غیر اہل کتاب دونوں سے

پوچھو کیا تم نے بھی اس کی اطاعت و بندگی قبول کی؟ اگر کی تو وہ راہِ راست پا گئے“

(آل عمران/۲۰) ﴿قَالُوا بَلَىٰ عَٰلِمِينَ الْأُمِّيِّينَ سَبِيلُ﴾ ”وہ کہتے ہیں ”اُمیوں

(غیر یہودی لوگوں) کے معاملے میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے“ (آل عمران/۷۵)

﴿وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ﴾ ”ان میں سے ایک دوسرا گروہ اُمیوں کا ہے

جو کتاب کا تو علم رکھتے نہیں“ (بقرہ/۷۸)

پیغمبر اکرم حضرت محمدؐ ”نبی امی“ کے لقب سے زیادہ معروف ہیں نبی کو ”نبی امی“ کہنے کی مختلف توجیہات کی گئیں ہیں:

(۱) چونکہ مکہ کو ام القرئی کہتے ہیں جو کہ کل روئے زمین کا مرکز اور مصدر ہے اور پیغمبر اکرمؐ کا تعلق بھی اسی شہر مکہ سے ہے اسلئے آپ کو امی کہا جاتا ہے۔

(۲) چونکہ اہل مکہ ان پڑھ جاہل تھے یا اپنے علم، فضل اور اندر موجود اقدار اور فضیلت کو اپنے ہی پاؤں تلے روند کر جاہلیت کی زندگی گزارتے تھے لہذا ان کے جاننے والے بھی جاہلوں کے حکم میں شمار ہوتے تھے کیونکہ وہ بت پرستی کرتے تھے آپ اسی قوم سے تھا اور آپ اسی قوم میں مبعوث ہوئے تھے، اس وجہ سے آپ کو ”امی“ کہا گیا ہے:

﴿الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ﴾

”جو لوگ رسول نبی امی کا اتباع کرتے ہیں“ (اعراف/۱۵۷)

مشرقیین نے قرآن کریم کے خلاف نقد و انعقاد کیلئے اٹھائے جانے والے کلمات میں سے کلمہ ”امی“ کو سب سے زیادہ اہمیت اور اہتمام کے ساتھ اٹھایا ہے، اگر یہ بات مان لی جائے کہ پیغمبر لکھ پڑھ سکتے تھے تو مشرکین کے اس دعویٰ کو تقویت ملے گی جو کہتے تھے کہ آپ کو مکہ میں موجود ایک مسیحی تعلیم دیتا تھا چنانچہ سورہ نحل آیت ۱۰۳ میں اسی طرف اشارہ ہے:

﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّهُمْ يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ﴾ ”اور ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ مشرکین

یہ کہتے ہیں کہ انہیں کوئی انسان اس قرآن کی تعلیم دے رہا ہو“

(۳) پیغمبرؐ نہ پڑھ سکتے تھے نہ لکھ سکتے تھے اور جو کچھ اس وقت خبر دے رہے تھے وہ صرف وحی الہی تھی جس کا سلسلہ بعثت سے شروع ہوا چنانچہ سورہ نجم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”ہمارا پیغمبر وحی کے بغیر کچھ نہیں کہتا“ یہ اس نظریہ کی تائید کہ پیغمبرؐ لکھ نہیں سکتے تھے

۴) قرآن کریم میں پیغمبر اسلام کیلئے اسی ہونے کو بطور صفت بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ تمام لوگوں پر یہ بات واضح و عیاں ہو جائے کہ پیغمبر اکرمؐ اپنی امت کے سامنے جو کچھ پیش کرتے تھے وہ کسی سے حفظ کیا ہوا یا کسی کتاب سے ماخوذ نہیں ہوتا تھا بلکہ آپؐ اس میں تابع وحی تھے، پیغمبر اکرمؐ نہ لکھ سکتے تھے اور نہ پڑھ سکتے تھے اس کے ثبوت میں یہ آیت کریمہ ملاحظہ فرمائیں:

﴿وَكُنَّا نَحْمِلُ الْوِثْقَ الْوُحْمَ﴾ اور اسی طرح ہم نے آپؐ کی طرف

اپنے علم سے روح (قرآن) کی وحی کی ہے“ (شوریٰ/۵۲)

جبکہ مستشرقین نے یہ کوشش کی ہے کہ لوگ قرآن کی بجائے اُن (مستشرقین) کی بات پر یقین کر کے یہ مان لیں کہ پیغمبر لکھتے تھے اور پڑھتے تھے اور یہ قرآن انھوں نے تورات، انجیل اور اہل کتاب کی شخصیات سے حاصل کیا ہے چنانچہ مستشرقین کے سپرینجر (SPRENGER) نے اپنی کتاب ”حیات و عقیدہ محمدؐ“ میں ذکر کیا ہے کہ امی کا مطلب بت پرستی ہے اسی طرح جنٹیلو (KLSGENTI) و نیک (WENSINCK) ہورووٹس (HOROVITS) بلاڈشیر (BLACHERE) اور رودی پارٹ (RUDIPARET) وغیرہ نے کبھی تو اس کلمہ امی کو اس حوالے سے اٹھایا ہے کہ یہ پیغمبر اکرمؐ قرآن یا دین اسلام میں قوم پرستی، فرسودگی اور جاہلیت کے آثار میں سے ہیں اور کبھی انھوں نے اپنی ہی اس بات کے خلاف حضرت محمدؐ کو لکھنے پڑھنے والا گردانا ہے۔

دوسری طرف ایک عرصے سے ہمارے مناظر سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ آپؐ وحی سے ہٹ کر از خود لکھ پڑھ سکتے تھے، چنانچہ انھوں نے پیغمبر اکرمؐ کو درکنار حضرت علیؑ علیہ السلام جو خود صد بار فرماتے ہیں کہ میرے سینے میں موجود تمام علوم مجھے رسول اللہؐ سے ملی ہے: [عَلَّمَنِي رَسُولُ اللَّهِ] رسول اللہؐ نے مجھے ہزار باب سکھائے ہیں، اس کے باوجود یہ جاہل آپؐ کے بارے میں کہتے ہیں جب آپؐ پیدا ہوئے تو سجدے میں تورات، انجیل، زبور، قرآن پڑھ لیا ہم سب کیلئے یہ بات لمحہ فکریہ ہے کہ کیوں ہمارے مناظر سے اس موضوع کو خود محمدؐ اور آپؐ کی دعوت سے زیادہ

اٹھایا جاتا ہے؟ اس سے کس کی خدمت ہوتی ہے کیا اس سے وحی الہی کی ترویج ہوتی جو پیغمبر اکرمؐ اور اسلام کے بارے میں ہے یا مستشرقین کے اس مدعا کو تقویت ملتی ہے جہاں وہ کہتے ہیں کہ حضرت محمدؐ نے قرآن کریم کو تورات، انجیل اور ان کے علماء سے حاصل کیا ہے۔

مستشرقین کے تربیت یافتہ یا گماشتہ مسلمانوں کا یہ کہنا ہے کہ آپؐ لکھ بھی سکتے تھے اور پڑھ بھی سکتے تھے وہ یہ فکر اندر سے مستشرقین کی فکر کو تقویت دینے کی خاطر کہتے ہیں اور باہر سے سادہ لوح مسلمانوں کو منوانے کیلئے یہ توجیہ پیش کرتے ہیں کہ ان پڑھ پڑھ لکھ نہ جانتا، ایک عیب ہے اور حضور ہر عیب سے پاک ہیں لہذا انھیں اُمی نہیں کہہ سکتے، چاہے وہ مستشرقین کی تائید کے خاطر کہتے ہوں یا سادہ خام خیالی میں کہتے ہوں ان کی یہ فکر فرسودہ عقل و نقل سے متصادم ہے ان خیالات کے حامل افراد نے اپنی خام اور ناقص سوچ کے تحت یہ کہہ کر اُمی ہونے کو مسترد کیا کیونکہ ان کے خیال میں پڑھنا لکھنا بذات خود ایک فضیلت ہے اور پیغمبرؐ چونکہ افضل اور اشرف الناس تھے، لہذا اس فضیلت سے محروم نہیں رہ سکتے اور اگر ایسا تھا تو معاذ اللہ پیغمبرؐ ایک ناقص انسان تھے اور خدا نے ایک ناقص انسان کو نبوت کیلئے منتخب کیا ہے دراصل خود اُمی یہ سوچ ناقص اور درج ذیل وجوہات کی بنا پر غلط ہے:

(الف) علم، شجاعت، سخاوت یا کوئی بھی صفت بذات خود کوئی فضیلت نہیں رکھتی بلکہ یہ اپنی جگہ وسائل اور ذرائع ہیں ان کی فضیلت ان کے اہداف سے وابستہ ہے علم کے بارے میں آیا ہے [شرف العلوم شرف الغایات] بلکہ یہ سب اسی وقت قابل تعریف و ستائش ہیں جب انھیں صحیح طریقے سے استعمال کیا جائے لہذا کثیر روایات میں عالم بے عمل کو شجر بے ثمر اور نہر بے آب سے تشبیہ دی گئی ہے پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ عالم بے عمل دین کیلئے نقصان دہ اور آخرت میں عذاب الہی کا زیادہ مستحق ہے پس معلوم ہوا کہ علم بذات خود کوئی بافضیلت شے نہیں جب تک اس سے صحیح طور پر استفادہ نہ کیا جائے۔

ب) کسی انسان کی قوت سماعت اس لئے کمال انسانی سمجھی جاتی ہے کہ وہ آواز کو سنتا ہے لہذا وہ لوگ جو آواز سنتے ہیں نہ سننے والوں سے بہتر ہیں لیکن فرض کریں ایک ایسا شخص جو سماعت ظاہری اور بصارت ظاہری نہ رکھنے کے باوجود بہتر، صاف ستھرا اور زیادہ سنتا بھی ہو اور دیکھتا بھی ہو تو کیا ایسا شخص بھی قوت سماعت اور بصارت سے محروم شخص کے زمرے میں آئے گا جو باطنی سماعت اور بصارت رکھتا ہو اور کیا اس کے مقابلہ میں وہ پہلا شخص جو قوت سماعت رکھتا ہے اس سے بافضلیت قرار پائے گا؟۔

ج) اگر یہ کہا جائے کہ پیغمبر اکرمؐ پڑھ لکھ سکتے تھے یعنی خدا نے انہیں یہ صلاحیت دے رکھی تھی، لیکن وہ بندگان خدا پر یوں ظاہر کرتے تھے کہ آپؐ کچھ جانتے ہی نہیں ہیں ایسا ہونا تو ممکن ہی نہیں (نعوذ باللہ) یہ تو ایک بڑا دھوکہ ہوگا اسکی مثال ایک ایسے انسان کے مانند ہوگی جس نے کسی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ ڈگری حاصل کی ہو لیکن لوگوں پر یہ ظاہر کرے کہ گرچہ وہ پڑھا لکھا نہیں، اسکے باوجود سب کچھ جانتا ہے یہ تو فریب اور دھوکہ بازی ہوئی، کبھی نہ کبھی یہ راز فاش ہو گا اور لوگوں کو اصل بات کا پتہ چل جائے گا خدا اور رسول خدا سے متعلق ایسا تصور محال ہے۔

قرآن کی درج ذیل آیات سے بھی آنحضرتؐ کا اُمی ہونا ثابت ہوتی ہے:

﴿وَمَا كُنْتَ تَتْلُو مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَحِطُ بِمِيقَاتِ الْاَرْتَابِ الْمُبْطِلُونَ﴾

”(اے نبیؐ) تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے

تھے اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے“ (مکث/۳۸) ﴿وَإِنْ اتَّبَعَ

الامَانُ يَوْحٰى اِلٰى﴾ ”میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی آتی ہے“ (احقاف/۹)

﴿وَلَقَدْ شَفَعْنَا لِنَذِيْنِ بِالذِّى اَوْحٰى اِلَيْكَ.....﴾ ”جو کچھ پیغمبر کے پاس ہے وہ وحی

ہے اگر ہم چاہیں تو واپس لے سکتے ہیں“ (نبی اسرائیل/۸۶) ﴿نَحْنُ نَقْصُصُ عَلٰىكَ

اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا اَوْحٰى اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهِ لَمَنِ

الغفلین﴾ ”ہم آپ کے سامنے ایک بہترین قصہ بیان کر رہے ہیں جس کی وحی اس قرآن کے ذریعے آپ کی طرف کی گئی ہے، اگرچہ اس سے پہلے آپ بے خبر لوگوں میں سے تھے“ (یوسف/۲) ﴿لقد كنت في غفلة من هذا﴾ ”یقیناً تم اس کی طرف سے غفلت میں تھے“ (ق/۲۲) ﴿اعراف/۷۱﴾ یونس/۱۰۲۔

اسی طرح قرآن کریم میں مکرر اور بار بار آیا ہے کہ آپ وہاں نہیں تھے آپ اس وقت نہیں تھے آپ نہیں جانتے تھے ہم نے آپ کو بتایا ہے لہذا پیغمبر اکرم کا اُمی ہونا یعنی نہ لکھنا اور نہ لکھے ہوئے کو پڑھنا آپ کے معجزات میں سے ہے، لہذا جو لوگ پیغمبر کا اُمی ہونا یعنی پڑھنا لکھنا نہ جاننے کو رد کر کے پڑھنے لکھنے کو ثابت کرتے ہیں آج کے مستشرقین اُس وقت کے مشرکین کی منطق کو دہرا رہے ہیں یا ان کی آواز میں آواز ملا رہے ہیں۔

تمام انبیاء اللہ کی جانب سے مبعوث ہر رسالت ہو اسی کیفیت میں ہوئے ہیں۔

انبیاء اور علم غیب

علم غیب کے بارے میں بحث اور گفتگو کیلئے مناسب ترین جگہ بحث نبوت ہے کیونکہ خداوند متعال اپنے ذات پر ایمان لانے کے بعد نبوت پر ایمان کو علم غیب میں شمار کیا ہے کیونکہ نبی کی نبوت، نبی کی خبریں سب غیب سے ہی وابستہ ہیں، بحث نبوت میں علم کا موضوع غیب دوزادیوں سے مناسب اور سزاوار ہے:

(الف) دعوائے نبوت کرنے سے پہلے یہی شخص ایک عام انسان کی حیثیت سے معاشرہ میں زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے۔ وہ تمام خصوصیات، صفات اور نفسیات کے اعتبار سے بھی دیگر انسانوں کے مانند ہوتا ہے وہ انہی انسانوں کے معاشرہ میں، ان کے سامنے ہی پیدا ہوتا ہے اس نے یہیں رشد و نمو پائی ہوتی ہے اور دیگر لوگوں کے مانند ہی زندگی گزاری ہوتی ہے اس نے غلط رسومات، خرافات اور غلط عادات کے سوا، معاشرہ کی تمام اجتماعی سرگرمیوں میں دوسرے انسانوں کے دوش

بدوش حصہ لیا اور اس معاشرہ کے نشیب و فراز کے ادوار کو دیکھتا ہے، لوگوں نے کبھی ان انبیاء سے کوئی غیر معمولی حرکات و سکنات نہیں دیکھی لہذا لوگوں نے انبیاء سے کہا ہم ایسا انتظار کرتے تھے:

﴿قَالُوا بَلْصَلَحَ قَدْ كُنْتَ فِينَا مَرْجُوًّا قَبْلَ﴾ ”انھوں نے کہا: اے صالح! اس سے پہلے

ہم تم سے بڑی امیدیں وابستہ رکھتے تھے“ (حود/۶۲)

ب) اس انسان (نبی) نے کسی مکتب، کسی استاد، کسی معلم کے حضور علم و آگاہی کیلئے زانوئے تلمذ نہیں کیا اس نے شاگردی کیلئے کسی کے آگے سر نہیں جھکایا اس نے لکھنے کی مشق کیلئے نہ کبھی سختی لی اور نہ قلم پکڑا۔ لہذا ایک ایسے ہی انسان کو عربی زبان میں اُمّی کہتے ہیں لہذا نبی کو اُمّی کہنا سو فیصد حقیقت اور واقعیت سے مطابقت رکھتا ہے۔ خداوند متعال نے ہمیشہ امی ہی کو منصب نبوت کیلئے انتخاب فرمایا ہے۔ شاید اس میں یہ حکمت پوشیدہ ہو کہ یہ انسان جو دعوائے نبوت کر رہا ہے، سرچشمہ وحی سے متصل ہے اور من اللہ خبر دیتا ہے۔

موضوع علم غیب انبیاء کو کھولنے کیلئے ضروری ہے کہ ”علم“ اور ”غیب“ دونوں پر جدا گانہ بحث و گفتگو کریں ”علم“ جیسا کہ علماء نے تعریف کی ہے کسی چیز کی شکل و صورت کا ذہن میں حاضر ہونا یا ہر وہ چیز جو انسان کے سامنے ہوا سے علم کہا جاتا ہے دوسرا کلمہ ”غیب“ ہر وہ غیر محسوس، پوشیدہ چند چیز ہے جو اس ظاہری کے مشاہدے میں نہیں آتی اسے ”غیب“ کہتے ہیں اگر اس تک رسائی ہو جائے اور آگاہی حاصل ہو تو اس سے متعلق خبر کو علم غیب کہتے ہیں۔

کائنات کے تمام تر حقائق یعنی مادیات، مجردات اور عقلیات سب کو شامل کرنے کے بعد انکو خداوند عالم نے بہت سی آیات قرآنی میں دو حصوں میں تقسیم کیا ہے:

الف: ایک ”عالم غیب“ یعنی وہ حقائق جو ہماری نظروں سے مخفی اور پوشیدہ ہیں۔

ب: دوسرا ”عالم شہود“ یعنی وہ حقائق جو نظروں کے سامنے موجود ہیں۔

چنانچہ درج ذیل آیات قرآنی میں اس تقسیم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

﴿علم الغیب والشہادۃ وهو الحکیم الخبیر﴾ ”وہ غیب اور شہادت ہر چیز کا عالم ہے اور دانا و باخبر ہے“ (انعام/۷۳) ﴿وستردون الی علم الغیب والشہادۃ فنبینکم بما کتتم تعلمون﴾ ”پھر تم اس کی طرف پلٹائے جاؤ گے جو کھلے اور چھپے سب کو جانتا ہے اور وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو“ (توبہ/۱۰۵) ﴿علم الغیب والشہادۃ الکبیر المتعال﴾ ”وہ پوشیدہ اور ظاہر، ہر چیز کا عالم ہے۔ وہ بزرگ ہے اور ہر حال میں بالاتر رہنے والا ہے“ (زمرہ/۹)

﴿علم الغیب والشہادۃ العزیز الحکیم﴾ ”حاضر اور غائب ہر چیز کو جانتا ہے، زبردست اور دانا ہے“ (تفائین/۱۸)

یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ موجودات عالم دو حصوں یعنی غیب اور حضور میں تقسیم کئے گئے ہیں، ہم آپ کے سامنے غیب کے اقسام پیش کریں گے۔

اقسام غیب

(۱) غیب حقیقی: وہ موجود جو ہر زمانہ میں اور ہر زاویہ نگاہ سے غیب مطلق ہے اسے غیب حقیقی کہتے ہیں، نہ زمان اسے عیاں کر سکتا ہے، حتیٰ کہ خوردین اور دور بین اسے نمایاں کر سکتی ہیں ہمیشہ سے غیب تھا آج بھی غیب میں ہے اور آئندہ بھی غیب میں رہے گا وہ کسی کے لئے کسی بھی وقت حضور اور شہود میں تبدیل نہیں ہو سکتا یہ غیب حقیقی ذات باری تعالیٰ ہے وہ نہ صرف اس عالم مادی میں غیب میں ہے بلکہ اسکے بعد آنے والے عالم بالا یعنی آخرت میں بھی غیب ہی رہے گا جتنی بھی آیات اور روایات، اس ذات تک رسائی یا اسکی روایت کے بارے میں بیان کی گئی ہیں انکا مقصد رویت بصیرت ہے نہ رویت بصری کیونکہ وہ کبھی بھی کسی شکل میں نہیں آ سکتا اور اسکی حقیقت پر ایمان کامل اور حق یقین کے درجہ پر فائز ہونے کو رویت اور بصارت سے تعبیر کیا گیا ہے ورنہ بصارت طبعی اور

دیکھنا لو جی اسے درک کرنے سے قاصر ہیں۔

(۱) غیب حقیقی

وہ ہستی جو ہر معنی اور ہر زاویہ کے حوالہ سے غیب ہو، اغیاب میں سب سے زیادہ غیب کہے جانے کے لائق و سزاوار ہو، جس کا کسی بھی اعتبار سے شہود مادی و جسمانی میں آنا ممکن نہ ہو، وہ ”غیب مطلق“ یا ”غیب حقیقی“ کہلاتی ہے۔

خداوند تعالیٰ کی ذات غیب مطلق ہے جبکہ کل کائنات اس کے لئے حضور و عیاں ہے۔ لہذا خداوند متعال کے متعلق یہ کہنا کہ وہ علم غیب جانتا ہے، ہرگز مناسب نہیں کیونکہ کوئی چیز کسی بھی صورت میں کبھی بھی خدا کیلئے غیب ہے ہی نہیں، پس یہ کہنا کہ ”خدا علم غیب جانتا ہے“ سے مراد یہ ہے کہ وہ علوم اور حقائق جو ہمارے لئے غیب ہیں وہ سب کے سب اس کے لئے حضور و شہود میں ہیں ہر چیز ہمیشہ اس کے حضور اور شہود میں رہتی ہے اس بات کو ہم ایک مثال کے ذریعہ سمجھ سکتے ہیں فرض کریں کہ ہم خود اپنے بارے میں یہ خیال کریں کہ ہم اس وقت یہاں نہیں ہیں یا یہ کہ وجود میں آئے ہی نہیں ہیں کیا حقیقت میں ایسا ممکن ہے؟ ہرگز نہیں، ہم کتنا ہی اپنے آپ کو پوشیدہ اور غائب کریں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، ہر حال میں ہم خود اپنے حضور میں حاضر ہونگے بالکل اسی طرح اس رب کائنات کے لئے ہر چیز ہمہ وقت حاضر اور ناظر رہتی ہے لہذا علم غیب خدا، مخلوقات کے علوم غیب سے کئی اعتبار سے ممتاز اور جدا ہے خدا علم غیب نہیں رکھتا بلکہ اس کیلئے کوئی چیز غیب میں نہیں ہے لہذا فرماتے ہیں:

﴿وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾

”اور آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتوں کا علم صرف اللہ کو ہے“ (سورہ/۱۲۳)

(۱) دنیا و مافیہا، ماضی، حال، مستقبل، کچھ بھی خدا کیلئے غیب نہیں، بلکہ سب کچھ اس کیلئے حاضر اور شاہد ہے پھر بھی یہ کہنا کہ ”اس کے پاس علم غیب ہے“ یہ دراصل ہماری نسبت سے کہا جاتا ہے

کیونکہ جو چیز ہمارے لئے غیب ہے، وہ اسے جانتا ہے۔

(۲) جس طرح ذات خدا غیر محدود ہے اس کا علم بھی لامحدود ہے علم خدا کسی حد و قید میں نہیں آ سکتا چونکہ علم خدا، ذات خدا سے جدا نہیں اس لئے وہ بھی غیر محدود ہے اس کے سوائے دیگر تمام مخلوقات کے علوم، چاہے وہ اس کے منتخب اور مصطفیٰ بندے ہی کیوں نہ ہوں، اس کی نسبت محدود ہیں وہ تو بس اتنا جانتے ہیں جتنا انھیں خدا تعالیٰ نے سکھایا ہے چنانچہ حضرت عیسیٰ کی زبان سے منقول آیت کریمہ ہے: ”میں وہ جانتا ہوں جو تو نے مجھے سکھایا ہے۔“

(۳) علم خدا اس ذاتی ہے، کسی سے ماخوذ نہیں ہے اس کے علاوہ جتنی بھی مخلوقات ہیں، کسی کا علم ان کا ذاتی نہیں کیونکہ خود ان کا وجود ذاتی نہیں بلکہ اللہ کا عطا کیا ہوا ہے تو بھلا ان کا علم کس طرح ذاتی ہو سکتا ہے؟ جس طرح انکی ذات کی بقاء ذات خدا سے وابستہ ہے، اسی طرح ان کا علم بھی اس سے وابستہ ہے چنانچہ قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات کریمہ میں خداوند عالم نے علم غیب حقیقی کو اپنی ذات سے مختص کیا ہے:

﴿وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ﴾ ”اور اس کے پاس غیب کے خزانے ہیں جنہیں اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ہے“ (انعام/۵۹) ﴿قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ﴾ ”کہہ دیجئے کہ آسمان و زمین میں غیب کا جاننے والا اللہ کے علاوہ کوئی نہیں ہے“ (نمل/۶۵) ﴿قُلْ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ﴾ ”انہوں نے کہا کہ علم تو بس خدا کے پاس ہے“ (انعام/۲۳) ﴿قُلْ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ﴾ ”آپ کہہ دیجئے کہ علم تو بس خدا کے پاس ہے“ (ملک/۲۲) ﴿إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ﴾ ”تو، تو غیب کا جاننے والا بھی ہے“ (مائدہ/۱۱۶) ﴿تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوْحِيهَا إِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا﴾ ”یہ ہیں علم کی کچھ خبریں جو ہم آپ کی طرف وحی کر رہے ہیں اس سے پہلے نہ آپ ان باتوں کو جانتے تھے“ (حود/۳۹) ﴿قُلْ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوا﴾ ”غیب

السموات والارض ﴿

”کہہ دو کہ جتنی مدت وہ رہا اسے خدا ہی خوب جانتا ہے۔ وہی آسمانوں اور زمین کی

پوشیدہ باتیں جانتا ہے“ (کہف/۲۶)

(۲) غیبِ عرفی: عرفِ عام میں ہر وہ چیز جو انسان کے حواسِ خمسہ سے اوجھل ہو اور اسکی حدود بصارت سے باہر ہو، اسکے دائرہ افق سے خارج ہوئی زمانہ اسے غیب کہتے ہیں ہو سکتا ہے پہلے وہ حضور میں ہو، اب غیب میں چلی گئی ہے جیسے انبیاءِ گذشتہ، اقوامِ مفلک گذشتہ یا ابھی غیب میں ہے اور آنے والے زمانہ میں حضور میں تبدیل ہو جائے اس غیب کے مختلف مصداق ہیں:

الف) زمانِ گزشتہ

دورِ حاضر کے انسان کیلئے گزشتہ زمانہ غیب ہے یعنی اس سے پہلے گزرنے والے تمام انسان، موجودات، واقعات اور حوادث اس انسان کیلئے غیب ہیں قانونِ طبیعی کے حوالہ سے اس کیلئے انکا حضور میں تبدیل ہونا ممکن نہیں مگر یہ کہ وحیِ الہی کے ذریعے جیسے قرآن کریم میں آیا ہے:

﴿وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَا الْأُمُورَ مَا كُنْتَ

الشَّاهِدِينَ﴾ ”اور آپ اس وقت (طور کے) مغربی جانب موجود نہ تھے جب ہم نے

موسیٰ کی طرف حکم بھیجا اور آپ مشاہدہ کرنے والوں میں سے نہ

تھے“ (قصص/۴۴) ﴿وَأَنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهِ لَمَنِ الْغَفْلِينَ﴾ ”اور آپ اس سے پہلے (ان

واقعات سے) بے خبر تھے“ (یوسف/۳) کسی آلے میں ضبط ہوئی ہوں۔

ب) زمانِ مستقبل

ہر آئندہ آنے والا دن اور اس میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات دورِ حاضر کے انسان کیلئے غیب ہیں ممکن ہے آج کا انسان آئندہ زمانہ تک زندہ رہے اور آج جو کچھ اس کے لئے غیب ہے کل حضور اور شہود بن جائے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس غیب کے حضور میں تبدیل ہونے سے پہلے ہی وہ اس

دنیا سے رخصت ہو جائے۔

(۳) غیب مکانی

ہر وہ چیز جو انتہائی فاصلہ پر واقع ہو غیب ہے جب تک فاصلوں کو نزدیک کر کے دکھانے والے آلات استعمال نہ کئے جائیں جیسا کہ پہلے غیب کی تعریف میں بیان کیا جا چکا ہے، انسان کی حد بصر سے باہر شش جہات انسان کیلئے غیب ہیں جب تک وہ نقل و حرکت نہ کرے یا وہ وسائل اور ذرائع جو دور کو نزدیک اور چھوٹے کو بڑا کر دکھاتے ہیں، انہیں استعمال نہ کرے، اس کیلئے یہ سب کچھ غیب رہے گا۔

(۴) غیب حسی (تجم میں چھوٹا ہونے سے)

بہت سے اجسام اتنے چھوٹے ہیں کہ طبعی بصارت انکی رویت سے محروم رہتی ہے لہذا یہ اجسام غیب میں رہتے ہیں تا وقتیکہ دیکھنے کے لئے ایسا آلہ استعمال نہ کیا جائے جو انہیں چند گنا بڑا کر کے دکھائے۔

(۵) غیب مجرد

غیب مجرد وہ ہے جو اپنی لطافت کی وجہ سے کسی بھی وسائل حس میں نہیں آتا، تمام مجردات جسم اور جسمانیات سے خارج ہیں وہ کسی خوردبین اور دوربین یا کسی دیگر آلے میں نہیں آسکتے، اس کی چند قسمیں ہیں:

۱۔ مجرد حقیقی: مجرد حقیقی صرف ذات خداوند متعال تک محدود ہے یہ ذات کسی بھی صورت میں کسی مادہ کی شکل و صورت میں نہیں آسکتی جو چیز مادی شکل و صورت بھی آجائے تو سمجھ لیں کہ وہ مجرد حقیقی نہیں ہے۔

۲۔ مجرد لطیف الجسم: یعنی مجرد حقیقی نہیں ہے بلکہ وہ مجرد مجازی ہے وہ خود کو دیگر موجودات جسمانی کی شکل و صورت میں تبدیل کر سکتا ہے جیسے ملائکہ مجردات عالم علوی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یہ کسی

وقت بھی خود کو جسم کثیف (ٹھوس) میں تبدیل کر سکتے ہیں لیکن نجس العین شکل و صورت میں تبدیل نہیں کر سکتے جیسے وہ ملائکہ جو حضرت ابراہیمؑ حضرت لوطؑ اور حضرت مریمؑ (س) کے پاس بشری صورت میں آئے اور اسی طرح حضرت محمدؐ کے پاس ”دجیہ کلبی“ کی صورت میں آئے اور جب بدر میں مشرکین نے ملائکہ کو بشری صورت میں دیکھا ملائکہ کو اپنی حقیقی صورت میں صرف پیغمبر اکرمؐ نے دیکھا۔

۳۔ ”جن“: مجرداتِ سفلی ہے جو ہر اچھے برے کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔

۴۔ مجرد کی چوتھی قسم وہ ہے جو کسی مادہ کی شکل و صورت میں نہیں آ سکتی لیکن مادے میں حلول کر سکتی ہے اور جگہ بنا سکتی ہے جیسے روح، عقل، ایمان، ملائکہ، علم، کفر، شرک، دریا وغیرہ یہ تمام چیزیں مجردات کہلاتی ہیں۔ انسان انکی آثار اور نشانیوں کے ذریعہ آگاہی حاصل کر سکتا ہے ان میں سے بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو انسان کے محسوسات میں نہیں آتیں، اس کے باوجود انسان ان کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔

(۶) حجاب و موانع

ہر وہ شے غیب ہے جس کے اور انسان کے درمیان موانع حائل ہوں جیسے انسان کے اندر موجود جراثیم جن سے انفیکشن لاحق ہوتا ہے غیب ہیں یا حمل اس وقت تک غیب رہے گا جب تک وہ وسائل استعمال میں نہ لائے جائیں جو اس حجاب میں شکاف کر کے حقائق کو حضور (شہود) میں تبدیل کرتے ہیں غرض ان میں سے بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن تک دور انبیاءؑ اور ائمہؑ میں رسائی و آگاہی بشر کیلئے میسر نہیں تھی لہذا یہ چیزیں اس وقت کے انسانوں کیلئے غیب تھیں مگر انبیاء کرامؑ نے بغیر کسی ظاہر و مسائل اور ذرائع کے، وحی الہی کی روشنی میں بہت سی ایسی چیزوں کی خبر دی بعض آیات اور روایات میں اسے علم بالغیب کہا گیا ہے یہ تمام اقسام غیب مادی ہیں۔

۷) غیب مجازی

اس کے علاوہ غیب کے جتنے بھی مصادیق اور مظاہر ہیں، سب کے سب شہود اور حضور کے دور سے گذر کر غیب میں تبدیل ہوئے ہیں مثال کے طور پر دنیا میں جتنے بھی انسان گزرے ہیں وہ ایک عرصہ زندگی گزارنے کے بعد اس دنیا سے کوچ کر گئے اور یہاں کے حوالے سے غیب میں چلے گئے۔ اس دنیا میں پھر سے انکا حضور اور شہود ناممکن ہے سوائے اس کے کہ اس عالم کی بساط کو جمع کر کے اس سے پردے کو ہٹایا جائے تو ممکن ہے کہ شہود و حضور میں آجائیں اسی طرح جو آج موجود ہیں کسی نہ کسی دن وہ بھی غیب میں چلے جائیں گے لہذا وہ ذات جسکے لئے حضور اور شہود جسمانی یا مادی کبھی بھی ممکن نہیں اور وہ غیب جو حقیقی معنوں میں غیب کہے جانے کا مستحق ہے، وہ ”غیب مطلق“ اور وہ ”غیب حقیقی“ ذات باری تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور نہیں، اس لئے قرآن کریم میں سورہ توحید یا سورہ اخلاص کو ائمہ اطہار نے نسب خدا کہا ہے اس سورہ مبارکہ میں خداوند عالم نے اپنی ذات کی تعریف کا آغاز ”ھُو“ سے کیا ہے لفظ ”ھُو“ ضمیر غائب ہے ضمیر غائب سے سورہ کی ابتداء کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ خلق خدا جان لے کہ کبھی بھی اور کسی بھی صورت میں ذات خدا رویت بصری میں نہیں آئے گی۔

درج بالا مثال سے ثابت ہوتا ہے کہ ایمان بالغیب یعنی غیر بصری اور غیر سمعی موجود پر عقیدہ قائم کرنا عقل و فطرت انسانی سے متصادم اور متضاد نہیں ہے بلکہ ناگزیر ہے لیکن پہلے ایمان بالغیب اور علم غیب میں فرق واضح ہونا ضروری ہے۔

ایمان بالغیب اور علم غیب

عقائد میں سب سے بنیادی عقیدہ ایمان بالغیب ہے یعنی وجود خدائے واحد و یکا اور اسکی ذات و صفات میں وحدانیت ہونے پر ایمان، اس کے علاوہ تمام انبیاء، حیات بعد الموت، برزخ، حشر و نشر، جنت اور جہنم سب پر ایمان رکھنا بھی لازمی ہے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان کو غیب کی

خبر دی جائے کیونکہ اس وقت دنیا میں بہت سے گروہ نکلے ہیں جو علم غیب رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں اس ضمن میں یہ کبھی آیات اور روایات سے بھی استدلال کرتے ہیں اس سلسلہ میں ایک فہرست پیش خدمت ہے:

۱۔ علم نجوم رکھنے والے۔

۲۔ سائنسی ماہرین۔

۳۔ عرفاء۔

۴۔ آئمہ معصومین۔

۵۔ انبیاء کرام۔

انبیاء کا حامل علم غیب ہونا ہمارے عقائد کے بنیادی معتقدات میں شمار ہوتا ہے۔ اس لئے علم غیب کے موضوع پر گفتگو انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ اسلئے بھی ضروری ہے کہ ظاہری طور پر بعض آیات قرآنی اور روایات اور اسی طرح جدید سائنسی علوم اور اہل طریقت و سیر سلوک اور عرفان سے نقل ہونے والے واقعات اور قصے آپس میں متضاد و متصادم نظر آتے ہیں اس موضوع کے بارے میں بہت زیادہ افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے اور شکوک و شبہات کا اظہار کیا گیا ہے علم غیب کو صرف خدا تک محدود رکھنا یا اسے توسیع دینے کے سبب اعتقادات میں کثیر اختلافات پیدا ہو گئے ہیں لہذا ضروری ہے کہ اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ گفتگو کی جائے تاکہ تمام زاویوں سے اس مسئلہ کو واضح کیا جاسکے۔

”خدا علم غیب جانتے ہیں“ یہ جملہ ایک کثرت زبان انسان کی گفتگو کے مانند ہے یا ایک عمیق اور باریک فلسفی و علمی مسائل کسی طالب علم یا جاہل انسان کی زبان سے جاری ہونے کی طرح ہے کیونکہ خدا کیلئے کوئی شے غیب نہیں کہ اس کے بارے میں خدا کو علم کی ضرورت ہو قرآن میں کہیں بھی یہ جملہ نہیں ملتا ہے بلکہ خدا فرماتے ہیں جو تمہارے لئے غیب ہے وہ ہمارے پاس ہے لہذا عالم

الغیب کہنے کے مستحق انبیاء ہیں کیونکہ وہ انسانوں کو غیب سے خبر دیتے ہیں ان کی باتوں پر یا ان کی خبروں پر تصدیق کرنے کو ”ایمان بالغیب“ کہتے ہیں لیکن آپ کے غیب کی کیمت کو جذبہ محبت اور عقیدت سے ناپا نہیں جاسکتا ہے اس سلسلہ میں سب سے پہلا اور واحد رویہ وہ کتاب ہے جو پیغمبر اکرمؐ نے اپنی غیب گوئی یا غیب کی خبر کے سند میں پیش کیا ہے وہ قرآن کریم ہے اس سلسلہ میں ہمیں قرآن ہی کی طرف رجوع کرنا ہے وہ انبیاء یا ہمارے پیغمبر کیلئے کتنے غیب رکھنے کی تصدیق کرتے ہیں۔

”نبی“ اس انسان کو کہتے ہیں جو دیگر انسانوں کے ساتھ ہر لحاظ سے برابر کا شریک ہو اور انسان ہونے میں دیگر انسانوں کے مقابلہ میں کسی قسم کا فرق اور امتیاز نہیں رکھتا ہو ہر وہ صفت جسے انسان کی انسانیت میں کمال تصور کیا جائے، نبی میں بطور اتم پائی جاتی ہے اور ہر وہ چیز جو انسان کو انسانیت سے گرانے کا سبب بنتی ہے اور اس کو حیوانیت اور بہیمیت سے متصف کرتی ہے، ان سے یہ پاک اور منزہ ہوتے ہیں چونکہ انبیاء کرامؐ دیگر انسانوں کے مانند ہوتے ہیں، ان ہی کے درمیان نشوونما پاتے ہیں اور زندگی گزارتے ہیں اس وجہ سے بہت سے لوگوں نے انہیں خدا کا نمائندہ قبول کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا: ”تم بھی ہمارے جیسے بشر ہو“

علم غیب پیغمبر، پیغمبر کا ذاتی علم نہیں بلکہ خدا کا ودیعت اور عصا کیا ہوا ہے چنانچہ قرآن کریم کی متعدد آیات علم غیب پیغمبر کے ان کا ذاتی ہونے کی رد میں وارد ہوئی ہیں:

﴿تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوْحِيهَا إِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هَذَا﴾ ”پیغمبر یہ غیب کی خبریں ہیں جن کی ہم آپ کی طرف وحی کر رہے ہیں جن کا علم اس قبل نہ آپ کو تھا نہ آپ کی قوم کو“ (حود/۳۹) ﴿وَمَا يَدْرِيكَ لَعَلَّهِ يَذْكُرُ﴾ ”اور تمہیں کیا معلوم شاید وہ پاکیزہ نفس ہو جاتا“ (سج/۳) ﴿وَمَا أَدْرَاكَ مَا عَلَيْنَا﴾ ”اور اور تم کیا جانو کہ علیین کیا ہے“ (مطلین/۱۹) ﴿وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدَرِ﴾ ”اور

آپ کیا جانیں کہ یہ سب قدر کیا چیز ہے“ (قدر/۲)

خود پیغمبر نے بھی علم غیب کے جاننے کے بارے میں صراحت کے ساتھ نفی کی ہے
ملاحظہ فرمائیے:

﴿وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ أَنِّي مُلْكٌ﴾ ”اور نہ ہم عالم غیب ہیں اور نہ یہ کہتے
ہیں کہ ہم ملک ہیں“ (انعام/۵۰)

﴿وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ أَنِّي مُلْكٌ﴾ ”اور نہ ہر غیب کے جاننے کا دعویٰ کرتا
ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں“ (حور/۳۱) ﴿وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ﴾ ”اور
اگر میں غیب سے باخبر ہوتا“ (اعراف/۱۸۸) ﴿فَالْوَلَا أَعْلَمُ لَنَا﴾ ”وہ کہیں گے کہ ہم کیا
بتائیں تو خود ہی غیب کا جاننے والا ہے“ (مائدہ/۱۰۹)

آل عمران ۷۹ اور سورہ جن آیت ۲۶ اور ۲۷ میں خداوند عالم نے فرمایا کہ علم غیب خلائق میں سے
صرف وہی جانتے ہیں جنہیں ہم منتخب کرتے ہیں:

﴿عَلَّمَ الْغَيْبَ فَلَا يَظْهَرُ عَلَيْهِ غَيْبٌ أَحَدًا۔ أَلَا مَن ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ﴾ ”وہ غیب
کا جاننے والا ہے اور اپنا غیب کسی پر ظاہر نہیں کرتا۔ سوائے اس رسول کے جسے اس
نے برگزیدہ کیا ہو۔“

خدا اور انبیاء کے علم غیب میں بنیادی فرق

علم غیب انبیاء و رسل علم غیب خداوند متعال سے دو لحاظ سے مختلف ہیں:

۱) علم غیب انبیاء و رسل دیگر خلائق کے علم غیب کے مقابلہ میں تالاب یا حوض کے مقابلہ میں
سمندر کا ہے حوض کے مقابلہ میں سمندر کو غیر محدود قرار دیا جاسکتا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے
کہ سمندر خود اپنی جگہ محدود ہے لہذا انبیاء کا علم ہم جیسوں کے مقابلہ میں سمندر کے مانند
ہونے کے باوجود علم خدا کے سامنے محدود اور ناچیز ہے یہ کہنا شرک اور کفر کے مترادف ہوگا

کہ جو کچھ خدا جانتا ہے نبی بھی جانتا ہے آیات نفی شریک خداوند متعال اس مدعا کے بطلان پر مہر محکم ہیں۔

۲) دوسرا فرق یہ ہے کہ نبی کا علم غیب، خدا کے علم غیب کے مقابلے میں عارضی، طفیلی، وابستگی اور نیاز مندی ضرورتاً اور وقتی کا علم ہے۔ یہ نبی یا رسول کل تک عام انسانوں کے مانند تھے، لیکن آج خداوند متعال سے ارتباط کی وجہ سے خلا اور اشتباہ سے محفوظ اور علم سالم اور غیب کے حامل ہو گئے ہیں وہ اس علم کو لینے میں، محفوظ کرنے میں، غرض ہر لحاظ سے اس ذات پاک کے نیاز مند اور محتاج ہے اور ہر آن اور ہر لحظہ، منتظر وحی رہتے ہیں اس نیاز مندی اور ضرورت کو خلافت پر ثابت کرنے کی خاطر پیغمبر اکرمؐ بارہا لوگوں کے سوالوں کے جواب میں فرماتے تھے:

”تم بھی انتظار کرو ہم بھی انتظار کرتے ہیں“ چنانچہ سورۃ الضحیٰ کی شان نزول کے ذیل میں بیان ہوا ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرمؐ پر کچھ مدت کیلئے وحی کا سلسلہ بند ہوا تا کہ خداوند عالم نے سورۃ نجم میں جو یہ فرمایا کہ ہمارا نبی بغیر وحی کے گفتگو نہیں کرنا، اس کا عملی مظاہرہ ہو جائے۔ لہذا جب وحی کا نزول بند ہو گیا تو آپؐ کی گفتگو بھی بند ہو گئی۔

انبیاء اور دنیا کے دانشوروں کی غیب گوئی میں فرق

دنیا میں قدیم دور سے لیکر دور حاضر تک کے مختلف علماء اور دانشور اپنے اپنے شعبوں مثلاً سیاسیات، اقتصادیات، اجتماعیات، فلکیات، ماحولیات، جنگ وغیرہ میں اپنی تحقیق کی بنیاد پر پیش گوئیاں کرتے آئے ہیں اور یہ سلسلہ اب بھی جاری و ساری ہے، نت نئی ایجادات کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے وسائل و ذرائع کے بعد غیب گوئی میں بہت مدد ملی ہے مثال کے طور پر ماہرین فلکیات کیلئے نئی رسد گاہوں کا دستیاب ہونا، علم طب میں الٹراساؤنڈ اور جدید لیبارٹریوں کی سہولیات کے ذریعہ حکمِ مادر میں موجود بچے سے متعلق معلومات کی فراہمی اور مصنوعی (سلائیٹ) سیاروں کے ذریعہ قبل از وقت دوسرے ممالک کی جنگی سرگرمیوں کی خبریں ملنا وغیرہ۔ بعض دشمنانِ دین اور

ضد دین عناصر نے ان آلات کی مدد سے فراہم ہونے والی معلومات کو مثال بنا کر انبیاء کی غیب گوئی کو بے قدر و قیمت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان ماہرین علوم و فنون کی غیب گوئی اور انبیاء کی غیب گوئیوں میں متحد و زاویوں سے نمایاں فرق ہے:

(۱) انبیاء کرام نے کسی مکتب اور مدرسہ میں ان موضوعات پر نہ درس لیا اور نہ اس سلسلے میں انہوں نے کبھی کوئی تحقیق اور ریسرچ کی ہے جبکہ دانشور حضرات ایک عمر حصول تعلیم اور تحقیق میں گزارنے کے بعد اس قابل ہوتے ہیں کہ اپنے شعبہ میں غیب گوئی (پیشن گوئی) کر سکیں۔

(۲) انبیاء جو بھی غیب گوئی کرتے تھے وہ بغیر کسی مادی وسائل اور ذرائع اور تجسس و تحقیق کے کرتے تھے، جبکہ آج کل کے غیب گو (پیشن گوئی کرنے والے) حضرات مادی وسائل و ذرائع پر انحصار کرتے ہیں مثلاً اگر شکم مادر میں موجود مولود کے بارے میں ڈاکٹر کچھ کہتا ہے تو وہ ایک خاص مشین اور آلے کا محتاج ہے، یہ مشین اور آلہ بجلی کی برقراری کا محتاج ہے، حتیٰ اس مواد کا محتاج ہے جو اس آلے میں استعمال ہوتا ہے، تب کہیں جا کر وہ کچھ بتا سکتا ہے۔

(۳) بہت سے مایہ ناز غیب گو حضرات، ماہرین علوم و فنون نے پیشن گوئیاں کی ہیں۔ لیکن ایسا بھی ہوا کہ بعد میں انھیں شرمندگی اٹھانی پڑی کیونکہ امر واقعہ انکی پیش گوئی کے مطابق نہ ہوا۔ اسکے برعکس انبیاء و ائمہ نے غیب کی جو باتیں بتائیں کبھی بھی اور ذرہ بھر بھی خلاف واقعہ نہ نکلیں۔

حقیقت وحی

علمائے اعتقاد لکھتے ہیں کہ بنی وہ انسان ہے جو بغیر کسی واسطہ بشر کے، خدا سے ہدایت اور شریعت لیتا ہے اس اخذ کو قرآن کریم نے وحی کا نام دیا ہے دور قدیم سے عصر حاضر تک بہت سے خود غرض، مفاد پرست اور دین دشمن عناصر نے اس منصب کے تصور کو کمزور کرنے، قلعہ ٹھہرانے یا انسان کو اس سے جدا رکھنے کی خاطر مختلف زاویوں سے مختلف تو جیہات وضع کی ہیں۔

بعض نے عقل کے ہوتے ہوئے حصول سعادت کو وحی سے بے نیاز گردانا ہے۔ دور حاضر میں

نت نئے انکشافات و اختراعات اور تجربی علوم میں محیر العقول پیشرفت کو بنیاد بنا کر وحی سے بے نیازی کی مہم چلائی جا رہی ہے بعض نے وحی کی ضرورت کو تسلیم کرنے کے بعد اس تک رسائی حاصل کرنے کے دروازے کو فتح کرنے کی کوشش کی ہے انکا خیال ہے کہ انسان کے اندر ایسی انمول صلاحیتیں موجود ہیں جن کی بدولت کبھی کبھی فوق العادت غیر عادی اور غیر معمولی افعال ظہور و نمود پا سکتے ہیں، یعنی انتہائی کوششوں کے بعد، زہمتوں اور تکلیفوں کو برداشت کر کے یا عبادت اور ریاضت کے ذریعہ، تطہیر اخلاق کی منازل طے کرتے ہوئے ایسے مقام و منصب پر فائز ہو سکتے ہیں اس فکر کے حامل لوگوں کے خیال میں بندگان خدا شوق لقاء اللہ میں مسابقہ و مقابلہ کے اس میدان میں داخل ہوتے ہیں، بعض پیچھے رہ جاتے ہیں اور بعض آگے بڑھ جاتے ہیں، اسی طرح سے بعض مقام و ولایت حاصل کر لیتے ہیں اور بعض نبوت و رسالت کے درجہ پر فائز ہو جاتے ہیں، اس فکر کو فروغ دینے والے لوگ اپنے مدعا کیلئے کسی نہ کسی آیت، روایت، مشاہدہ، خواب یا کہانی کا سہارا لیتے ہیں ان میں سے بعض تو مذموم عزائم رکھتے ہیں، بعض وہ ہیں جو حسن نیت کے ساتھ میدان تحقیق میں قدم رکھتے ہیں لیکن حقیقت درک نہیں کر پاتے، بعض دلائل و براہین سے زیادہ کہانیوں اور کہاوٹوں پر بھروسہ کر کے راستہ بھٹک جاتے ہیں۔

جہاں تک سیر الی اللہ، لقاء اللہ اور قرب خدا کا تعلق ہے، یہ راستہ، یہ دروازہ، خلائق کیلئے فقط کھلا ہی نہیں ہے بلکہ خدا کی طرف سے اس پر آنے کیلئے دعوت عام ہے دعوت نامہ کتب آسمانی ہیں اور بلانے والے انبیاء و مرسلین ہیں جو لوگ اس راستہ پر قدم رکھتے ہیں انکو ہر قدم پر خدا کی مدد، نصرت اور رہنمائی حاصل ہوتی ہے لیکن مقام نبوت و رسالت ایسا منصب نہیں جو صلاحیت اور کوشش کے نتیجہ میں حاصل ہو سکے اس منصب پر بقدر ضرورت زمان اور مکان، خداوند متعال محدود افراد کو خلائق کی ہدایت کیلئے منتخب کرتا ہے اس انتخاب کی ابتدا سے لیکر انتہا تک خدا اور ان منتخب بندوں کے درمیان رابطہ کا نام ”وحی“ ہے چنانچہ سورہ مبارکہ شوریٰ آیت ۵۱ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يَتَكَلَّمَ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا
فِيْهِ وَحْيٌ بِأَذْنِهِ مَا يَشَاءُ﴾ ”اور کسی انسان کیلئے نہیں کہ اللہ اس سے باتیں کرے مگر وحی
کے ذریعے یا پردہ کے پیچھے سے یا پھر وہ پانے کسی پیغامبر (فرشتے) کو بھیجتا ہے اور وہ
حکم خدا کے مطابق جو کچھ اللہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے“

اس آیت سے معلوم ہوا کہ خداوند عالم اپنے ان منتخب بندوں سے اس طرح سے مخاطب اور
تکلم نہیں کرتا کہ جس طرح ایک انسان دوسرے انسان سے ہم کلام ہوتا ہے بلکہ یہاں انداز مخاطب
اور تکلم کچھ اور ہے اور اس انداز مخاطب کو خدا نے وحی کا نام دیا ہے یہ تکلم کبھی کسی حجاب کے ذریعہ ہوتا
ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخت کے ذریعہ گفتگو فرمائی، اور کبھی ملائکہ (جبرائیل)
کے توسط سے، وحی کا ایک اور ذریعہ القاء فی القلب ہے جو کبھی الفاظ اور کلمات کی شکل میں ہوتا ہے
جیسے آیات قرآنی اور کبھی کلمات اور الفاظ کا حجاب بھی نہیں ہوتا، صرف معانی وحی ہوتے ہیں۔
قارئین کرام اس کتاب کے صفحات میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہم اس موضوع کو وسعت دے سکیں اس
لئے ہم ضروری نکات کی طرف آیتوں کا حوالہ دیکر گفتگو کو مختصر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

وحی کے معنی

لغت کے مطابق کسی بات کو تیزی کے ساتھ اور اشاروں میں سمجھانے کو ”وحی“ کہتے ہیں۔
راغب اصفہانی نے وحی کے معنی رمز گوئی و راسی طرح طبری نے بھی وحی کے لفظی معنی دلوں میں خستور
بیان کئے ہیں قرآن کریم میں بھی مختلف اقسام وحی کا ذکر آیا ہے چنانچہ لغت اور قرآن کریم میں وحی
کے وسیع معنی ملنے کی وجہ سے مفاد پرستوں کو نبوت کی غلط تفسیر کرنے کا موقع ملا، قرآن کریم میں درج
ذیل وجہوں کا ذکر آیا ہے۔

۱۔ وحی پہ جماد: سورہ فصالت آیت ۱۲ میں آسمان کو وحی کرنے کا ذکر ہے:

﴿وَاَوْحٰى فِى كُلِّ سَمَاءٍ اَمْرًا﴾ ”اور ہر آسمان میں اس کا حکم پہنچا دیا“

۲۔ شہد کی مکھی کو وحی:

﴿وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّملِ﴾ ”اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی پر وحی کی“ (نمل/۶۸)

۳۔ عادی انسان پر وحی: سورہ قصص آیت ۷ میں مادر موسیٰ اور سورہ آل عمران ۴۵ میں جناب مریم پر وحی کا ذکر ہے:

﴿وَاَوْحٰى اِلٰى امِّ مُوسٰى﴾ ”اور ہم نے مادر موسیٰ پر وحی بھیجی“ اذْقَالَتِ الْمَلَكَةَ

يَمْرُؤِمَ اِنَّ اللّٰهَ يَشْرِكُ بِكَلِمَةٍ﴾ ”جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! اللہ تجھے اپنی

طرف سے ایک کلمے کی بشارت دیتا ہے“ (آل عمران/۴۲)

۴۔ نبی پر وحی: سورہ شوریٰ آیت ۵۲ میں اس کا ذکر موجود ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحٰى اِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ ”اور اسی طرح ہم نے اپنے امر میں سے

ایک روح آپ کی طرف وحی کی ہے“ (بقرہ/۱۹۷) (بقرہ/۱۷۷)

یہی وہ وحی ہے جس سے خداوند عالم نے انسانوں کی ہدایت اور رہبری کیلئے بعض منتخب بندوں کو نوازا ہے۔ یہ وحی دیگر وحیوں سے مختلف ہے۔

وحی نبی کا سبب امتیاز

جن لوگوں کا خیال ہے کہ منصب نبوت اور رسالت صلاحیتوں، کوششوں اور ریاضتوں کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، یہ فکر سو فیصد غلط اور بے بنیاد ہے تاریخ ہمیں کسی ایک نبی کا بھی پتہ نہیں دیتی جسے اس طریقہ سے یہ منصب حاصل ہوا ہو، اس کے برعکس جیسا کہ بیان ہوا خداوند عالم نے اس منصب کیلئے ہمیشہ ”امی“ کا انتخاب فرمایا ہے کسی بھی نبی کی تعلیم اور تربیت حاصل کرنے کا تاریخ میں کہیں بھی ذکر نہیں ملتا، بلکہ بعض کو تو تعلیم و تربیت کے مواقع ہی میسر نہیں آئے۔ جناب موسیٰ کی مثال لے لیجئے جنھوں نے پہلے شکم مادر میں پرورش پائی، پھر دریائے نیل کے موجوں میں اور پھر طاغوت

کے گھرانے میں، اسی طرح بشر اول آدم صغی اللہ کو منصب نبوت عطا کرنا، عیسیٰ کا گہوارے میں بات کرنا، نبی خاتم کو یہ کہہ کر یہ اُمی ہیں، پڑھ لکھ نہیں سکتے، سید الانبیاء منتخب کرنا، یہ سب واقعات اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ یہ منصب صلاحیتوں، کوششوں اور ریاضتوں سے حاصل ہونے والا نہیں ہے بلکہ زمان و مکان اور خلایق کی ضرورت کے پیش نظر خداوند عالم انہی انسانوں میں سے بعض کو اس کیلئے منتخب فرماتا ہے اور جب انتخاب کر لیتا ہے، تو ان پر وحی نازل کرتا ہے۔

چنانچہ قرآن کریم کے مطابق انبیاء نے نبوت مسترد کرنے والوں کو یہی جواب دیا کہ ”ہاں واقعا ہم بھی تم جیسے بشر ہیں لیکن ہم میں اور تم میں فصل ”وحی“ ہے۔

﴿قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ إِنَّمَا إِلَهُكُمُ اللَّهُ وَاحِدٌ﴾ ”آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک بشر ہوں مگر میری طرف وحی آتی ہے کہ تمہارا خدا ایک اکیلا ہے“ (کہف/۱۱۰)

غرض نبی کا دوسرے انسانوں سے امتیاز یا بقول فلاسفہ، فصل نبی ”وحی“ ہے۔ کسی انسان کو نبوت کے لئے انتخاب، وحی کے ذریعہ ہوتا ہے اور اس نبی کی دعوت کا آغاز دعوائے نزول وحی سے ہوتا ہے جو ایک غیب کی خبر ہوتی ہے، گویا دعوائے نبوت کا آغاز دعوائے علم غیب سے ہوتا ہے اگر انبیاء سے علم غیب چھین لیا جائے تو وہ بھی عام انسانوں کی صف میں نظر آئیں گے۔

عصمت انبیاء

خدا اپنے بندوں کی ہدایت اور رہبری کیلئے خود انہیں میں سے بعض کو منتخب کر کے مبعوث فرماتا ہے آیات قرآنی اور روایات میں ان ہستیوں کو نبی، رسول اور امام کہا گیا ہے خداوند عالم نے ان ہستیوں کی اطاعت کو اپنی اطاعت سے مربوط کیا ہے یعنی جو انکی اطاعت کرتے ہیں گویا وہ خدا کی اطاعت کرتے ہیں ان ہستیوں کو واجب الاطاعت قرار دینے کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ انھیں ہر قسم کی غلطیوں، جنتیوں اور آلودگیوں سے پاک و منزہ رکھا جائے اور انکی ضمانت بھی خداوند متعال کی

طرف سے ملتی چاہئے، بس اسی کو عصمت کہتے ہیں، یہی عصمت کی حقیقت ہے اور خداوند عالم کی جانب سے دی گئی یہی ضمانت امت کے لئے اس کے نمائندوں پر اعتماد کا سبب بنتی ہے۔

عصمت، لغت عرب اور قواعد میں قرآنی میں

مادۃ عصمت: ع، ص، م، (عصم) سے لیا گیا ہے اور اس کے معنی جیسا کہ راغب اصفہانی نے لکھا ہے: ”امساک“ ہیں عصمت بمعنی ”امساک“ ہے۔ کتاب صحاح میں عصمت کے معنی ”منع“ کے بیان کئے گئے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے ”عصمت الطعام“ یعنی کھانے سے روکنا۔

عصمت آیات قرآنی میں

قرآن مجید میں یہ لفظ بچانے کے معنوں میں آیا ہے:

سورۃ مبارکہ مائدہ آیت ۶۷ میں ارشاد ہوتا ہے:

۱۔ ﴿قَالَ سَاوِيَ السَّيِّئَ جَبَلٍ بِعَصْمِي مِنَ الْمَاءِ﴾ ”کہا: میں کسی پہاڑ کا سہارا پکڑتا ہوں جو مجھے پانی سے بچائے گا“ (سورۃ/۳۳)

۲۔ ﴿مَالِمَ لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ﴾

”ان کو خدا سے بچانے والا کوئی بھی نہیں ہوگا“ (یونس/۲۷)

۳۔ ﴿قُلْ مَنْ ذَا الَّذِي يَعْصِمُكُم مِّنَ اللَّهِ إِنْ أَرَادَ بِكُمْ سَوْءًا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً﴾

”ان سے کہہ دو اگر خدا تمہارے ساتھ برائی کا ارادہ کر بیٹھے تو کون ایسا ہے جو تمہیں اس سے بچائے یا بھلائی ہی کرنا چاہے“ (احزاب/۱۷)

۴۔ ﴿وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ ”اللہ تمہیں لوگوں سے بچائے گا“ (مائدہ/)

آیت اللہ تقی مصباح یزدی عصمت کے معنی بیان کرتے ہوئے دو نکتے بیان فرماتے ہیں:

۱۔ نگاہداشتن یعنی محفوظ رکھنا

۲۔ مانع شدن یعنی مانع ہونا

عصمت کے اصطلاحی معنی

اصطلاح میں عصمت اس ملکہ نفسانی کو کہتے ہیں جس کا حامل انسان خطا اور اشتباہ سے باز رہتا ہے۔ ایسے افراد کو معصوم کہتے ہیں، یعنی خدا نے انہیں خطا اور گناہ سے محفوظ رکھا ہے چنانچہ عصمت کے معنی خطا اور گناہ سے محفوظ ہونا ہے اب یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ معصوم کو خطا اور گناہ سے خدا نے محفوظ رکھا ہے یا اس ملکہ عصمت نے؟ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں باتوں میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ ملکہ نفسانی بھی خدا ہی کی طرف سے عنایت شدہ ہے۔

تعریف عصمت ابن ابی الحدید معتزلی کی نظر میں

ابن ابی الحدید معتزلی نے نبیؐ اہل امان کی شرح میں عصمت کی تعریف مختلف زاویوں سے کی ہے:

۱۔ عصمت ایک ایسی صفت یا خاصیت ہے کہ جس انسان میں بھی پائی جائے، اسے گناہ سے محفوظ رکھتی ہے۔

۲۔ معصوم وہ ہے جو معصیت پر قدرت رکھتا ہے، لیکن اس کا مرتکب نہیں ہوتا۔

۳۔ معصوم اطاعت اور معصیت دونوں پر قدرت رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود نہ وہ ترک اطاعت کرتا ہے نہ فعل معصیت کا مرتکب ہوتا ہے، عصمت کی سند کیا ہے یعنی اس کے عوامل اور علل کی برگشت کہاں پر ہوتی ہے۔

یہ صفت کسی انسان میں کیسے اور کیونکر پیدا ہوتی ہے، اس بارے میں چار اقوال ہیں:

۱۔ قوی الارادہ ہونا: مضبوط قوت ارادہ انسان کو شہوت اور خواہشات نفسانی کی پیروی سے دور رکھتا ہے، قوی الارادہ انسان شہوت کے غلبہ میں نہیں آتا بلکہ اس پر غلبہ پاتا ہے اس قوت ارادہ کو علمائے نفس نے ”ملکہ“ کہا ہے اسی ملکہ کی بنا پر انسان افعال قبیح سے باز رہتا ہے اور اطاعت پر گامزن رہتا ہے۔

۲۔ حامل علم ہونا: چونکہ معصوم انسان اطاعت کے بے بہا اور بے شمار فوائد اور معصیت کے مضرات اور نقصانات سے آگاہ ہوتا ہے، اس لئے وہ ترک اطاعت اور فعل معصیت نہیں کرتا۔

۳۔ نفس کا محاسبہ کرنا: معصوم انسان اپنی خطاؤں اور غلطیوں پر، اپنے نفس کی سرگرمیوں کا ہمیشہ محاسبہ کرتا ہے اگر ہو ورنہ اس سے سرزد ہو جائے تو اپنے آپ کو سرزنش کرتا ہے۔

۴۔ خدا کے واضح بیان کا حامل ہونا: معصوم انسان خدا کی طرف سے واضح اور روشن بیان حامل ہوتا ہے اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیزیں حرام ہیں کون کون سے اعمال فعل اطاعت ہیں۔

اگر انسان میں یہ چار صفات ہوں تو وہ معصوم از گناہ ہو جاتا ہے گویا یہ چار باتیں عصمت کے مقدمے ہیں یا یوں کہے کہ عصمت ان چار چیزوں پر قائم ہے۔

عصمت کی ایک تفسیر کی برکت یہ ہے کہ معصوم انسان کسی فعل کے نفع اور نقصان کے بارے میں حق الیقین کے درجہ پر فائز ہوتا ہے ایک ایسے انسان سے معصیت کا ارتکاب ممکن ہی نہیں، وہ کبھی بھی ضرر رساں عمل بجالانے کا انتخاب کر ہی نہیں سکتا، کسی فعل کے ضرر کا حق الیقین ہونے کے بعد بھلا کوئی عاقل انسان کیسے اس کا مرتکب ہو سکتا ہے؟ اسکی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً کوئی عاقل انسان زہر کو زہر جان کر غلطی یا اشتباہ سے بھی نہیں کھاتا، بلند عمارت کی چھت سے خود کو نیچے نہیں گراتا، کبھی بھول کر بھی گٹر کا پانی نہیں پیتا، وغیرہ وغیرہ، یہ مثالیں مفروضہ عصمت کو عقلی طور پر ممکن ثابت کرنے کیلئے پیش کی گئی ہیں۔

عصمت انبیاء کی ضرورت

انبیاء کرام کو خداوند متعال نے اپنے بندوں کی ہدایت اور رہبری کیلئے بھیجا ہے جب کسی ہستی کو خداوند عالم اپنی طرف سے بندوں کی ہدایت و رہبری کے لئے بھیجے تو یقیناً وہ چاہے گا کہ اس کے بندے اس کے نمائندے کی اطاعت کریں، تمام نشیب و فراز میں اس کی پیروی کریں اور اسکے قول و

فعل کو دل و جان سے قبول کریں یہ اسی صورت میں ممکن ہے، جب بندوں کو یہ یقین ہو جائے کہ یہ مدعی نبوت جو کچھ کہتا ہے خالص وحی ہے اس کے قول و فعل میں کسی قسم کی غلطی، غلطی، نسیان، بھول یا ذاتی اناپرتی کا شائبہ بھی نہیں ہے بلکہ وہ ان خرافات سے لاتعلق اور دور ہے یہ یقین حاصل ہو جانے کے بعد ہی بندگانِ خدا اس کی اطاعت کو عین اطاعتِ خدا گردانتے ہیں اور پھر اس کے قول پر یقین کرتے ہیں کہ وہ خالصتاً وحی پر مبنی ہے لہذا نبی کے قول و فعل میں تضاد نہیں ہونا چاہئے، اس کے افعال اور کردار کو وحی کا آئینہ دار ہونا چاہئے یعنی اگر کبھی وہ کچھ نہ بولے اور کوئی عمل نہ کرے تب بھی یقین ہو کہ اس کا یہ فعل وحی کے مطابق ہے نبی کو ایسی ہی عصمت پر فائز ہونا چاہئے، اس سلسلے میں علمائے اعتقاد نے چند دلائل قائم کئے ہیں۔

عصمتِ انبیاء کی دلیل

۱۔ دلیل اعتماد

اگر انبیاء معصوم نہ ہوں، عام انسانوں کی طرح طرح جھوٹ اور گناہوں کا ارتکاب کرتے ہوں، تو یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ جو حکم انہوں نے دیا ہے، کہیں غلط نہ ہو یا بھول کر نہ کہہ دیا ہو۔ علاوہ ازیں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وحی کو پہنچانے میں سستی سے کام لیا ہو، وقت گزر گیا ہو، مگر پہنچایا نہ ہو، ایسے تمام احتمالات نبی کی شان کے خلاف ہیں اور ایسی صورت میں عقلی طور پر اس پر سے اعتماد اٹھ جائے گا اگر نبی گناہ کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ فاسق ہو گیا جب نبی ہی فاسق ہوگا تو اس کی خبر پر اعتماد بھی نہیں رہے گا اس خبر کو لینے کیلئے تحقیق کی ضرورت ہوگی جبکہ نبی کے مشکوک ہو جانے کے بعد تحقیق کے ذرائع نہیں رہتے، لوگ کیسے معلوم کریں گے کہ اس نبی نے جو بات کہی ہے وہ سچ ہے یا جھوٹ، ایسے حالات میں انسان کیسے خدا سے رابطہ قائم کرے گا؟ چنانچہ ایسی صورت میں نبوت مشکوک ہو جائے گی اور جب نبوت میں شک ہوگا تو فلسفہ نبوت ہی لغو قرار پائے گا لہذا ضروری ہے کہ خداوند عالم جس ہستی کو نبی، حجت یا اپنا نمائندہ بنا کر بھیجے، وہ معصوم ہو۔

۲۔ دلیل اخلاق

انسانی معاشرہ میں لوگ ہمیشہ اعلیٰ اور ارفع اخلاق کے حامل افراد کے گرد جمع ہوتے ہیں، ان کے نقل و حرکت اور سیرت روشن کو اپنانا اپنے لئے اعزاز اور افتخار گردانتے ہیں چنانچہ اگر نبی سے گناہ سرزد ہو، اگر نبی اپنے قول و فعل کا خود پابند نہ ہو تو اس کی شخصیت لوگوں کی نظروں میں گر جائے گی بلکہ اس کا شمار امت کے پست ترین لوگوں میں ہوگا کیونکہ نبی کا گناہ عام انسانوں کے گناہ کے مانند نہیں قرار دیا جاسکتا۔ خداوند عالم سورہ احزاب کی آیت ۳۰ میں فرماتا ہے:

﴿يَنْسَاءَ النَّبِيُّ مِنْ يَمَاتٍ مَنْكِنٍ بِفَاحِشَةٍ مَبِينَةٍ يَضَعُفَ لَهَا الْعَذَابُ ضَعْفَيْنِ﴾

”اے پیغمبر کی ازواج اگر تم پرانی کرو گی تو تمہیں اس کی دو گنی سزا دیں گے“

ایک عام شخص کو ایک گناہ پر ایک سزا دی جاتی ہے۔ اگر کسی کو اس سے زیادہ سزا دی جائے تو یہ خلاف عدالت ہوگا مثلاً زانی کیلئے سو (۱۰۰) کوڑوں کی سزا ہے اگر اسے ایک سو پانچ کوڑے مارے جائیں تو یہ زائد پانچ کوڑوں کا لگایا جانا اس پر ظلم ہوگا ایک آدمی کو تو ایک گناہ پر ایک سزا ملے لیکن ازواج نبی میں سے کوئی بی بی اگر ایک گناہ کی مرتکب ہوں تو سزا دو گنی ملے، ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ امت کی ایک فرد ہیں اور دوسری طرف پیغمبر کی ازواج ہیں، اسی لئے ان پر دو گنی سزا کا تاکید حکم ہے تاکہ پیغمبر کی ساحت اور شخصیت دور سے ہی لوگوں کو پاک و منزہ نظر آئے یعنی یہ کہ لوگ پیغمبر کے گرد و نواح کے افراد کو دیکھ کر ان پر اعتماد قائم کریں۔ اگر لوگ پیغمبر کے قرب اور جوار میں رہنے والوں ہی کو آپ کی لائی ہوئی شریعت کی خلاف ورزی کرتا دیکھیں گے تو یہ بات ان کے لئے پیغمبر پر عدم اعتماد کا سبب بنے گی چنانچہ اسی لئے پیغمبر کی ازواج اگر گناہ کا ارتکاب کریں تو انکی سزا دو گنی ہوگی کیونکہ گناہ بھی دو گنا شمار ہوگا ایک تو حکم خدا کو ٹھکرایا اور دوسرے رسول کو اعدا رہنایا۔

جب نبی کے قریبی افراد گناہ کی صورت میں دوسروں کی نسبت زیادہ گناہگار ٹھہرائے جائیں گے تو

خیال فرمائیے کہ اگر خود نبی گناہ کا ارتکاب کرے تو اس کا گناہ کتنا زیادہ شمار ہوگا لہذا ایک گناہگار فرد، خدا کا منتخب نمائندہ ہو، یہ بات خلاف عقل ہے:

﴿انما يريد الله ليذهب عنكم الرجس اهل البيت ويطهركم تطهيرا﴾ ”بس اللہ کا یہ ارادہ ہے کہ اے اہل بیت تم سے ہر برائی کو دور رکھے اور اس طرح پاک و پاکیزہ رکھے جس طرح پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے“ (آب ۳۳) اس آیت میں خدا نے اعلان فرمادیا کہ نبی ہر قسم کی رجس سے پاک و مطہر ہے۔

۳۔ دلیل اطاعت :

اگر نبی مقام عصمت پر فائز نہ ہو اور اس سے غلطی و نسیان سرزد ہونے لگے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ شیطان کی زد میں آ گیا ہے اور جو شخص بھی شیطان کی زد میں آ جائے اسکی اطاعت، شیطان کی اطاعت ہوگی اور جو شیطان کے فریب میں آ جائے، وہ نبی نہیں ہو سکتا چنانچہ سورہ مبارکہ ص آیت ۸۲، ۸۳ میں ہے:

﴿قال فبعزتك لا غويهم اجمعين الا عبادك المخلصين﴾ ”اس نے کہا کہ پھر تیری عزت کی قسم میں سب کو گمراہ کر دوں گا علاوہ تیرے ان بندوں کے جنہیں تو نے خالص بنا لیا ہے“

۳۔ نبی کے قول و فعل میں تضاد ہونا خدا کے نزدیک ایک مذموم فعل ہے کیونکہ قرآن کریم کی متعدد آیات میں ایسے لوگوں کی مذمت کی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

﴿كبر مقتا عند الله ان تقولوا مالا تفعلون﴾ ”اللہ کے نزدیک یہ سخت ناراضگی کا سبب ہے کہ تم وہ کہو جس پر عمل نہیں کرتے ہو“ (صف/۳) ﴿انما سرون الناس بالبروت تسون انفسكم﴾ ”کیا تم لوگوں کو نیکیوں کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو“ (بقرہ/۴۳) ﴿وقال الاعراب امنوا ولم تؤمنوا لکن قولوا اسلمنا ما يدخل الایمان فی

قلوبکم ﴿ ”یہ عرب کے بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں تو آپ کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یہ کہو کہ اسلام لائے کہ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے“ (حجرات/۱۴)

۵۔ خداوند عالم نے قرآن کریم میں اپنے انبیاء کی غیر مشروط اطاعت کا حکم دیا ہے اور اس کو واجب قرار دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

﴿واطيعوا الله والرسول لعلکم ترحمون﴾ ”اور اللہ و رسول کی اطاعت کرو کہ شاید رحم کے قابل ہو جاؤ“ (آل عمران/۱۳۲) ”کہہ دیجئے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ جو اس سے روگردانی کرے گا تو خدا کافرین کو ہرگز دوست نہیں رکھتا“ (آل عمران/۳۲)

﴿قل اطيعوا الله والرسول فان تولوا فإن الله لا يحب الکافرين﴾ ”مسلمانو تم لوگوں کیلئے رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ عمل ہے“ (آل عمران/۳۱)

۶۔ اگر نبی کی اطاعت اس بات کے ساتھ مشروط سمجھی جائے کہ نبی کے صحیح اوامر اور نواہی کی اطاعت کی جائی اور جس وقت وہ غلط اوامر اور نواہی کا حکم دے تو اس کی مخالفت کی جائے جیسا کہ علماء کے بارے میں حکم ہے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ”براہمہ“ جو کہ عدم بعثت نبی کے قائل ہیں، انکی دلیل عدم ضرورت بعثت انبیاء کی تائید ہوگی۔ کیونکہ اگر امت نہیں جانتی (صحیح اور غلط اوامر) تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ امت کو جہالت میں ایک ایسے انسان کے سپرد کر دیا جائے جو خود غلطی سے محفوظ نہیں اور اگر امت جانتی ہے تو اس صورت میں امت نبی کے محتاج نہیں ہے۔ نبوت کی ضرورت تو امت کی جہل و نادانی کی وجہ سے ہوتی ہے اگر امت حلال و حرام، اطاعت اور محصیت کو خود جانتی ہوتی تو اس صورت میں نبی کی ضرورت ہی ختم ہو جاتی۔

۷۔ اگر نبی گناہ کرتا ہے تو کیا امت پر واجب ہے کہ اسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے، یا نہیں؟ اگر نہیں کرتے تو یہ نبی اس سلسلہ کو جاری رکھے گا کیونکہ کوئی اس کو روکنے ٹوکنے والا نہیں اور روکتے ہیں تو اس میں درج ذیل قباحتیں ہیں:

۱۔ امت کے روک ٹوک کرنے سے اسے اذیت ہوگی اور جس شخص کی طرف سے اسے اذیت پہونچے گی وہ مستحق عذاب خدا ہوگا۔ کیونکہ جو خدا اور رسول خدا کو اذیت پہنچاتا ہے اس پر خدا کی لعنت ہے اور اسکے لئے دردناک عذاب ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَفُودُونَ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا

مہینا﴾

”جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ نے لعنت کی ہے اور اس نے ان کے لئے ذلت آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے“ (احزاب/ ۵۷)

لہذا جو شخص نبی کو روک ٹوک کرتا ہے اس پر لعنت ہوگی۔ دوسری طرف اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا نہیں کرتا تو ترک واجب کا مرتکب ہوتا ہے۔

۲۔ نبی جب گناہ کرے گا تو اس کی حیثیت گر جائے گی۔ لوگ اسے نفرت کی نظر سے دیکھیں گے اور جب لوگ اس سے نفرت کرنے لگیں تو فلسفہ بعثت انبیاء خود بخود ختم ہو جائے گا۔

۳۔ اگر نبی گناہ کا ارتکاب کرے گا تو وہ ظالم ہوگا جبکہ خداوند عالم سورہ بقرہ آیت ۱۲۳ میں فرماتا ہے:

﴿لَا يَمُنُّ إِلَّا بِعَهْدِهِ الظَّالِمِينَ﴾ ”خدا یہ عہدہ ظالمین کو نہیں دیتا ہے“

۸۔ اگر لوگ نبی کو گناہ اور آلودگیوں سے مس ہوتے ہوئے دیکھیں گے تو اس صورت میں نبی کی کشش ختم ہو جائے گی۔ اس لئے بھی نبی کو ہر قسم کے گناہ و خطا سے پاک و مبرا اور معصوم ہونا چاہئے۔

۹۔ ہم لوگ نبی کے محتاج ہیں کیوں کہ ہم راہ خیر و شر کو یا تو جانتے ہی نہیں اور اس معاملہ میں جاہل ہیں، یا جانتے تو ہیں مگر غفلت، سستی، بھول اور نسیان کے سبب اسے انجام نہیں دیتے، اس دوسری صورت میں ایک یاد دہانی کرنے والا یعنی مذکر چاہئے، لیکن جب نبی بذات خود گناہ کا مرتکب ہوگا تو وہ خود ایک ہادی اور رہبر کا محتاج ہوگا ایسی صورت میں اس کی حیثیت عام انسانوں کے برابری ہو جائے گی سورہ یونس آیت ۳۵ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَلْهَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ قُلِ اللَّهُ يَهْدِي لِلْحَقِّ، أَفَمَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ أَمَّنْ لَا يَهْدِي إِلَّا أَنْ يَهْدِي فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ﴾ ”ان سے پوچھ تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہو؟ کہو وہ صرف اللہ ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے، پھر بھلا بتاؤ جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے، وہ اسکا زیادہ مستحق ہے کہ اسکی پیروی کی جائے یا وہ جو خود راہ نہیں پاتا، الا یہ کہ اسکی راہنمائی کی جائے آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے، کیسے الٹے الٹے فیصلے کرتے ہو“

انسانی حرکات اور سکناات کی اقسام:

۱۔ ایک ایسا عمل جو وہ خود انجام دیتا ہے اور تمام انسان اسے انجام دیتے ہیں، یہ ایک عادی عمل ہے۔ اس میں نہ جائے سوال و پرستش ہے نہ تنقید۔

۲۔ دوسرا عمل غیر عادی ہے یعنی غیب سے خبر دینا یہ دو حالتوں سے خالی نہیں ہے:

۲۔۱۔ شیطان خبر دیتا ہے یہ شیطان کا القا ہے جیسے کاہن وغیرہ، جیسا کہ سورہ انعام آیت ۱۲۱ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِنَّ الشَّيْطَانَ لِيُؤْخِرَ إِلَى أُولَئِهِمْ لِيُحَادِلُوهُمْ﴾ ”اور شیاطین تو اپنے والوں کی طرف خفیہ اشارے کرتے ہیں تاکہ یہ لوگ تم سے جھگڑا کریں“

۲-۲ خدا خبر دیتا ہے۔ یہ خبر نبی کے ذریعہ بندوں تک پہنچتی ہے اسے وحی کہتے ہیں۔

قرآن کریم کی متعدد آیات میں آیا ہے کہ شیاطین ایک دوسرے کو وحی کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیے:

﴿وَالشَّيَاطِينُ لَبِؤْهُنَ الْاُولٰٓئِهٖمْ لِيَحٰدِلُوْهُمْ﴾ ”شیاطین اپنے ساتھیوں کے

دلوں میں شکوک و اعتراضات القا کرتے ہیں“ (انعام/۱۲۱)

شیطانی اعمال کیا ہیں۔ خداوند کریم میں نے متعدد آیات قرآن کریم اس کا بالکل واضح اعلان فرمایا ہے:

۱۔ شیطان ہمیشہ برائی کا حکم دیتا ہے:

﴿الشَّيْطٰنُ يَعْزِزُ الْفَقْرَ وَبَاغِزُ الْفَحْشَآءِ﴾ ”شیطان تمہیں تنگدستی کا خوف

دلاتا ہے اور بے حیائی کی ترغیب دیتا ہے“ (بقرہ/۲۶۸)

۲۔ شیطان خدا کے اولیاء کو ڈراتا ہے:

﴿الَّذِي يَتَخِطُّهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ﴾ ”جس کو شیطان نے چھو کر حواس باختہ کیا ہو

“ (بقرہ/۲۵۵) ﴿اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ فَلَا تَخَافُوْا اِنْ كُنْتُمْ

مُؤْمِنِيْنَ﴾ ”یہ (خبر دینے والا) شیطان جو اپنے دوستوں کو ڈراتا ہے لہذا اگر تم مومن

ہو تو ان لوگوں سے نہیں مجھ سے ڈرو“ (آل عمران/۱۷۵)

۳۔ جس کے ساتھی برے ہوں، سمجھو وہ شیطان کا ساتھی ہے:

﴿وَمَنْ يَكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهُ قَرْنًا فَسَاءَ قَرْنًا﴾ ”بات یہ ہے کہ شیطان جس کا رفیق ہو

جائے تو وہ بہت ہی برا رفیق ہے“ (نساء/۳۸)

۴۔ شیطان انسان کو مغرور کرتا (دھوکا دیتا) ہے:

﴿وَمَا يَعْزِمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا﴾ ”اور ان کے ساتھ شیطان کے وعدے بس

فریب پر مبنی ہوتے ہیں“ (نساء/۱۲۰)

۵۔ شراب، جوا، بت پرستی سب اعمال شیطانی ہیں:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ﴾ ”اے ایمان والو! شراب اور جوا اور مقدس تھان اور پانے سب ناپاک شیطانی عمل ہیں“ (مائدہ/۹۰)

۶۔ جس پر شیطان کا غلبہ ہو جائے اسے اپنے اعمال اچھے نظر آتے ہیں:

﴿وَإِذْ زَيْنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمْ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي جَارٌ لَكُمْ﴾ ”اور جب شیطان نے ان کے اعمال آراستہ کر کے انھیں دکھائے اور کہا: آج لوگوں میں سے کوئی تم پر فتح حاصل کر ہی نہیں سکتا“ (انفال/۴۸)

۷۔ شیطان انسان کا دشمن ہے:

﴿إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوٌّ مُبِينٌ﴾ ”کیونکہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے“ (یوسف/۵)

۸۔ شیطان، انسان کو خدا سے دور کر کے انسانوں پر بھروسہ کرواتا ہے:

﴿فَإِنَّ الشَّيْطَانَ ذَكَرَ رَبَّهُ فَلْيُثِّ السَّحْنُ بَضْعَ سَنِينَ﴾ ”مگر شیطان نے اسے بھلا دیا کہ وہ اپنے مالک سے یوسف کا ذکر کرے یوں یوسف کئی سال زندان میں پڑے رہے“ (یوسف/۳۲)

خلاصہ یہ کہ اگر نبی سے گناہ سرزد ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ شیطان کے فریب میں آ گیا ہے اور جو شیطان کے فریب میں آ جائے وہ نبی نہیں ہو سکتا۔

عصمت انبیاء کے بارے میں فرق اسلامی کے نظریات:

- ۱۔ انبیاء ابتدائی عمر سے لے کر آخری لمحہ حیات تک، فکری اعتبار سے، عملی اعتبار سے، صغیرہ اور د کبیرہ گناہوں کے سبب یا عمدہ ارتکاب سے، غرض ہر لحاظ سے معصوم ہیں۔
- ۲۔ ایک عقیدہ یہ ہے کہ انبیاء بعثت کے بعد سے آخری عمر تک تو تمام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کے

سہوایاً عمدا ارتکاب سے محفوظ ہیں، لیکن بعثت سے پہلے ارتکاب گناہ خارج از امکان نہیں۔ یہ عقیدہ ”حشیوہ“ کہلاتا ہے اور ایک تحقیر آمیز عقیدہ ہے بعض علمائے اسلام اس عقیدہ کے بارے میں سہل انگاری سے کام لیتے ہیں اور بے بنیاد اور غیر مستند باتوں کو عقیدہ کی سند بناتے ہیں۔ یہ عقیدہ اسکی ایک مثال ہے۔

۳۔ خوارج عقیدہ رکھتے تھے ہیں کہ انبیاء سے گناہ کا سرزد ہونا ممکن ہے حالانکہ خود ان کے نزدیک ہر گناہ موجب کفر ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کا نبی کافر ہو سکتا ہے۔

۴۔ اشاعرہ کہتے ہیں کہ انبیاء سے گناہ کبیرہ سرزد نہیں ہو سکتا تاہم گناہ صغیرہ کا ارتکاب ممکن ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۵۔ گروه اہل حدیث کا بانی عبدالوہاب کہتا ہے کہ انبیاء کا قبل بعثت معصوم ہونا ضروری نہیں، البتہ بعد بعثت معصوم ہونا ضروری ہے۔

۶۔ ایک گروه کا کہنا ہے کہ انبیاء سے قصد ایما عمد گناہ سرزد نہیں ہو سکتا تاہم سہوایاً نسیان کے سبب گناہ ہو سکتا ہے۔

۷۔ ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ یوں تو انبیاء گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے لیکن پوشیدہ طور پر اور لوگوں سے چھپا کر گناہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

۸۔ ایک اور گروه ہے جس کا عقیدہ ہے کہ انبیاء کے لئے عصمت ضروری نہیں، وہ ہر حال میں گناہ کر سکتے ہیں۔

۹۔ انبیاء کو تمام گناہوں سے چاہے وہ کبیرہ ہوں، یا صغیرہ، جو انکی حیثیت کو معاشرہ میں مخدوش کرتے ہوں، بعثت سے پہلے بھی اور بعثت کے بعد بھی، پیدائش سے لیکر وفات تک ہمیشہ ان سے پاک اور معصوم ہونا چاہئے، یہی عقیدہ شیعہ امامیہ ہے۔

عصمتِ انبیاء

موضوع عصمتِ انبیاء صدر اسلام کے دور کے مسلمانوں کا موضوع بحث اور گفتگو نہیں تھا۔ یہ موضوع بعد کے دور کے رونما ہونے والے حالات اور اسلامی ریاست پر قابض حکام کے ذاتی مفادات کی خاطر اور دین کے بنیادی عقائد کو مشکوک بنانے کی مذموم کاوش کے نتیجہ میں مورد بحث و مجادلہ قرار پائی ہے۔ کسی ایک فرد، گروہ یا مملکت کے کسی دوسرے فرد، گروہ یا ملک پر اعتماد بھروسہ کرنے کیلئے جو ضمانتیں متصور ہیں درج ذیل میں بیان کریں گے:

۱۔ رہبر پر اعتماد کی ضمانت:

پورا انسانی معاشرہ خواہ وہ کسی رنگ اور نسل سے تعلق رکھتا ہو، دنیا کے کسی خطے میں بسا ہو، ملحد ہو یا دین اور مذہب کا پیرو ہو، علاقائی سطح پر انسانوں کا چھوٹا سا گروہ ہو یا ملکی اور بین الاقوامی سطح کی کوئی تنظیم، معاشرے کی بھلائی کیلئے کام کرنے والے لوگ ہوں یا دہشت اور وحشت پھیلانے اور لوٹ مار مچانے والے، اپنے آپ کو منظم رکھنے کیلئے سب کو ایک نظام اور ایک منتظم اور رہبر کی ضرورت ہوتی ہے، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی کو بھی انکار نہیں۔ کسی رہبر اور نظام کو لوگ اس وقت تک اپنے مقدرات پر نہیں کرتے جب تک ذاتی طور پر اس پر اعتماد کی ضمانت نہ فراہم کی جائے، انسان کی نجی زندگی میں بھی ایسے مواقع کم ہوتے ہیں کہ بغیر ضمانت کے کوئی چیز کسی کے سپرد کر دی جائے سوائے ان چند نادر موقعوں کے کہ جہاں ایک شخص دوسرے پر اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر حد سے زیادہ اعتماد کرتا ہو۔

۲۔ حلفیہ ضمانت: سیکولر معاشرہ میں زندگی کے تمام مسائل چاہے وہ اجتماعی ہوں یا سیاسی اور اقتصادی سب میں دین مذہب کو بے دخل رکھا جاتا ہے انفرادی زندگی میں یہ لوگ چاہے دین اور مذہب کے انتہا پسندی کی حد تک ہی پابند کیوں نہ ہوتے ہوں، لیکن امور دنیوی کو دین سے بالکل لا

تعلق رکھتے ہیں ایسا معاشرہ ملحد اور بے دین ہو یا دین مذہب کا پیرو، دین کو معاشرہ میں بے دخل اور بے کردار رکھتا ہے۔ ہر معاشرہ میں لوگ اپنے مقدرات کو کسی فرد یا کونسل کے سپرد کرنے سے پہلے اپنے اعتماد کا تحفظ چاہتے ہیں۔ ان تحفظات کو عام رائج اردو زبان میں ضمانت کہتے ہیں، اس ضمانت کو حاصل کرنے کے لئے ایک طریقہ یہ رائج ہے کہ ایک حلفیہ بیان ترتیب دیا جاتا ہے جسے مذکورہ شخص اجتماع میں کھڑے ہو کر سب کے سامنے دہراتا ہے، بعد میں اس بیان پر اس سے امضاء لیا جاتا ہے اس طرح سے وہ یہ عہد کرتا ہے کہ وہ اس تنظیم کے آئین اور دستور کی پابندی اور پاسداری کرے گا، اپنے منصب سے متعلق ذمہ داریوں کو پورا کرے گا، اس سلسلہ میں کسی قسم کی سستی، کاہلی اور خیانت نہیں کرے گا اور اسرار کو غیروں پر فاش نہیں کرے گا بس اس مسودہ کو پڑھ کر سنانے اور اس پر دستخط لینے ہی کو ضمانت سمجھا جاتا ہے، اس کے بعد چاہے وہ اس آئین کی موجودگی میں کتنا ہی خرد برد کرے، آئین سے کتنی ہی بے وفائی برتے، اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تمام تر کج روی کے باوجود وہ کسی صورت میں بھی کرسی کو نہیں چھوڑتا، اگر غلطی ثابت ہونے کے بعد اسے ہٹا دیا جائے تو وہ دوبارہ بھی برسر اقتدار آ سکتا ہے اور پھر نئے سرے سے حلف برداری کے ذریعہ ضمانت دے سکتا ہے، یہ طریقہ کار ہر چھوٹی بڑی سطح پر ایک سنت بنی ہوئی ہے۔ اس قسم کی ضمانت کے نمونے تاریخ اسلام کے صفحات پر بھی ملتے ہیں جن میں سے دو واقعات بطور نمونہ پیش خدمت ہیں۔

پہلا واقعہ اس وقت نمودار ہوا جب حضرت عمر بن خطاب کی نامزد کردہ چھ رکنی کمیٹی نے امیدواروں سے ان شرائط پر پابند رہنے کا عہد لیا، حضرت عثمان نے چھ رکنی کمیٹی کے سامنے بیان دیا کہ اگر انہیں خلیفہ منتخب کر لیا گیا تو وہ کتاب خدا، سنت رسول اور سیرت شیخین پر عمل کے پابند رہیں گے لیکن برسر اقتدار آنے کے فوراً بعد انہوں نے بیت المال، مسلمین کی جان و مال اور عزت و ناموس کو مروان بن حکم کے سپرد کر دیا، مروان بن حکم وہ شخص ہے جسے رسول اکرمؐ نے اسکی سابقہ اسلام دشمنی اور پیغمبرؐ کے حق میں جسارت آمیز حرکتوں کی وجہ سے مدینہ بدر کر دیا تھا، خلیفہ اول اور دوم نے

حضرت عثمان سمیت اکابر بنو امیہ کی سفارش کے باوجود حکم رسول اللہ کے احترام کو باقی رکھا اور اسے واپس مدینہ آنے کی اجازت نہیں دی، مگر حضرت عثمان نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد نہ صرف یہ کہ اس کو واپس مدینہ بلا لیا بلکہ مسلمانوں کے تمام مقدرات اس کے سپرد کر دیئے، اس طرح انہوں نے کتاب خدا، سنت رسول اور سیرتِ شیعین سب ہی کو پس پشت ڈالا اور مروان کو مقدم رکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علامۃ المسلمین میں رفتہ رفتہ اشتعال پھیل گیا بہت کوشش کی گئی کہ خلیفہ وقت اسے معذول کریں لیکن حضرت عثمان نے اس سلسلے میں کسی کی بات پر دھیان نہ دیا آخر کار اس کو بچانے کی کوشش میں خود کو ہی قربان کر دیا۔

اسکے باوجود آج کل کے مقابلہ میں وہ دور پھر بھی بہتر تھا کیونکہ اس دور میں خلفاء اور ان کے ارد گرد جمع ہونے والے حاشیہ برداروں پر مسلمان کڑی نظر رکھتے تھے، اس وقت کی امت، حاکم و حکمران طبقہ پر شاہد تھی، جبکہ آجکل یہ صفات مسلمانوں میں مردہ ہو چکی ہیں جس کے نتیجے میں ہم دیکھتے ہیں دینی و مذہبی قائدین ہوں یا سیاسی رہنما، ان کے اطراف جمع ہونے والے افراد دونوں ہاتھوں سے قوم کو لوٹ رہے ہیں لہذا وہ یہ نعرہ بلند کرتے ہیں، ”انصاف یہ ہے ان کو موقع دی جائے، مدت پوری کرنے دیا جائے لوٹنے والوں کو دوبارہ موقع دیا جائے“ لیکن اس کے باوجود انکے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائی جاتی بلکہ بعض بقول امام خمینیؑ مختلف بہانے بنا کر مفت میں ان کا دفاع کرتے ہیں۔

اس سلسلہ کی دوسری مثال معاویہ ابن ابی سفیان کی ہے معاویہ نے سنہ ۴۱ ہجری میں پیغمبر اکرمؐ کے سبط اکبر حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہونے والی نبرد آزمائی میں مختلف جیلوں اور بہانوں سے امام حسن علیہ السلام کو صلح کی دعوت دی اور صلح کی تمام شرائط پر اپنی آمادگی کا وعدہ کیا اس نے امام حسن کی خدمت میں حلیفہ بیان پیش کیا کہ امام حسن خلافت اسکے سپرد کرنے کے عوض جو شرائط بھی لکھیں گے وہ سب اسے قبول ہوں گی۔ امام حسنؑ نے اس صلح نامہ پر شرائط درج کر کے

امضاء کیا، لیکن جب معاویہ کی طور پر مسند خلافت پر قابض ہو گیا تو اس نے اعلان کیا ”یہ صلح نامہ میرے پاؤں کے نیچے ہے میں اسکا پابند نہیں ہوں“

آج بھی بیشتر دینی اور سیاسی حلقوں میں یہی صورت حال نظر آتی ہے اگرچہ پہلی بار برسرِ اقتدار آنا ذرا مشکل ہوتا ہے، لیکن ایک مرتبہ آ جانے کے بعد اپنا قبضہ برقرار رکھنے کیلئے کوئی خاص دشواری نہیں ہوتی، برسرِ اقتدار آنے کیلئے عوام سے جو وعدے وعید کئے جاتے ہیں، کرسی پر بیٹھنے کے بعد، کوئی وعدہ یا دھمکیاں رہتا بلکہ کئے گئے وعدوں کی دھجیاں اڑادی جاتی ہیں۔

۳۔ ملکہ عدالت: اہل دین و مذہب کے نزدیک رہبران قوم میں ملکہ عدالت کا ہونا، عوام کیلئے ان پر اعتماد کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ دنیا میں جہاں جہاں اہل دین و مذہب کا معاشرہ ہے وہاں کے لوگ دین کے علاوہ بہت سے دنیاوی امور زندگی میں بھی اپنی ممکنہ حدود میں رہتے ہوئے نظام شریعت کی پابندی کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور چونکہ ہر زمان و مکان کے رہنے والوں کیلئے ہمیشہ ہر علاقے کے لوگوں کے لئے ہمیشہ رہبر معصوم تک رسائی ممکن نہیں ہوتی، چنانچہ اس مقصد کے لئے وہ خود اپنے درمیان سے ایک عادل عالم فرد کو منتخب کرتے ہیں اور اس کے ملکہ عدالت کی بنیاد پر ہی اس پر اعتماد کرتے ہیں دوسرے لفظوں میں اپنے دین و دنیا کے مسائل اور مقدرات کسی کے سپرد کرنے سے پہلے اس میں ملکہ عدالت ہونے یا نہ ہونے کی تحقیق کرتے ہیں، اس ضمن میں شواہد و گواہ جمع کرتے ہیں اور جب یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ عالم و عادل ہے، اس میں دینی و مذہبی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں کوئی کوتاہی و سستی دیکھنے میں نہیں آئی ہے اور اسے کسی گناہ کا ارتکاب کرتے نہیں دیکھا گیا ہے، تب اس پر اعتماد کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

چنانچہ امام جمعہ، امام جماعت اور انتخاب مرجع تقلید میں ہمیشہ سے یہی وطیرہ رہا ہے کہ اعلیٰ ترین عدالت کی تحقیق کے بعد ہی ان پر بھروسہ کیا جاتا ہے لیکن اس نظام میں بھی عملاً دو نقص پایا جاتا ہے:

۱۔ ایک مرجع وقت کے لئے کس حد اور کس قسم کی عدالت کی ضرورت ہے، کیونکہ عدالت کے

چند مراتب ہوتے ہیں:

(۱) عدالت اسلامی، ہر مسلمان کو عادل ہونا چاہئے پابند انجام واجبات اور ترک محرمات۔

(۲) عدالت امام جمعہ و جماعت۔

(۳) عدالت گواہ اور شاہد مقدّمات۔

(۴) عدالت قاضی: ایک مقامی عدالت کے قاضی کی عدالت میں اور ملک کے اعلیٰ درجہ

عدالت کے قاضی کی عدالت میں میں فرق ہونا ضروری ہے کیونکہ مقامی قاضی کی ذمہ داری

صرف قضاوت تک محدود ہے جبکہ اعلیٰ عدالت کے قاضی عدالت کے علاوہ تمام قاضیوں

کی نصب اور عزل ان کے اختیار میں ہے اگر خدا نخواستہ اس کی عدالت میں خلل آجائیں تو

پورے ملک کی عدالتوں کی جڑیں ہل جائیں گی بلکہ ملک کا ہی اللہ حافظ۔

(۵) عدالت مرجع اور ربہر۔

منصب مرجعیت پر بٹھاتے وقت تو عدالت ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں تحقیق کی جاتی ہے لیکن

بعد میں نظارت کا کوئی بندوبست نہیں ہوتا۔ گویا نبی یا امام کی مانند انہیں بھی معصوم گردانتے

ہوئے، انکے لئے عدالت سے انحراف کو غیر عقلی قرار دے دیا جاتا ہے، جبکہ خود مراجع اس

بات کے معتقد نہیں چنانچہ آیت اللہ العظمیٰ سید محسن الحکیم نے عدالت مرجعیت کے بارے

میں فرمایا کہ مرجعیت پر فائز ہونے سے پہلے تو عدالت ہوتی ہے لیکن بعد میں اس پر قائم رہنا

ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔

اگر مرجع خود عدالت پر قائم رہنے کی کوشش بھی کرے تو وہ افراد جو اس کے ارد گرد ہوتے ہیں،

اسے ثابت قدم نہیں رہنے دیتے بلکہ دنیا بھر کے مفاد پرستوں کے نمائندہ ان کے مجلس شوریٰ میں پہنچ

جاتے ہیں اسلام کی سر بلندی یا اصلاحی اقدامات کو مصلحت نہ ہونے کا بہانہ بنا کر باز رکھتے ہیں جسکے

نتیجے میں ملت ہر آئے دن رجوع قہقری کر رہی ہے لہذا عقل و شرع اور تجربہ کے تحت ہماری ذمہ

داری قرار پاتی ہے کہ جس طرح انتخاب کے وقت ان کو پرکھا تھا، بعد میں بھی نظارت کو جاری رکھا جائے، وہ بھی ہم جیسے انسان ہی ہیں، نبی یا امام کی طرح معصوم تو بہر حال نہیں ہیں، یہاں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پیغمبرؐ، امامؑ اور مجتہدین سے قرب رکھنے والی ہستیوں کا کردار ایسا ہونا چاہئے کہ وہ امت اور ان قائدین کے درمیان حائل نہ ہوں بلکہ ان کے مابین قرب کا باعث بنیں، خداوند عالم نے سورہ احزاب میں از وراج رسول کو مخاطب کرتے ہوئے اسی بات کی جانب اشارہ فرمایا ہے کہ انہیں چاہئے کہ پیغمبرؐ کی ساحت کا خیال رکھیں۔ حضرت امام جعفر صادقؑ نے اپنے قریب ترین افراد سے فرمایا:

”تم ہمارے اور دوسروں کے درمیان باعث قرب بنو، نہ یہ کہ تمہاری وجہ سے لوگ ہم سے دور ہو جائیں“

جب نبی اور امام کے گرد رہنے والے افراد کے لئے ایسے احکامات موجود ہیں تو غور طلب بات یہ ہے کہ مراجعین کے ارد گرد رہنے والوں کی کیا ذمہ داری ہونی چاہئے، پس معلوم ہوا کہ یہ اتنا اہم فریضہ ہے کہ اگر اسکو ادا کرنے میں کوتاہی برتی جائے تو امت ناقابل تلافی نقصان سے دوچار ہو سکتی ہے۔

حدود عصمت

عصمت کا لفظ سنتے ہی پہلے مرحلہ پر جو معنی ذہن میں آتا ہے وہ گناہ و معصیت سے محفوظ ہونا ہے، عصمت کا یہ تصور اس کے مختلف مصداق میں سے ایک مصداق ہے، انبیاء کی جس عصمت کے ہم معتقد ہیں، اس کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے انبیاء و ائمہؑ کی عصمت کی چار حدود ہیں:

۱۔ انبیاء کا فکری ماخذ خطا، غلطی، اشتباہ اور نسیان سے محفوظ ہے۔ عصمت میں یہ دائرہ سب سے وسیع تر اور سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے دنیا کے تمام نامور فلاسفہ، نوابغ روزگار اور علماء کا مصدر علم اور فکر خود ان جیسا ایک جائزہ الخطا ہے جبکہ انبیاء کا ماخذ علم، کثیر آیات قرآنی کے تحت یا تو مستقیم

طور پر خداوند کریم کی ذات ہے جیسا کہ سورہ نمل کی آیت ۶ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَأَنكَ لَتَلْقَى الْقُرْآنَ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ عَلِيمٍ﴾ ”اور تم کو یہ قرآن (خود) خدائے حکیم ودانا کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے“ یا پھر وہ جبرئیل امین کے توسط سے خبر لیتے ہیں جنہیں خود خداوند عالم نے سورہ شعراء آیت ۱۹۳ میں ”امین“ کہا ہے: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ﴾ ”جسے روح الامین نے اتارا“

خداوند عالم سورہ نجم آیت ۴، ۳ میں فرماتا ہے:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ - إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ ”وہ ہرگز ہوائے نفس سے بات نہیں کرتا۔ جو کچھ وہ کہتا ہے وحی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے“

۲۔ انبیاء حفظ وحی میں معصوم ہیں یعنی خدا سے وحی لینے کے بعد ان پر بھول و نسیان طاری نہیں ہوتا جیسا کہ سورہ اعلیٰ آیت ۴ میں خدا نے فرمایا ہے کہ ہم آپ کو اس طرح سے پڑھائیں گے کہ پھر آپ بھولیں گے نہیں: ﴿سَنُفَرِّقُكَ فَلَائِمٌ﴾ ”ہم خود آپ کو پڑھائیں گے پس آپ اسکو نہ بھولیں گے“

۳۔ انبیاء تبلیغ کے عمل میں بھی معصوم ہیں یعنی جب بات پہنچاتے ہیں تو گفتگو میں اشتباہ اور اجمال کوئی نہیں کرتے جیسا کہ سورہ نجم کی آیت ۴، ۳ جو اوپر بیان کی گئی ہیں ارشاد ہوا ”جو کچھ بھی وہ کہتا ہے وحی کے سوا کچھ بھی نہیں“ اور سورہ رحمن آیت ۲ میں بیان ہوا: ﴿عَلَّمَ الْقُرْآنَ خَلَقَ الْإِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾ ”اور اسی نے قرآن کی تعلیم دی۔ اسی نے انسان کو خلق کیا اور اسی نے بیان بھی سکھایا“

۴۔ اسی طرح مقام عمل میں بھی انبیاء معصوم ہیں کیونکہ گناہ سرزد ہونے کے وہ اسباب جو عام انسانوں میں معمول کے طور پر ہوتے ہیں انبیاء و ائمہ ان سے محفوظ ہیں۔

حقیقت عصمت

جو انسان خداوند تعالیٰ کی طرف سے خلق کی ہدایت اور رہبری کیلئے منتخب ہو، اسے معصوم ہی ہونا چاہئے۔ بصورت دیگر اس پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں وہ ہمیں قبول کرنا پڑیں گے۔

عصمت کے حامل سے ترک اطاعت یا فعل معصیت کا ارتکاب ناممکن قرار دیا جاتا ہے، حقیقت عصمت کیا ہے؟ کیا یہ کوئی ایسی ناقابل تعریف حقیقت ہے جس کا سمجھنا یا سمجھنا ناممکن نہیں ہے؟ یا یہ کہ یہ ایک مفروضہ ہے جو فریق مخالف کو خاموش کرنے اور اہل گمراہی یعنی ایمان رکھنے والوں کی تسکین کی خاطر گھڑا گیا ہے؟ یا پھر یہ مخالفین اسلام کو مخالفت سے باز رکھنے کی خاطر اوپر سے پہنی ہوئی کوئی ضلع ہے؟ علمائے اعتقاد نے عصمت کی حقیقت کی دو تفسیر کی ہیں:

۱۔ یہ ایک لطف ہے جس سے خداوند عالم نے اپنے منتخب نمائندوں کو نوازا ہے اس لطف کے وارد ہونے کے بعد ان میں نہ ترک اطاعت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور نہ فعل معصیت کا تصور ذہن میں آتا ہے۔

عصمت کی یہ تعریف درحقیقت بڑی مبہم تعریف ہے یہ ایک معما اور غیر واضح شے کی غیر واضح الفاظ میں تفسیر کرنے کی مانند ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی انگریزی زبان سے نا آشنا شخص جب کسی انگریزی کلمہ کا مفہوم پوچھے تو اس کا ترجمہ ترک یا جرمن زمان میں کیا جائے جبکہ وہ شخص انگریزی کی طرح ان زبانوں سے بھی نا بلند ہے اس تعریف کے تحت عصمت ایک ایسی طاقت ہے جس کے ہوتے ہوئے ترک اطاعت یا ارتکاب معصیت ناممکن ہے اس تعریف میں عصمت کی تفسیر ”لطف“ سے کی گئی ہے جبکہ لطف بھی خود ایک نامعلوم کلمہ ہے یہ کلمہ بجائے خود جائے سوال و استفسار رکھتا ہے کیا لطف کوئی جسمانی خلیہ ہے جسکی خوبی یہ ہے کہ اس کی وجہ سے انسان نہ ترک اطاعت کرتا ہے اور نہ فعل معصیت؟ یا یہ کوئی ایسی روحانی صفت ہے کہ جو دیگر صفات کی مانند وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مرحلہ وار انسان کی اندر نمود پاتی ہے، جیسے علم، طلب، رضا، ناراضگی وغیرہ؟ یا پھر یہ کوئی بیرونی چیز ہے جو جسم و روح سے منفصل ہے، جو اسے مہلک اور نامطلوب حالات سے اسی طرح محفوظ رکھتی

ہے جس طرح کہ ایک چروایا، بیڑ، بکریوں کی نگرانی کرتا ہے اور انہیں خطرات سے بچاتا ہے، یا کسی چھوٹے بچے کی نگرانی پر معمور شخص اسے گرنے سے، گندی چیزیں کھانے سے اور جسم کو ضرر پہنچانے والی چیزوں سے محفوظ رکھتا ہے؟۔

پیغمبر اکرمؐ کے مبعوث ہونے سے پہلے کے دور کے بارے میں جناب امیر المومنینؑ شیخ البلاغہ میں فرماتے ہیں: خداوند عالم نے فرمایا: ہم نے ان پر (رسول اللہ پر) ایک ملک کو موکل کیا تھا جو انہیں محاسن اخلاق کی راہ پر گامزن کرتا تھا اور برائیوں سے روکتا تھا۔ اگر ہم یہاں ملک کا ترجمہ اس معروف جنس موجود سے کریں تب تو ٹھیک ہے ورنہ اگر یہاں ملک کا ترجمہ عصمت سے کیا تو اس صورت میں عصمت کے ذیل میں بیان کردہ دوسری تفسیر کی طرف برگشت کرنا پڑے گی۔

۲۔ بعض علمائے اعتقاد نے عصمت کو لطف کی بجائے "ملکہ نفسانی" سے تعبیر کیا ہے یعنی یہ کہ یہ انسان کے جسم سے مربوط کوئی شے نہیں بلکہ ایک نفسانی صفت ہے انسان کا نفس اس صفت کے رسوخ پانے سے اور اس سے آراستہ و پیراستہ ہونے کے سبب فعل معصیت یا ترک اطاعت کی طرف نہیں جاسکتا۔

عصمت کو چاہئے آپ لطف الہی کہیں یا ملکہ نفسانی، ہمارا سوال اسی جگہ پر قائم ہے کہ آیا اس صفت تک پہنچنے کیلئے لطف الہی اور ملکہ حاصل کرنا ہر انسان کیلئے ممکن ہے؟ کیا انسان کے لئے یہ میدان صاف ہے، یہ دروازہ سب کیلئے کھلا ہوا ہے اور سب اس درجہ پر فائز ہو سکتے ہیں؟

اگر ایسا ہے تو پھر انبیاء یا خدا کے مخصوص بندوں کے لئے کوئی خاص ضمانت نہیں ہوئی جس کی ضرورت تھی کیونکہ اس مقام تک ہر شخص پہنچ سکتا ہے اگر یہ خاص طور پر صرف انبیاء کیلئے مختص ہے اور دوسروں کو میسر نہیں تو اس صورت میں بھی ان حضرات کا کوئی امتیاز یا ان کی کوئی فضیلت نہ ہوئی، کیونکہ جسے خدا نے بخشا وہ پا گیا اور جسے نہیں دے وہ محروم رہا۔

عقیدہ عصمت انبیاء پر اشکالات اور اعتراضات

انبیاء کے بارے میں عمداً یا استغناءً مختلف زاویہ نگاہ سے اشکالات اور اعتراضات کئے جاتے ہیں۔ اس مذہب کے خلاف عمداً کمر بستہ ہو کر اشکالات اور اعتراضات کرنے والے کسی بھی صورت ہمارے جوابات سے قانع اور مطمئن نہیں ہونگے، مگر جو افراد نا سمجھی میں ایسا کرتے ہیں ہم پہلے ان کے ذہنوں میں پیدا ہونے والے اشکالات اور اعتراضات کے اسباب اور وجوہات کو بیان کریں گے، اس کے بعد ان کا ذکر کریں گے اور پھر تیسرے مرحلے میں اپنی بساط علمی اور آگاہی کے حدود میں رہتے ہوئے ان اشکالات کے جوابات دینے کی کوشش کریں گے۔

اعتراضات اور اشکالات کے اسباب اور وجوہات

۱۔ بہت سے افراد کسی بھی موضوع پر غور و فکر یا باریکی میں جانے کی زحمت کرنے کیلئے آمادہ نہیں ہوتے ہیں، سرسری اور سطحی طور پر سنتے ہیں اور اسی سے ذہن میں ابھرے ہوئے اشکال کو پیش کرتے ہیں۔

۲۔ دوسرا اشکال فلسفی بنیاد پر ہے وہ انبیاء کو عام بشر سمجھتے ہیں اور بشری خلقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس سے خطا سرزد ہو سکتی ہے ورنہ وہ بشر نہیں رہتا۔

۳۔ بعض لوگ عصمت کے وصف کو صرف انبیاء و ائمہ سے مخصوص کرنے کو، ان کیلئے کوئی فضیلت نہیں سمجھتے کیونکہ اس صفت کے حصول میں ان کا اپنا کوئی کردار نہیں ہے اور یہ صفت ان کے ارادے کے بغیر ان میں پیدا ہوئی ہے فضیلت اس وقت ہے جب اس کے ہونے میں ان کا اپنا کوئی اپنا کردار ہو جب انبیاء کا صفت عصمت کے حصول میں کوئی کردار نہیں تو پھر یہ ان کیلئے کوئی فضیلت بھی نہیں ہے اور اگر یہ صفت حاصل کرنا دوسروں کیلئے بھی ممکن ہو تو اس صورت میں یہ ان کیلئے کوئی امتیاز نہیں رہتا۔

۴۔ بعض لوگوں نے عصمت کے معنی شیطان کی زد اور اس کے بہکانے میں انسان کا نہ آنا بیان

کئے ہیں کتب آسمانی کی بعض آیات میں صریح طور پر آیا ہے کہ بعض انبیاء شیطان کی زد میں آنے اور اس کے بھکانے سے محفوظ نہ رہ سکے۔

اب یہاں پر ہم عصمت کے جانے والے اعتراضات کا جائزہ لیں گے:

۱۔ کیا ممکن ہے کہ عصمت کے لئے جو چار عناصر اور پر بیان کئے گئے ہیں، انسان انہیں بطور کامل حاصل کر سکے؟

۲۔ کیا انسان کے لئے یہ ممکن ہے کہ اسے، انسان سے مربوط ہر قسم کے نفع اور نقصان کا علم حق الیقین کے درجہ تک حاصل ہو جائے؟

پہلے ہم دوسرے سوال کو زیر بحث لاتے ہیں اس سوال کا جواب یہ ہے کہ کسی فعل کے نفع و نقصان کی صحیح تشخیص کرنا فقط دنیاوی زندگی پر انحصار کرنے والے انسان کیلئے ایک ناممکن عمل ہے یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان حیات دنیوی کے بعد ایک اور حیات جسے حیات ابدی کہتے ہیں، اسکا بھی تصور کرے اور اس پر یقین رکھے کیونکہ دنیا میں رہ کر انسان کو بہت سے ایسے افعال انجام دینا پڑتے ہیں جن سے بظاہر نقصان ہی نظر آتا ہے لیکن اسکے باوجود انہیں انجام دینا ضروری ہوتا ہے، جیسے زکوٰۃ ہے، خیرات ہے، یہ سب مالی نقصان ہے، اسی طرح جہاد ہے، جنگ میں شریک ہو کر جان دینا، نقصان کے سوا اور کیا ہے؟ اگر نقصان کے بارے میں حق الیقین کو کافی سمجھا جائے، تو پھر ان نقصان وہ اعمال کا حق الیقین ہونے کے باوجود ارتکاب کرنے والوں کی کیا توجیہ کریں گے؟

لہذا اس سوال کے جواب کا پہلا مرحلہ تو یہ ہے کہ کسی انسان کے لئے ہر چیز میں موجود تمام تر نفع و نقصان کا علم ہونا اور ہر چیز کے تمام ضرر و رساں اور فائدہ مند پہلوؤں سے آگاہی رکھنا کسی طور ممکن ہی نہیں ہے دنیا میں جتنی بھی نابذ روزگار شخصیات گزری ہیں، وہ سب فقط اپنے مخصوص شعبوں میں ہی آگاہی رکھتی تھیں، دوسرے شعبوں میں جاہل تھیں، علماء، فقہاء، مجتہدین اور عرفاء حضرات ہی کو لے لیجئے، یہ لوگ روحانی علوم میں تو ملکہ رکھتے ہیں لیکن وہ تمام چیزیں کہ جو دنیوی ضرر کا باعث ہو

سکتی ہیں، سب سے واقفیت نہیں رکھتے اور اسی لئے یہ ہستیاں جسم کو نقصان پہنچانے والے مضمرات کا ارتکاب کر سکتی ہیں اس کے برعکس ایک طبیب جسمانی ضرر پہنچانے والی چیزوں سے خوب واقف ہوتا ہے جبکہ روحانی مضمرات سے نااہل ہوتا ہے۔

دوسرے مرحلہ پر کسی فعل کے نفع و نقصان کو فقط دنیا سے مربوط کرنا، یا فقط آخرت سے ارتباط دینا، تفسیر عصمت میں مشکلات کے اسباب پیدا کرتا ہے چنانچہ نفع و نقصان کو فقط دنیا یا فقط آخرت سے ارتباط دینے والوں کو مشکلات کا سامنا رہتا ہے اسکی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ ایک انسان فقط وقتی یا چند لمحوں کی دنیاوی ذلت و خواری سے بچنے کیلئے خودکشی کر لیتا ہے اور یوں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے یقیناً یہ گناہ کبیرہ ہے۔

۲۔ دوسرا انسان جسکے نزدیک آخرت ہی کی زندگی سب کچھ ہے، دنیا میں رہبانیت کی زندگی اختیار کر لیتا ہے یہ شخص بھی گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے۔

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے کہ کیا ایک عام انسان کیلئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے اندر صفت عصمت بطور کامل پیدا کر لے؟ اس کی وضاحت ہم عصمت سے متعلق چند دیگر اہم مفاہیم کے بیان کے بعد آئندہ صفحات میں کریں گے۔

انسان سے گناہ سرزد ہونے کے اسباب و وجوہات:

۱۔ جہل و نادانی: انسان سے گناہ سرزد ہونے کے اسباب و علل میں سے ایک اس کے وجوب اور اسکی حرمت یا اسکی قباحت اور مذموم ہونے کے بارے میں، جہل و نادانی ہوتی ہے اگر کوئی شخص کسی فعل کی حرمت و قباحت یا اس کے مذموم ہونے کے بارے میں قطعی طور پر نااہل اور لاعلم ہو تو ایسے فعل کو وہ بغیر کسی جھجک کے انجام دیتا ہے بلکہ بسا اوقات اس فعل کو انجام دے کر راحت اور مسرت محسوس کرتا ہے مثلاً اگر کسی کو سود کی کثیر رقم ہاتھ آجائے تو اسے خوشی ہوتی ہے

بلکہ وہ اسے خدا کی طرف سے عطیہ و انعام گردانتا ہے اسی طرح مغربی دنیا میں ایک نوجوان لڑکا اور نو خیز لڑکی اگر باہمی رضامندی سے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کریں، جس پر انکے یہاں کسی قسم کی پابندی بھی نہیں، تو جب انھیں اس بات کا قطعاً علم ہی نہیں کہ خدا کے نزدیک یہ ایک حرام اور قبیح فعل ہے تو ظاہر ہے کہ انھیں احساس جرم بھی نہیں ہوگا۔ اسی طرح ہمارے یہاں بہت سی خواتین انتہائی شرمناک آرائش و زیبائش کے ساتھ، کھلے عام بے حجاب گھومتی پھرتی ہیں انھیں سرے سے بے حجابی کی حرمت کا علم ہی نہیں، اس لئے اس میں ذرہ برابر بھی کراہت و قباحت محسوس نہیں کرتیں۔ اسی طرح بہت سے احکام مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کے بارے میں اگر کسی کو علم نہیں اور ایک عمر گزر جائے تو ممکن ہے کہ ایسا انسان اس وجہ سے ان گناہوں کے عقاب سے بچ جائے یا کم از کم اس میں تخفیف ہو جائے کیونکہ اس کیلئے ابلاغِ حجت نہیں ہوئی، اس تک تبلیغ پہنچی ہی نہیں۔

۲۔ ذاتی خواہشات: گناہ کے ارتکاب کا ایک سبب انسان کی ذاتی خواہشات ہیں۔ اگر معلوم بھی ہو اور بتا بھی دیا گیا ہو کہ یہ فعل برا ہے یا یہ کہ اس فعل کی انجام دہی نقصان دہ اور ضرر رساں ہے، جیسے کبھی مریض کی خواہش ایسی غذا کھانے کی ہوتی ہے جسے طبیب نے منع کیا ہے۔ انسان میں بہت سی ایسی خواہشات کے عناصر موجود ہیں مثلاً راحت طلبی، منصب اور اقتدار کی خواہش، مال اور دولت کی خواہش، لذیذ کھانوں کی خواہش، جنسی خواہشات وغیرہ وغیرہ، جو اسے گناہ کی طرف گھسیکتی ہیں۔ مختلف قوتیں ہیں جو انسان کے اندر ان خواہشات کو جنم دیتی ہیں مثلاً حرص و حسد، غضب و شہوت، جنسی خواہشات وغیرہ، ان خواہشات کے روکنے کا اگر کوئی بندوبست نہ ہو، اگر کوئی بڑی قوت و طاقت ان کو روکنے والی نہ ہو تو انسان لازماً گناہ کا ارتکاب کرے گا۔

انبیاء ان اسباب و عوامل سے محفوظ ہیں لہذا وہ عام انسانوں کے لئے اسوۂ حسنہ قرار پائے ہیں جیسا

کہ خداوند عالم نے فرمایا کہ تمہارے لئے رسول بہترین نمونہ ہیں اس سلسلے میں مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ فرمائیں:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ ”تمہارے لئے پیغمبر خدا کی پیروی بہتر ہے۔“ (احزاب ۲۱) ﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ﴾ ”اے پیغمبر لوگوں سے“ کہہ دو کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور خدا بخشنے والا اور مہربان ہے کہہ دو کہ خدا اور رسول کا حکم مانو اگر نہ مانو گے تو خدا بھی کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔“ (آل عمران ۳۱، ۳۲)

عصمت انبیاء کے خلاف قرآنی آیات سے استدلال

الف۔ حضرت آدم کے بارے میں شبہات:

﴿فَإِذَا لَهِمَّ الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَاغْرُ يْهُمَا مِمَّا كَانُ فِيهِ﴾ ”پس شیطان انکی اغوش کا سبب بنا اور جس بہشت میں وہ تھے وہاں سے نکال دیا“ (بقرہ ۳۶) ﴿قَالَ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ ”ان دونوں (آدم و حوا) نے عرض کیا اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کے اگر تو ہم کو نہ بخشنے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم گھانا اٹھانے والوں میں ہو جائیں گے“ (اعراف ۲۳)

ب۔ حضرت نوح کے متعلق شبہ

سورہ صودا آیت ۷۷ میں حضرت نوح علیہ السلام کے گناہ کی طرف نسبت ہے:

﴿قَالَ رَبِّ انْصُرْنِي بِمَا كُنْتُ دَاعِيًا إِلَى آلِهَتِكَ الْكَافِرَاتِ﴾ ”نوح نے کہا کہ خدایا میں

اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ اس چیز کا سوال کروں جس کا علم نہ ہو۔“

ج۔ حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں شبہات:

﴿فلما جن عليه الليل راكبو كبا قال هذا ربى فلما افل قال لا احب الافلين﴾ ”جب رات ہوئی، تاریکی نے اسے ڈھانپ لیا تو اس نے ایک ستارے کو دیکھا تو کہا کیا یہ میرا رب ہے لیکن جب وہ غروب ہو گیا تو کہا میں غروب ہونے والے کو پسند نہیں کرتا“ (انعام ۷۶) ﴿واذ قال ابراهيم رب انى كى فتحى الموتى قال اولم نومن﴾ ”اور جب ابراہیمؑ نے کہا پروردگار مجھے دکھا تو کیسے مردوں کو زندہ کرتا ہے، فرمایا کیا تم ایمان نہیں لائے“ (بقرہ ۲۶۰) ﴿قال بل فعله كبيرهم هذا فستلوهم ان كانوا ينطقون﴾ ”ابراہیمؑ نے کہا بلکہ یہ کام ان کے بڑے نے کیا ہوگا ان ہی سے پوچھو اگر یہ بات کر سکتے ہیں“ (انبیاء ۶۳)

د۔ حضرت موسیٰؑ کے بارے میں شبہات:

﴿وفعلت فعلتك التى فعلت وانت من الكافرين﴾ ”اور تو نے وہ کام جو انجام نہیں دینا چاہے تھا انجام دیا ہے اور تو کافروں میں سے تھا“ (اشعراء ۱۹) ﴿قال فعلتها اذا وانا من الضالين﴾ ”موسیٰؑ نے کہا کہ وہ قتل میں نے اس وقت کیا تھا جب میں غافل تھا“ (شعراء ۲۰) ﴿ففررت منكم لما خفتكم فوهب لى ربهى حكما وجعلنى من المرسلين﴾ ”پھر میں نے تم لوگوں کے خوف سے گریز اختیار کیا تو میرے رب نے مجھے نبوت عطا فرمائی اور مجھے اپنے نمائندوں میں سے قرار دیا“ (شعراء ۲۱) ﴿فوكزه موسى فقضى عليه قال هذا من عمل الشيطان انه عدو مضل مبين﴾ ”موسیٰؑ نے اس دشمن کے سینہ پر ایک مکا مارا اور اس کا کام تمام کر دیا وہ زمین پر گر ا اور مر گیا۔ موسیٰؑ نے کہا یہ ایک عمل شیطانی تھا بیشک وہ شیطان دشمن اور صریح بہکانے والا ہے“ (قصص

(۱۵/) ﴿قَالَ رَبِّ انِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي فَغَفَرَ لَكَ رَبُّكَ وَهُوَ الْغَفُورُ
الرحيم﴾ ”موسیٰ نے کہا اے میرے پروردگار میں نے اپنے اوپر ظلم کیا تو مجھے بخش
دے پس اللہ نے اسے بخش دیا وہ اللہ بیشک بخشنے والا رحم کرنے والا ہے“ (قصص/۱۶)
و۔ حضرت یوسف کے بارے میں شبہات:

﴿وَلَقَدْ هَمَمْتُ وَهَمُّ بَهَالٍ لَا اِنْ رَا بَرِهَانَ رَبِّهِ كَذَلِكَ لَنْصَرِفَ عَنْهُ السُّوءُ
وَالْفَحْشَاءُ اِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ﴾ ”اور اس عورت نے قصد کر لیا تھا ان کا اور
اگر وہ اپنے رب کی روشن دلیل نہ دیکھ لیتے تو وہ بھی قصد کرتے۔ یوں ہوا کہ یوسف
سے ہم برائی اور بے حیائی کو دور کریں، بیشک وہ ہمارے بندوں میں سے جن کے لئے
لگے ہیں“ (یوسف/۲۳)
و۔ حضرت یونس پر شبہ:

﴿وَذَالِئِنْ اَذْهَبَ مَغَاضِبًا فَنظُنَّ اَنْ لَنْ نَقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادَىٰ فِي الظُّلُمَاتِ
اَنْ﴾ ”اور یونس کو یاد کرو جب وہ غصہ میں آکر چلے اور یہ خیال کیا کہ ہم ان پر روزی
تنگ نہ کریں گے پھر تاریکیوں میں جا کر آواز دی“ (انبیاء/۸۷)
ز۔ بعض آیات قرآنی میں بھی آیا ہے اور خود انبیاء و ائمہؑ نے بھی درگاہ خداوندی میں اپنی کوتاہیوں اور
تقصیر پر بخشش و استغفار کیلئے دست نیاز بلند کر کے اپنی زبان سے دعا کی ہے۔
عصمت سے متعلق اشکالات کے جواب

۱۔ عصمت وہ صفت ہے جس کے ہوتے ہوئے انسان مختلف خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ رہتا
ہے یہ صفت تمام انسانوں میں کسی نہ کسی حوالے سے موجود ہوتی ہے البتہ اس کے مختلف
درجے ہیں اور انبیاء اس حوالے سے اس کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہیں لہذا یہ کہنا کہ عصمت انسانی
ساخت اور انسانی بناوٹ کے منافی ہے، ایک سطحی فکر کی غمازی کرتی ہے اس اشکال میں کسی

قسم کی تحقیق و تدقیق کی بوسنک نہیں آتی، عام مشاہدہ کی بات ہے کہ جس چیز کی طرف انسان زیادہ متوجہ ہوتا ہے اس میں کبھی بھی خطا نہیں کرتا ہے چنانچہ ہم کبھی کھانا کھانا نہیں بھولتے، کبھی سونا نہیں بھولتے، کبھی دفتر جانا نہیں بھولتے، ہماری عمر گزر جاتی ہے ہم کبھی زہر نہیں کھاتے، اسی طرح سے عصمت از گناہ بھی احکام خداوندی کی طرف توجہ کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے غرض عصمت بمعنی ترک گناہ میں صرف انبیاء اور ائمہ شامل نہیں ہیں بلکہ دوسرے انسان بھی گناہوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

۲۔ جن آیات میں انبیاء کرام کی طرف خطا، لغزش اور کوتاہی کی نسبت دی گئی ہے ان کے جوابات یہ ہیں:

۲-۱۔ یہ اشکال کہ بہت سے انبیاء شیطان کے بہکانے میں آئے، اس آیت کی صریح خلاف ورزی ہے کہ جس میں شیطان خود کہتا ہے کہ میں تیرے تمام بندوں کو گمراہ کروں گا سوائے بندگان صالح کے آیت ۸، انبیاء کے صالح ہونے میں کسی کو شک نہیں ہے۔

۲-۲۔ عصمت کا ماخذ و مصدر نہ کوئی جسمانی خلیہ ہے، نہ کوئی نفسانی صفت ہے۔ اور نہ بیرونی حصار و چار دیواری ہے بلکہ عصمت ایک دینی ضرورت ہے جس طرح تمام بندوں میں سے ایک بندہ کو خلق کی ہدایت کیلئے مقام رسالت و نبوت پر فائز کرنا ضروری ہے، اسی طرح اسی ہستی کو عصمت سے آراستہ و پیراستہ رکھنا بھی ضروری ہے یہ ایک استثنائی عمل ہے اور یہ استثناء اپنی حدود کے حصار میں رہے گا لہذا انبیاء و ائمہ کیلئے جس عصمت کے ہم معتقد ہیں وہ عام عصمت کے تصور سے تین چوتھائی وسعت رکھتی ہے اس بات کی وضاحت آگے چل کر حدود عصمت کے ذیل میں آئے گی، گزشتہ صفحات میں ہم نے عصمت انبیاء و ائمہ کے بارے میں بعض حلقوں کی جانب سے وارد اشکالات کا ذکر کیا ہے، ان میں سے بعض نے قرآن کریم کی آیات کو بنیاد بنایا گیا ہے جبکہ بعض میں روایات اور تاریخی واقعات کو سند بنانے کی کوشش کی

گئی ہے، ان تمام اشکالات کا فرداً فرداً جواب دینا یہاں ممکن نہیں تاہم اس حوالے سے ذہنوں میں موجود تشویش والہجھن کو دور کرنے کیلئے ایک اجمالی اور اصولی وضاحت پیش خدمت ہے۔

بعض اشکالات تو صرف اس وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ اعتقادات پر عقیدت و جذبے کا عنصر غالب آجاتا ہے اور عقیدت کو ٹھیس پہنچا کر اعتقاد کا جواب دینا بعض افراد کیلئے مشکل ہو جاتا ہے ایسی صورت حال میں ضروری ہو جاتا ہے کہ ذہنوں میں عقیدت اور اعتقاد کے اصل فرق کی واضح حد بندی کی جائے، اس سلسلہ میں ایک مسلم اصول تو یہ ہے کہ اعتقاد کیلئے محکمہ سند کی ضرورت ہوتی ہے اگر سند محکم ہو تو اس پر اشکال نہیں کیا جاسکتا۔

قرآن کریم کی بعض آیات کریمہ کو بنیاد بنا کر عصمت کے بارے میں جن شکوک و شبہات کا اظہار کیا گیا ہے، یہ غلط فہمیاں دراصل آیات کے سیاق و سباق کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ اگر آیات میں دقیق غور و غوض کیا جائے تو تمام شبہات خود بخود رفع ہو جائیں گے۔ بعض آیات میں فقط ایک لفظ پورے جملے کی شرط قرار پاتا ہے اگر اس ایک لفظ کو نظر انداز کر کے معنی لئے جائیں تو اشکال اپنی جگہ قائم رہتا ہے لیکن اگر شرط کے لفظ کو سامنے رکھ کر سمجھا جائے تو اشکار دور ہو جاتا ہے مثلاً قصہ ابراہیم میں ﴿ہل فعلہ کبیر ہم هذا فسلو ہم ان کانو یبطلون﴾ میں سے لفظ ”ان“ نکال دیں تو اشکال پیدا ہوتا ہے اسی طرح سورہ یوسف میں ﴿ہم بما لا لان راہرہاں رہہ﴾ میں سے لفظ ”لو“ کو نکالنے سے اشکال پیدا ہوتا ہے بعض جگہوں پر لفظ ”ذنب“ (یعنی گناہ، ظلم) کا ذکر ہوا ہے لیکن یہ گناہ، یہ ظلم کس کے ساتھ ہے، کس کی نظر میں ہے، اشکال کرنے والے نے اس کا خیال نہیں کیا، ممکن ہے نبی یا امام کا کوئی عمل ان کے مخالفین کی نظر میں ذنب یا ظلم ہو لیکن وہی خدا کی نظر میں عین اطاعت ہو، مثلاً نبی کریم ﷺ مشرکین کی نظر میں (معاذ اللہ) مجرم و گنہگار تھے جبکہ خدا کے نزدیک آپ تمام انبیاء سے زیادہ مطہر و فرمانبردار تھے۔ یعنی جو عمل مشرکین کی نظر میں گناہ ہے، ہو

سکتا ہے وہی عمل خدا کی نظر میں عین اطاعت ہو۔

ایک عمل خدا کے نزدیک تو گناہ نہیں ہوتا، لیکن سیاسی اور اجتماعی حوالے سے دیکھا جائے تو یہی عمل دعوت کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے مثلاً ایک کافر اور ظالم کو قتل کرنا گناہ نہیں لیکن قتل میں پہل کرنا دوسروں کیلئے بہانے کا سبب بن سکتا ہے چنانچہ امیر المومنین نے جنگ صفین میں اور امام حسینؑ نے کربلا میں جنگ میں پہل کرنے سے سختی سے گریز فرمایا اور جب حضرت موسیٰ نے فرعون کے حامی قبطی کو ایک مگ مارا جس سے وہ مر گیا تو آپ کو اپنی دعوت کے سلسلے میں فرعون کے دربار میں مشکل پیش آئی۔

معصوم اور غیر معصوم کی شناخت کیسے ممکن ہے؟

معصوم کے قول و فعل کو خاموشی سے اور بغیر کسی چون و چرا کے قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

انبیاء جب دعوائے نبوت کرتے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے مبعوث ہوئے ہیں تو وہ اپنے دعویٰ کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے بطور دلیل معجزہ دکھاتے ہیں تاکہ ان کے اور اس عظیم مقام و منصب کے جھوٹے دعویداروں کے درمیان فرق واضح ہو سکے۔ انسانی معاشرہ میں کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں جو اپنے اوپر تقدس کا ایک خول چڑھائے ہوئے ہوتے ہیں اور عملاً ایسا ظاہر کرتے ہیں کہ گویا وہ معصوم ہیں، یہ حضرات چاہے کسی پر زیادتی کریں، تعدی یا تجاوز کریں یا کوئی ایسا فعل انجام دیں جس سے پوری قوم کو نقصان پہنچے، جب لوگ ان پر اعتراض کرتے ہیں، تو یہ اپنے آپ کو بچانے کیلئے، ان کے جواب میں اس طرح سے برہمی کا اظہار کرتے ہیں گویا کہہ رہے ہوں، کیا تم معصوم پر اعتراض کرتے ہو؟

عصمت کا لبادہ اوڑھ کر یہ حضرات قوم و ملت کے ساتھ جو زیادتیاں چاہیں کریں، اگر ملت کا کوئی فرد اٹھ کر ان پر اعتراض کرے تو اسی مقدس لبادہ کا سہارا لیکر یہ اس کی آواز کو بھی دبا دیتے

ہیں۔ چنانچہ عام مشاہدہ ہے کہ بہت سے موقعوں پر علماء کرام لوگوں سے کہتے نظر آتے ہیں ”آپ علماء پر اعتراض کرتے ہیں، ان کو غلط گردانتے ہیں“ وغیرہ وغیرہ، عصمت ایک ایسا حربہ ہے کہ جسے کوئی بھی شخص امت کے اور قوموں کے حملوں سے بچنے کیلئے بطور سپر استعمال کر سکتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے حالات میں ہم اس شخص کو جو واقعاً عصمت کے درجہ پر فائز ہے، اس شخص کے مقابلہ میں کہ جو عصمت کا جھوٹا دعویدار ہے، کیسے تمیز کر سکتے ہیں؟ ان دونوں میں صحیح اور غلط کی پہچان کیسے ممکن ہے؟

اس سلسلہ میں علمائے اعتقاد نے دو طریقے وضع کئے ہیں:

۱۔ جس شخص کا قول و فعل، یا جسکی سیرت و عمل آیات قرآنی کریم اور سیرت رسول اللہ کے مطابق ہو وہ درجہ عصمت پر فائز ہوگا یا عصمت سے قریب تر ہوگا اور جس کا قول و فعل اور عمل قرآن و سنت سے مطابقت نہ رکھتا ہو، وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہوگا۔

۲۔ ایسا فرد معصوم ہے جس کی عصمت کو ساری امت تسلیم کرتی ہو، وہ اگر کسی فرد کی عصمت کا اعلان کرے جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ نے زہراءؑ رضیہ (س) کے بارے میں فرمایا، یا یہ کہ امیر المومنین حضرت علیؑ کے بارے میں فرمایا حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کے بارے میں یا امام حسنؑ نے امام حسینؑ کے متعلق فرمایا، تو ایسی صورت میں متعارف کنندہ شخصیت کے معصوم ہونے کا یقین حاصل ہو جاتا ہے۔

عام طور پر وقت گزرنے کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مقتداء اور پیشوا اپنے فکر و نظر اور سیرت و کردار میں کس حد تک خطا و لغزش سے محفوظ اور معصوم تھا اور وہ جو کچھ کہتا تھا، کس حد تک صحیح تھا اس طرح عام طور پر دنیا سے گزرنے کے بعد ہی انکی عصمت پر یقین آتا ہے اس کے برعکس عہد حاضر کے قائدین بھرپور طریقے سے یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں: ”ہم آپکو اپنی بات کی ضمانت دیتے ہیں“ گویا اس طرح خود کو معصوم ظاہر کرتے ہیں لیکن جب قوم و ملت گرداب میں گھر جاتی ہے تو

اظہار حقیقت نمائی کرنے والے یہ لوگ، حقیقت گو بن کر کہتے نظر آتے ہیں کہ ”کیا آپ نے ہمیں معصوم سمجھا تھا؟“ ہاں قوم ایسے لوگوں کو اپنے مقابلہ میں لغزشوں سے پاک سمجھ کر ہی انکے ہاتھ میں اپنے مقدرات دیتی ہے اگر انکو خود جیسا سمجھتی تو یقیناً پہلے ہی اعتماد نہ کرتی۔

عقیدہ عصمت کا تاریخی پس منظر

عقائد کی احاث میں سے ایک بحث عقائد کی اپنی تاریخ سے متعلق ہے یعنی اس عقیدہ پر بحث و مناظرہ اور مجادلہ کب سے شروع ہوا یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں میں جو عقائد اس وقت رائج ہیں وہ ”الف“ ”تا“ ”ی“ ابتدائے اسلام میں موجود نہ تھے بلکہ موجودہ دور کے بعض عقائد صدر اسلام کے بعد میں شامل ہوئے، اسلام کے ابتدائی دور میں صاحبان علم و فکر مسلمان، اپنے علم و فکر کی بنیاد پر اور سنی ذہن رکھنے والے عوام، پیغمبر اکرمؐ کے مثالی کردار سے متاثر ہو کر، ہر وہ بات جو پیغمبرؐ فرماتے، اس کو من و عن قبول و تسلیم کر لیتے تھے اگر کسی بھی آیت کے کلمہ کا مصداق معلوم نہ ہوتا تو پیغمبرؐ سے پوچھتے کہ اس سے کون یا کیا مراد ہے؟ وفات پیغمبرؐ کے بعد بیرونی فتوحات کی وجہ سے ایک طرف تو فلسفہ و غیرہ کا عربی زبان میں ترجمہ ہونے لگا اور دوسری طرف یہود و نصاریٰ کی ایک کثیر تعداد اسلام میں داخل ہو گئی ان نو مسلموں میں یہود و نصاریٰ کے علماء بھی شامل تھے جنہوں نے عقائد اسلامی میں شکوک و شبہات کو داخل کیا انہوں نے ہر عقیدہ کو موضوع گفتگو بنایا مثلاً رویت خدا، صفات خدا میں ذات ہے یا زائد بر ذات ہے وغیرہ وغیرہ، لہذا خدا، نبوت اور آخرت پر ایمان کے علاوہ، اس وقت ہمارے یہاں رائج ہر عقیدہ کی ایک تاریخ پیدائش ہے۔ جب تک آپ اس تاریخ پیدائش اور اس کے عقائد میں شامل ہونے کے اسباب و عوامل تک نہیں پہنچیں گے، اس وقت تک اس عقیدہ کے نفی اور اثبات سے متعلق کسی قسم کی تنقید اور تجزیہ، غیر موثر اور ناقص رہے گا۔

اس سلسلہ میں ہم آپ کی خدمت میں ان چند عوامل و اسباب کا ذکر کرتے ہیں جن کی بنا پر آئے دن مسلمانوں کے عقیدوں میں اضافہ ہوتا گیا، ہر نئے عقیدے نے پہلے سے موجود بنیادی عقیدے کو

پس پشت کیا اور نئے عقیدوں کو ایمان و کفر، دینداری و بے دینی اور نجات و ہلاکت کی کسوٹی قرار دیا جانے لگا جیسے ”یا رسول اللہ“ اور ”یا علی مد“ کا نعرہ بلند کرنا جزو عقیدہ اور ایمان قرار دینا۔

۱۔ پیغمبر اکرمؐ کی وفات کے بعد جانشینی پیغمبرؐ کے مسئلہ پر امت دو گروہوں میں تقسیم ہوئی۔ ان میں سے ہر گروہ، فروع اور عقائد کے بارے میں دوسرے گروہ کی نقل کردہ احادیث پیغمبرؐ پر عدم اعتماد کا اظہار کرتا اور شکوک و شبہات کا شکار ہوتا، ہر فریق اشکال کرتا کہ یہ حدیث دوسرے فریق کی نقل کردہ ہے، اس لئے اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں میں راویوں کے حافظہ میں خلل کے سبب ان کی بیان کردہ احادیث قول رسولؐ ہونے میں شکوک و شبہات پیدا ہو گئے، لوگ تذبذب میں پڑ گئے کہ آیا یہ قول جو راوی بیان کر رہا ہے نص رسولؐ ہے بھی یا راوی کی اپنی رائے و تعلیق ہے۔

۳۔ پھر جب اسلامی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو بالخصوص فتح روم کے بعد مسیحی علماء، وطن اسلامی میں مسیح افکار کے ساتھ داخل ہوئے، ان کے مسیحی عقائد کا اسلامی عقائد کے ساتھ تصادم ہوا، یہ مسیحی علماء غلبہ اسلامی کے سبب بظاہر حلقہ اسلام میں داخل ہوئے تھے، لیکن صدق دل سے اسلام قبول کرنے کو تیار نہیں تھے لہذا ان کا اسلامی عقیدہ کو قبول کرنا اور مسلمانوں کا انھیں سمجھانا ایک مشکل عمل تھا یہ بات بذات خود موضوع گفتگو قرار پائی، اسی طرح ایران کی فتح کے بعد زردشتی، مجوس بھی اپنے پرانے عقیدہ کو ساتھ لے کر داخل اسلام ہوئے انھوں نے بھی اسلامی عقائد کو خالص انداز میں قبول نہیں کیا اس طرح سے مسیحیت اور مجوسیت کے شوم عقائد اور منحرف افکار و خیالات نے مسلمانوں کے اذہان میں اثر پذیری کی جسکی وجہ سے عقائد میں گفتگو کے نئے زاویے پیدا ہوئے۔

۴۔ حضرت علیؑ اور معاویہؓ کی جنگ کے بعد ایک نیا سوال پیدا ہو گیا کہ آیا ایمان اور عمل دونوں الگ الگ چیزیں ہیں یا دونوں ناقابل تجزیہ و تقسیم چیز ہے دونوں ایک دوسرے سے وابستہ

ہیں غرض یہ کہ ایمان و عمل جو دین کی بنیاد و بنیادی ایجاد ہیں وہی موضوع بحث و مناظرہ بن گئے چنانچہ خوارج کے حملہ کی زد سے بچنے کے لئے معاویہ نے فکر ”مرجہ“ ایجاد کی جس کے تحت دل میں ایمان ہونا ہی کافی ہے اس فکر کے مطابق ایسی حالت میں اگر عمل کو چھوڑنا پڑے تو چھوڑا جاسکتا ہے اور ظاہری طور پر ارتکاب گناہ یا بت پرستی میں کوئی حرج نہیں، اس مذہب کی بنیاد معاویہ کے دور میں پڑی اور آج تک اس فکر کو ہمارے درمیان فروغ حاصل ہو رہا ہے اسی فکر کا نتیجہ ہی تو ہے کہ ہم آج بھی بدکردار انسانوں کے بارے میں لوگوں کو یہ کہتے سنتے ہیں کہ شاید ایمان اسکے دل میں ہو، شاید خدا کہ یہی منظور ہو وغیرہ وغیرہ۔

۵۔ اسلامی ریاست پر برسر اقتدار حکام ایک جانب اپنے آپ کو منصب رسول کا جانشین گردانتے اور اسے دینی رنگ پہنانے کیلئے کہتے ہیں کہ یہ خلعت انہیں خدا نے پہنائی ہے وہ بطور دلیل اس آیت کو پیش کرتے تھے:

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مَلِكُ الْمَلِكِ تَوَكَّلْ عَلَى الْمَلِكِ مِنْ تَشَاءَ وَتَنْزِعِ الْمَلِكَ مِنْ تَشَاءَ﴾ ”کہہ دیجئے: اے اللہ! اے مملکت (ہستی) کے مالک تو جسے چاہے حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہے حکومت چھین لیتا ہے“ (آل عمران: ۲۶)

دوسری جانب انکا کردار ہر طرح کے جرم و جنایت سے آلودہ تھا۔ یہ گندگی انکے خون میں، رگ و پے میں اس حد تک سرایت کر چکی تھی کہ اسکے اثرات کو چھپانا انکے لئے ممکن نہیں تھا یہ لوگ ہمہ وقت غیر صالح، غیر شرعی اور غیر اسلامی افعال و اعمال کے مرتکب ہوتے تھے اپنے ان عیوب کی پردہ پوشی کرنے اور لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لئے یہ اپنے اعمال کی مختلف توجیہات پیش کرتے تھے، کبھی اس کیلئے مسئلہ جبر سے مدد لیتے تھے کہ خدا نے ہم سے خود یہ فعل انجام دلایا ہے، اس طرح مسئلہ جبر یہ کو فروغ ملا یعنی بندہ اپنے فعل میں مجبور محض ہے، جو کچھ خدا چاہتا ہے جبر اسکو وہی عمل انجام دینا پڑتا ہے بعد میں یہی فکر ایک مدرسہ بن کر ابھری، اس فکر

کو ”توحید خالص“ یا ”تسویہ خالص“ کا لقب دیا گیا عقیدہ ”جبریہ“ کے رد عمل کے طور پر ایک اور نظریہ وجود میں آیا جس کے تحت خدا کچھ نہیں کرتا، سب کچھ بندے کے اختیار میں ہے، اس سلسلے میں خدا کا کوئی کردار ہی نہیں جس سے نظریہ ”تفویض“ پیدا ہو گیا ان دونوں منحرف عقیدے سے نجات کی خاطر نظریہ ”اعتدال امر بین الامرین“ پیدا ہو گیا جسے ”عدلیہ“ بھی کہتے ہیں یہاں سے اہل تشیع نے عدالت کو اصول دین میں شامل کیا ہے اور ماہرین علماء عقائد نے احتیاط کی راہ کو اپناتے ہوئے اسے اصول مذہب شیعہ قرار دیا ہے جسے اب اصول میں شمار کریں یا اصول مذہب میں یا خارج رکھیں کوئی بھی خدا پرست، توحید خداوندی کے قائل خدا کو ظالم، ناقص قرار نہیں دیتے۔

اس کے علاوہ حکام نے اپنے جرم و جنایت کی ایک اور توجیہ پیش کرنے کے لئے انبیاء کرام کو قصور وار، خطا کار اور گناہوں کا مرتکب قرار دینے کی کوشش کی، اس سلسلے میں انہوں نے بعض آیات قرآنی کے ظاہری معنی کو سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کیا تاکہ انبیاء کو خود دش قرار دینے کے بعد انکی اپنی غلطیوں کا جواز پیدا ہو سکے، اس طرح عصمت پر بحث عقائد کا ایک باقاعدہ موضوع قرار پایا یہاں سے علماء اعتقاد نے ”باب اعتقاد“ میں ایک مستقل باب ”عصمت انبیاء“ کے نام سے لکھوا ہے۔

تعداد انبیاء عقل و نقل کی روشنی میں

۱۔ قرآن کریم میں تعداد انبیاء کے بارے میں دو نکات بیان فرمائے گئے ہیں۔

جہاں خود خدا سورہ عافرا آیت ۸ اور سورہ نساء آیت ۱۶۴ میں فرماتے ہیں کہ انبیاء میں سے بعض کا ہم نے ذکر کیا ہے اور بعض کو ہم نے بیان نہیں کیا ہے:

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مِنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ نَقْصُصْ

علیک ؑ ” اور تحقیق ہم نے آپ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے ہیں ان میں سے

بعض کے حالات ہم نے آپ سے بیان کیے ہی اور بعض کے حالات آپ سے بیان نہیں کیے“ (عاف/۷۸) ﴿اور سَلَامٌ قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرِسَالَةً نَقْصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ﴾ ”ان رسولوں پر (وحی بھیجی) جن کے حالات کا ذکر ہم پہلے آپ سے کر چکے ہیں اور ان رسولوں پر بھی جن کے حالات کا ذکر ہم نے آپ سے نہیں کیا“ (نساء/۱۶۴) اس سے بھی مذکورہ تعداد کے ضعف کی تائید ہوتی ہے جب خدا نے خود بیان نہیں کیا تو دوسروں کو کیسے پتہ چلا اور ان اسناد پر کیسے بھروسہ کیا جاسکتا ہے؟

مثلاً دوسرا نکتہ یہ ہے کہ جب خدا نے یہ فرمایا ہے کہ اس بعض کا ذکر کیا ہے اور بعض کا نہیں تو ذکر کئے جانے والے انبیاء کی تعداد اور ذکر نہ کئے جانے والے انبیاء کی تعداد میں عقل کی رو سے کوئی تناسب ہونا چاہئے، ظاہر ہے کہ ذکر کیا جانا، نہ ذکر کئے جانے کے مقابل میں اہمیت رکھتا ہے۔ جن بعض انبیاء کا ذکر ناموں کے ساتھ یا اشاروں کنایوں میں قرآن کریم میں ملتا ہے، ان سب کی تعداد کسی طور ۳۰ تک نہیں ہے جبکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار کا بیان تو اس تعداد کے مقابل کوئی تناسب ہی نہیں رکھتا، ان بعض نبیوں کی تعداد کو بھی کہ جنہیں خدا نے بیان نہیں کیا، ان بعض بیان کردہ نبیوں کی تعداد کے تناسب سے ہی ہونا چاہئے۔

احکام عقلی اور تقاضائے عقل، زمان و مکان کی حد بندی سے باہر ہیں اس تقاضے کے تحت علمائے اعتقاد کی بیان کردہ انبیاء کی تعداد، خدا کی جانب سے مبعوث تعداد کی نسبت کئی گنا غیر متناسب معلوم ہوتی ہے، مثلاً خدا نے حضرت یونس علیہ السلام کو ایک لاکھ یا اس سے زائد انسانوں کی طرف مبعوث کیا، تو یہ ایک مقدار بنتی ہے پھر چھ کھرب انسانوں کیلئے کتنے نبی ہونے چاہئیں؟ لہذا فلسفہ اور ضرورت بعثت انبیاء سے متعلق بحثوں میں جو دلائل ذکر کئے جاتے ہیں وہ کسی تعداد کو بھی قبول نہیں کرتے کیونکہ بشر ہمیشہ اس دلیل کے تحت بعثت انبیاء کا تاج اور نیاز مند رہتا ہے۔

آیات قرآنی

خداوند عالم نے کثیر آیات میں بیان فرمایا کہ ہم نے ہر قوم میں ایک حجت، دلیل، نبی اور گواہ کو بھیجا ہے جیسا کہ درج ذیل آیات میں ذکر ہوا ہے:

۱۔ ”اس وقت کیا ہوگا جب ہم ہر امت کو اس کے گواہ کے ساتھ بلائیں گے اور پیغمبر کو ان سب کا گواہ بنائیں گے“ (نساء/۳۱)

۲۔ ”پھر ہم نے ان رسولوں کے بعد فرعون اور اسکی جماعت کی طرف موسیٰ اور ہارون کو اپنی نشانیاں دے کر بھیجا.....“ (یونس/۷۵)

۳۔ ”اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا ہے کہ تم لوگ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو“ (نحل/۳۶)

۴۔ ”اس کے بعد ہم نے مسلسل رسول بھیجے اور جب کسی امت کے پاس کوئی رسول آیا تو اس نے رسول کی تکذیب کی“ (مومنون/۴۴)

۵۔ ”ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بشارت دیئے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں کوئی ڈرانے والا نہ گزرا ہو“ (فاطر/۲۳)

۶۔ ”ان سے پہلے بھی نوح کی قوم اور اس کے بعد والے گروہوں نے رسولوں کی تکذیب کی ہے اور ہر امت نے اپنے رسول کے بارے میں یہ ارادہ کیا ہے کہ اسے گرفتار کر لیں“ (غافر/۵)

۷۔ ”اور آپ ہر قوم کو گھٹنے کے بل بیٹھا ہوا دیکھیں گے اور سب کو ان کے نامہ اعمال کی طرف بلایا جائیگا کہ آج تمہارے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا“ (جاثیہ/۲۸)

۸۔ ”ہم نے تم سے پہلے دانی استوں کی طرف بھی رسول بھیجے ہیں“ (انعام/۴۲)

۹۔ ”اللہ کی اپنی قسم ہے کہ ہم نے تم سے پہلے مختلف قوموں کی طرف رسول بھیجے تو شیطان نے ان کے کاروبار کو ان کیلئے آراستہ کر دیا“ (نحل/۶۳)

۱۰۔ ”اور اگر تم تکذیب کرو گے تو تم سے پہلے بہت سی قومیں یہ کام کر چکی ہیں اور رسول کی ذمہ

داری تو صرف واضح طور پر پیغام کو پہنچا دیتا ہے“ (عکبوت/ ۱۸)

۱۱۔ ”اور ہم تو اس وقت تک عذاب کرنے والے نہیں ہیں جب تک کوئی رسول نہ بھیج دیں“ (اسراء/ ۱۵)

۱۲۔ ”قیامت کا دن وہ ہوگا جب ہم ہر گروہ انسانی کو اس کے پیشوا کے ساتھ بلائیں گے“ (اسراء/ ۷۱)

۱۳۔ ”کیا انہیں اس بات نے رہنمائی نہیں دی کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی نسلوں کو ہلاک کر دیا جو اپنے علاقے میں اطمینان سے چل پھر رہے تھے۔ اس میں صاحبان عقل کیلئے بڑی نشانیاں ہیں“ (طہ/ ۱۲۸)

۱۴۔ ”اور اگر ایسا نہ ہوتا کہ جب ان پر گزشتہ اعمال کی بناء پر کوئی مصیبت نازل ہوتی تو یہی کہتے کہ پروردگار تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہیں بھیجا کہ ہم تیری نشانیوں کی پیروی کرتے اور صاحبان ایمان میں شامل ہو جاتے“ (قصص/ ۴۷)

ان تمام آیات کے تحت خداوند متعال نے ہر زمانے میں اور ہر مکان میں موجود قوم کیلئے اپنی طرف سے حجت، نبی اور گواہ بھیجا ہے۔ یہ بات بھی تعداد انبیاء کی اس سند کو کمزور کرتی ہے۔ جسے علمائے اعتقاد بتاتے ہیں، ان آیات کریمہ سے ماخوذ نتیجہ یہ ہے کہ خداوند متعال انسان اور بشر کو بندہ خدا ہونے اور اس کی تابع ہونے کے بارے میں دلیل و حجت دیئے بغیر انھیں عذاب و سزا میں مبتلا نہیں کرتے یہ بات اپنی جگہ منطقی ہے ورنہ اصطلاح اصولی کے تحت ”فتح عقاب بلا بیان“ لازم آئے گا جو اپنی جگہ باطل ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے ہیں کہ وہ حجت ہمیشہ معصوم ہی ہوتا ہے، اگر ایسا فرض کریں گے تو طول زمان و مکان میں جہاں کسی نبی کی بعثت اور آمد ثابت نہیں ان کیلئے عذاب اور سزا ثابت کرنا مشکل ہوگا لہذا حجت خدا کو دو مرحلوں میں تقسیم کرنا پڑے گا ایک حجت معصوم منتخب الہی ہو اور دوسرا وہ حجت جو ان انبیاء کی نمائندگی کرتے ہوئے ہدایت اور رہبری

کرتے ہیں وہ خدا کی طرف سے خلق خدا کو خبر دیتے ہیں جب تک خلق خدا عقل و منطق سے ان ہادیان و رہبران و نمائندگان انبیاء کی دعوت کو مسترد نہیں کریں گے حجت ان پر تمام ہوگا، خدا کی طرف سے حجت کی ضرورت نزول شریعت کیلئے ہیں نزول شریعت کے بعد فروع شریعت میں انبیاء 'آئمہ' علماء خدا کے درگاہ اور مخلوق کے سامنے ہدایت اور رہبری کیلئے ذمہ دار ہیں گرچہ فضیلت اور برتری میں وہ ذوات علماء سے بلند و برتر اور مقدم ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام

حضرت آدم علیہ السلام

آدم کو آدم کہنے کے بارے میں علماء اور ماہرین لغت نے چند توجیہ پیش کی ہیں:

۱۔ بعض نے کہا ہے آدم کا رنگ گندمی تھا چونکہ آپ مٹی سے بنے تھے۔

۲۔ آدم مخلوط قسم کی مٹی سے بنے ہیں:

[ثم جمع سبحانه من حزن الارض وسهلها وعذبها وسبغها، تربة سنها] سناھا بالماء حتى خلصت، ولا ظلها بالبله حتى لزبت، فجعل منها صورة ذات احناء ووصول، اعضاء وفصول، اجمدها حتى استمسكت، واصلد هاجتي [فتمثلت] انسانا اذا ذهان يحيلها، وفكر يتصرف بها، وجوارح يستخدمها، وادوات يقلبها، ومعرفة يفرق بها بين الحق والباطل، والاذواق والمشام، والالوان والاحساس، ومعجونا بطينة الالوان المختلفة، والاشباه المولفة [المتفقة] والاضداد المتعادية، والاخلاط المتبانية، من الحرو البرد، والبله والحمود] ”اس کے بعد پروردگار نے زمین کے سخت و نرم اور شور و شیرین حصوں سے خاک کو جمع کیا اور اسے پانی سے اس قدر بھگوایا کہ بالکل خالص ہو گئی اور پھر تری میں اس قدر گوندھا کہ لیسہ آری بن گئی اور اس سے ایک ایسی صورت بنائی جس میں موڑ بھی تھے اور جوڑ بھی اعضاء بھی تھے اور جوڑ بند بھی پھر اسے اس قدر سکھایا کہ مضبوط ہو گئی اور اس قدر سخت کیا کہ کھٹکھٹانے لگی اور یہ صورت حال ایک وقت معین اور مدت خاص تک برقرار رہی جس کے بعد اس میں مالک نے اپنی روح پھونک دی اور اسے ایسا انسان بنا دیا جس میں ذہن کی جولائیاں بھی تھیں اور فکر کے تصرفات بھی کام

کرنے والے اعضاء و جوارح بھی تھے حرکت کرنے والے ادوات و آلات بھی حق و باطل میں فرق کرنے والی معرفت بھی تھی اور مختلف ذائقوں، خوشبوؤں، رنگ و روغن میں تمیز کرنے کی صلاحیت بھی اسے مختلف قسم کی مٹی سے بنایا گیا ہے جس میں موافق اجزاء بھی پائے جاتے تھے اور متضاد عناصر بھی اور گرمی، سردی، تری، خشکی جیسے کیفیات بھی“ (خطبہ ۱، جوادری، ص ۳۱)

۳۔ آدم ادا م سے ہے اور ادا م سان کو کہتے ہیں جو روٹی کے ساتھ کھایا جاتا ہے چونکہ آدم روح اور مٹی سے مخلوط مخلوق ہے۔

۴۔ آدم کا معنی موافقت، ملائمت اور مصالحت کے ہیں جس طرح انسان ایک دوسرے سے کہتے ہیں ”ادام اللہ بینہم“ خدا ان کے درمیان اصلاح کرے یا خدا آپکی اصلاح کرے۔ جس طرح انسان کیلئے کہتے ہیں کہ انسان ”انس“ سے ہیں۔ لفظ آدم قرآن میں پچیس (۲۵) بار تکرار ہوا ہے۔

اکثر و بیشتر علماء اہل سنت اور مفسرین کرام نے کلمہ آدم کو ایک فرد سے مختص کیا ہے علوم عربیہ میں جسے ”علم شخصی“ کہا جاتا ہے اس کے بالمقابل بعض علماء نے اسے ایک نوع مخلوق قرار دیا ہے یعنی یہ تمام انسانوں کا نام ہے اس نظریہ کے حامی افراد اپنے مدعا کی دلیل میں سورہ بقرہ کی آیت ۳۰ کا حوالہ دیتے ہیں، جس میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے، میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں اس آیت میں خداوند عالم نے تمام انسانوں کو خلیفہ قرار دیا ہے گویا یہاں خلیفہ سے مراد پوری نوع انسانی ہے کیونکہ ملائکہ نے اس خبر سے نوع ہی مراد لیتے ہوئے کہا تھا: اے باری تعالیٰ! کیا تو انھیں خلیفہ بنائے گا جو زمین میں فساد اور خونریزی کرتے پھریں گے کیونکہ فساد اور خونریزی فرد واحد سے عمل میں نہیں آتی بلکہ یہ ہمیشہ گردہ سے پیدا ہوتی ہے اس لئے اس نظریہ کے حامی علماء نے آدم سے مراد نوع انسانی کو لیا ہے اگر ہم اس خلافت آدم ”علم شخصی“ سے مختص کریں تو اسکے ثبوت کیلئے خداوند

متعال نے سورہ بقرہ آیت ۳۵ میں آدم سے فرمایا کہ تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو جہاں چاہیں جائیں لیکن اس درخت کے قریب نہ جائیں:

﴿وَقُلْنَا يٰٰدٰدِم اسكن انت وزوجك الجنة و كلا منها رغدا حيث شئتما ولا تقربا هذه

الشجرة﴾ ”اور ہم نے کہا: اے آدم! تم اور تمہاری زوجہ جنت میں قیام کرو اور اس

میں امن و سکون کے ساتھ جہاں چاہو کھاؤ اور اس درخت کے قریب نہ جانا“

اور پھر اللہ تبارک نے سورہ طہ کی آیت ۱۲۱ میں فرمایا آدم نے شیطان کی بات میں آ کر خدا کی عصیان و نافرمانی کی:

﴿وعصى ادم ربه فغوى﴾ ”اور آدم نے اپنے رب کے حکم میں کوتاہی کی تو غلطی میں

رہ گئے“ خدا نے آدم کو مٹی سے خلق کیا جیسا قرآن کریم کے ان آیات میں آیا ہے:

﴿انا خلقنهم من طين لازب﴾

”ہم نے انہیں لیس دار گارے سے پیدا کیا“ (صافات/۱۱) ﴿انسی خالق بشر﴾ ”انسی

طین﴾ ”مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں“ (ص/۷۱) سورہ آیت ۹۷۔

اللہ نے مٹی سے حضرت آدم کے جسمانی ڈھانچے کی شکل و صورت بنانے کے بعد اس میں نفخ روح کیا حسب آیات قرآن آدم کی خلقت کے بعد جو کو بھی خلق کیا گیا:

﴿الذی خلقکم نفس واحده وخلق منہا زوجھا واث منها﴾ ”جس نے تمہیں

ایک ذات سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا“ (آل عمران/۱) ﴿وہو الذی

انشاکم من نفس واحده﴾ ”اور وہی ہے جس نے تم سب کو ایک ہی ذات سے

پیدا کیا“ (انعام/۹۹)

پھر خدا نے ان دونوں کی ازدواجی زندگی سے نسل انسانی کو پھیلایا جیسا کہ سورہ حجرات آیت ۱۳ میں اسکا ذکر موجود ہے:

﴿انا خلقکم من ذکروا نسی﴾ ”ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا“

ان دو نظریات میں سے کسی ایک کو ترجیح دینا درست ہماری توانائی و قدرت سے باہر ہے ہم اس تفصیلی بحث میں وارد ہوئے بغیر حضرت آدمؑ سے متعلق چند مسائل پر بحث کرنے پر اکتفاء کریں گے، کیا آدم مقام نبوت پر فائز تھے، علماء و مفسرین اس سلسلے میں اختلاف نظر رکھتے ہیں۔

حضرت آدم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کریم میں:

سورہ سورہ نمبر آیت نمبر

بقرہ ۲ ۳۷، ۳۵، ۳۳، ۳۱

آل عمران ۳ ۵۹، ۴۳

مائدہ ۵ ۲۷

اعراف ۷ ۱۷۲، ۳۵، ۳۱، ۲۷، ۲۶، ۱۹، ۱۱

اسراء ۱۷ ۷۰، ۶۱

کہف ۱۸ ۵۰

مریم ۱۹ ۵۸

طہ ۲۰ ۱۲۱، ۲۰، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۵

یٰسین ۳۶ ۶۰

آدم علیہ السلام اور نبوت

ارباب تاریخ ماہرین و محققین مذاہب و ادیان اور محققین قصص انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے درمیان حضرت آدم علیہ السلام کے مقام و منصب کے بارے میں اختلاف نظر پایا جاتا ہے حضرت آدمؑ منصب نبوت پر فائز تھے یا نہیں اس اضطراب و اختلاف فکری کی برگشت قرآن میں موجود تین قسم کی آیات کریمہ کی طرف ہوتی ہے:

(۱) خلیفہ: اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی خلقت سے پہلے ان کے مقام و منصب کو خلافت سے یاد فرمایا ہے اور اسی خلافت ہی کی بنیاد پر وہ مجبوراً ملکہ قرار پائے، خلافت ایک ایسا بلند و بالا مقام ہے جو اگر نبوت سے بالاتر نہ ہو تو شاید کم بھی نہیں ہوگا قرآن کریم کی آیات کی روش سے خداوند متعال نے سلسلہ انبیاء میں سب سے پہلے حضرت آدمؑ کو منتخب کیا، اسی طرح ان کے طلب استغفار کے بعد ان کے مصطفیٰ ہونے کا ذکر ہے یہ آیت انسان کو اس یقین کی منزل سے قریب کرتی ہے کہ آدمؑ نبوت کے درجے پر فائز تھے ورنہ وہ ان القابات سے یاد نہ فرمائے جاتے، لیکن ان آیات میں آدمؑ کے مقام و مرتبہ کا تو ذکر ہے لیکن ان کی نبوت کے بارے میں صریح احکامات موجود نہیں ہیں۔

(۲) حضرت آدم علیہ السلام کو قرآن کریم کی متعدد آیات میں یاد کرنے کے باوجود کسی جگہ انہیں بحیثیت نبی یا انبیا کی یاد نہیں کیا گیا وہ ذات باری تعالیٰ جو ہر قسم کی بھول و نسیان سے پاک و منزہ ہے وہ حکمران سے اپنے کسی بندے کا ذکر کرے لیکن ایک دفعہ بھی نبوت کے حوالے سے یاد نہ کرے تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ شاید آدمؑ کو یہ مقام نہ ملا ہو اس کی تائید میں وہ آیت کریمہ بھی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ سلسلہ انبیاء کا آغاز حضرت نوحؑ سے کیا گیا ہے۔ جس سے یہ تصور اخذ کیا جاتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نہ تو مقام و مرتبہ نبوت پر فائز تھے اور نہ ہی شریعت جیسے آئین و دستور کے حامل تھے۔

(۳) نبی کی تعریف میں بیان کیا جاتا ہے، نبی خداوند عالم سے بغیر کسی واسطہ بشر کے ہدایت و رہنمائی لیتا ہے حضرت آدمؑ نے اللہ تعالیٰ سے امر بھی لئے اور نواہی بھی۔ انہیں میں کو تاہی کی وجہ سے انہیں بہشت سے نکلنا پڑا، آدم علیہ السلام نے یہ امر و نواہی کسی انسان کے توسط سے نہیں لئے، یہ یا تو خدا نے ان کے دل پر القا کیے یا کسی فرشتہ کے ذریعے ان تک پہنچے کیونکہ وہاں کوئی بشر نہیں تھا جو واسطہ بن جاتا اس حوالے سے ان پر نبی کی تعریف صادق آتی ہے لہذا حضرت آدم علیہ السلام

یقیناً نبوت کے مقام پر فائز تھے گرچہ رسالت و شریعت کے حامل نہ تھے۔ قارئین کرام یہ تھے حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت و رسالت کے بارے میں علماء کرام کے آراء و نظریات۔

ہماری علمی و فکری حیثیت اتنی نہیں کہ ان میں سے کسی ایک رائے کو ترجیح دیں اور نہ ہمیں قرآن سے ایسی کوئی آیت ملی ہے کہ جس کے ذریعے ہم ان میں سے کسی ایک نظریے پر ایمان کو ضروری قرار دے دیں جبکہ یہاں کسی ایک نظریے پر رائے قائم کرنا دین و شریعت کے حوالے سے ناگزیر ہے ہم اتنا ماننے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے مصطفیٰ و منتخب بندے تھے۔ جن شرائط کا حامل ہونا ایک نبی کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے، آیا آدم کیلئے بھی ان شرائط کا حامل ہونا ضروری ہے یا نہیں یہ نکتہ بھی اپنی جگہ حالت تردد میں باقی ہے نہ تو اس سے کوئی مثبت نتیجہ اخذ ہوتا ہے اور نہ ہی منفی۔

جن علماء و مفسرین نے حضرت آدم کو خدا کا ایک منتخب بندہ قرار دیا لیکن ان کے دوش کو بار نبوت سے خالی دکھایا ہے ان کا کہنا ہے کہ ابتدائی دور میں خدا نے بشر کو اسکی فطرت سلیم پر چھوڑا تا کہ وہ انتہائی سادہ زندگی گزارے اس نظریے کے حامی افراد سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۱۳ اور سورہ یونس ۱۹ سے استدلال کرتے ہیں۔ اس مدعا کی تائید میں انھوں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک روایت نقل کی ہے جسے صاحب مجمع البیان نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے اس روایت کے تحت امام فرماتے ہیں حضرت نوح سے پہلے لوگ فطرت کے راستے پر گامزن تھے انہیں نہ تو ہدایت یافتہ کہا جاسکتا تھا اور نہ ہی گمراہ اس کے بعد خدا نے بعثت انبیاء کا سلسلہ شروع کیا اسی طرح نبی البلاغہ کے پہلے خطبہ میں حضرت امیر فرماتے ہیں خدا نے آدم کے فرزندوں سے انبیاء کا انتخاب کیا اسی طرح سورہ شوریٰ کی آیت ۱۳ سے اس موقف کو تقویت ملتی ہے:

﴿يُشْرِعُ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا﴾ ”اس نے تمہارے لئے دین کا وہی

دستور معین کیا جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا“

اس موقف کو اپنانے سے آدم سے متعلق بہت سے اشکالات خود بخود رفع ہو جائیں گے جیسے

آدم کے شجرہ ممنوعہ سے تناول کے نتیجہ میں عصمت آدم کے بارے میں پیدا ہونے والے اشکال، بصورت دیگر ہمیں عصمت آدم کو متزلزل کرنے والی صریح آیات کے بارے میں کوئی ایسا راستہ تلاش کرنا پڑے گا جس سے باب اعتقاد میں ضرورت انبیاء کے بارے میں عقائد مخدوش نہ ہونے پائیں اور آیات میں وارد صریح کلمات سے بغیر کسی قرینہ لفظی و عقلی کے ایک معنی اخذ کئے جاسکیں دوسری بحث جو یہاں زیادہ مناسب ہے وہ بحث ابلیس ہے آدم کو متعین کردہ حدود و قیود سے خارج کرنے والی اور انھیں بہت سے مسائل اور پریشانیوں میں گرفتار کرنے والی اس قدرت کا کبھی تو خدا نے ابلیس کے نام سے ذکر کیا ہے اور کبھی شیطان کے نام سے۔ اس طاقت و قدرت کا مختلف شکل و صورت اور ناموں سے دیگر انبیاء کو بھی سامنا کرنا پڑا ہے۔

قصہ حضرت آدم چند عناصر سے مرکب ہے:

۱۔ خداوند متعال جس نے حضرت آدم کی تخلیق کا اعلان فرمایا۔

۲۔ مخلوقِ تراپی۔

۳۔ ملائکہ جنہوں نے اس نئی مخلوق کے بارے میں خدا سے خدشات کا اظہار کیا۔

۴۔ ابلیس جو کہ حسب قرآن کریم جنات سے تھا اس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔

۱۔ مَلِک: علماء لغت کہتے ہیں ملک مادۃ الوک سے ہے الوک یعنی صاحب رسالت بعد میں اسے

جزءِ کلہ قرار دیا اور بعض نے زائد۔ بہر حال ملک ”فرشتہ“ کو کہتے ہیں ملک کا ذکر قرآن کریم میں ۸۰

بار آیا ہے ملک کے معنی رسالت کے ہیں یعنی وہ خدا کی طرف سے خاص احکامات و پیغامات کا حامل

ہے چنانچہ سورہ حج/ ۵۷ میں خدا نے فرمایا کہ خدا اپنے پیغام رسانی کیلئے ملائکہ اور انسانوں دونوں

سے نمائندے انتخاب کئے ہیں:

﴿اللّٰهُ يَصْطَلِفِي مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رَسٰلًا وَمِنَ النَّاسِ﴾ ”اللہ فرشتوں اور انسانوں میں سے

پیغام پہنچانے والے منتخب کرتا ہے“

حقیقت ملائکہ

اکثر علماء کا عقیدہ ہے ملائکہ جسم نورانی کے حامل ہیں، اس کے علاوہ یہ مختلف شکلوں میں تبدیل ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں جیسا کہ قصہ حضرت ابراہیم ہود/۶۹‘ ملائکہ کی صفات:

۱۔ ملائکہ اللہ تعالیٰ کے پیغام رساں ہیں:

﴿جاعل الملائكة رسلا﴾ ”نیز فرشتوں کو پیغام رساں بنانے والا ہے“ (فاطر/۱)

۲۔ ملائکہ خداوند عالم کے مطیع و فرمانبردار ہیں:

﴿ونحن نسبح بحمدك ونقدس لك﴾ ”جبکہ ہم تیری حمد و ثنا کی تسبیح اور تیری پاکیزگی کا ورد کرتے رہتے ہیں“ (بقرہ/۳۰) سافات ۱۶۵، ۱۶۶۔

۳۔ اللہ تبارک تعالیٰ کے قریب ہیں:

﴿وله من في السموات والارض ومن عنده لا يستكبرون﴾

”اور آسمانوں اور زمین میں موجود مخلوقات اسی کی ہیں اور جو اس کے پاس ہیں وہ اللہ کی عبادت سے نہ تو تکبر کرتے ہیں“ (انبیاء/۱۹)

۴۔ امر خدا کے علاوہ کوئی کام نہیں کرتے:

﴿وما ننزل الا امرا ربك﴾ ”اور ہم (فرشتے) آپ کے پروردگار کے حکم کے بغیر نہیں اتر سکتے“ (مریم/۶۳) انبیاء/۲۷۔

۵۔ صاحبان قدرت و سلطنت ہیں:

﴿والملك على ارجاءها ويحمل عرش ربك فوقهم يومئذ ثنية﴾ ”اور فرشتے اس کے کناروں پر ہونگے اور اس دن اٹھ فرشتے آپ کے رب کا عرش ان سب کے

اوپر اٹھائے ہوں گے“ (حاق/ ۱۷) بقرہ ۲۵۵۔

۶۔ اللہ تبارک تعالیٰ سے خوف کھاتے ہیں اور لغزشوں سے ڈرتے ہیں:

﴿يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ﴾ ”اور اپنے رب سے جو ان پر بالادستی رکھتا ہے ڈرتے

ہیں“ (نمل/ ۵۰) انبیاء ۲۸، سہاء ۲۳۔

ملائکہ انبیاء کو پیغام دیتے ہیں اور انبیاء لوگوں تک پہنچاتے ہیں انکی خلقت کس چیز سے ہے اس کا ذکر قرآن کریم میں نہیں آیا ہے قرآن کریم میں ملائکہ کے جن وظائف و ذمہ داریوں کا ذکر آیا ہے وہ ان آیات میں آیا ہے:

عصمت ملائکہ

﴿مَلَائِكَةٌ غِلَاطٌ شِدَادٌ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾ ”اس

پر تند خواہ اور سخت مزاج فرشتے مقرر ہیں جو اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم

انھیں ملتا ہے اسے بجالاتے ہیں“ (تحریم/ ۶)

ملائکہ الہی خداوند متعال کی عبادت و بندگی میں معصوم ہیں:

﴿وَقَالُوا اتَّخَذُوا الرَّحْمَنَ وَلَدًا سُبْحَنَهُ بَلْ عِبَادٌ مُكْرَمُونَ لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُمْ

بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ﴾ ”اور وہ کہتے ہیں: اللہ نے بیٹا بنایا ہے وہ پاک ہے (ایسی باتوں

سے) بلکہ یہ تو اللہ کے محترم بندے ہیں۔ وہ تو اللہ (کے حکم) سے پہلے بات

(بھی) نہیں کرتے اور اسی کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں“ (انبیاء/ ۲۷، ۲۸) ﴿عَلَيْهِمْ مَقْفَةٌ

غِلَاطٌ شِدَادٌ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾ ”اس پر تند خواہ اور سخت

مزاج فرشتے مقرر ہیں جو اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم انھیں ملتا ہے

اسے بجالاتے ہیں“ (تحریم/ ۶)

[ثُمَّ فَتَنَّا مَائِينَ السَّمَوَاتِ الْعُلَا، فَمَلَّاهُنَّ أَطْلُو أَرَامُنَ مَلَائِكَةً، مِنْهُمْ

مسحود لا یرکعون، و رکوع لا یتصبون، و صافون لا یزایلون، و مسحون
 لا یستامون، لا یغشاهم نوم العیون، و لاسہور العقول، و لا فترۃ الابدان، و لا غفلۃ
 النسیان۔ و منهم امناء علی و حیہ و السنۃ الی رسلہ، و مختلفون [مترددون] بقائہ
 و امرہ، و منهم الحفظۃ لعبادہ، و السدۃ [السندۃ] لا یواب حنانه۔ و منهم الثابۃ فی
 الارضین السفلی اقدامہم، و المارۃ من السماء العلیا اعتناہم، و الخارجۃ من
 الاقطار ارکانہم، و المناسیۃ لقوائم العرش اکتافہم۔ ناکسۃ دونہ ابصارہم،
 متلفعون تحیہ باجنحتہم، مضروبۃ بینہم و بین من دونہم حجب
 العزۃ، و استار القدرۃ۔ لا یشوہمون ربہم بالتصویر، و لا یحرون علیہ صفات
 المصنوعین [المخلوقین] و لا یحدونہ بالاماکین، و لا یشیرون الیہ
 بالنظر [”پھر اس نے بلند ترین آسمانوں کے درمیان شکاف پیدا کیے اور انہیں طرح
 طرح کے فرشتوں سے بھر دیا جن میں سے بعض سجدہ میں ہیں تو رکوع کی نوبت نہیں
 آتی ہے اور بعض رکوع میں ہیں تو سر اٹھاتے ہیں اور بعض صف باندھے ہوئے ہیں تو
 اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتے ہیں بعض مشغول تسبیح ہیں تو خستہ حال نہیں ہوتے ہیں
 سب کے سب وہ ہیں کہ نہ ان کی آنکھوں پر نیند کا غلبہ ہوتا ہے اور نہ عقولوں پر سہو
 نسیان کا۔ نہ بدن میں سستی پیدا ہوتی ہے اور نہ دماغ میں نسیان کی غفلت۔

ان میں سے بعض کو وحی کا امین اور رسولوں کی طرف قدرت کی زبان بنایا گیا ہے جو
 اس کے فیصلوں اور احکام کو برابر لاتے رہتے ہیں اور کچھ اس کے بندوں کے محافظ اور
 جنت کے دروازوں کے دربان ہیں اور بعض وہ بھی ہیں جن کے قدم زمین کے آخری
 طبقہ میں ثابت ہیں اور گرونیس بلند ترین آسمانوں سے بھی باہر نکلی ہوئی ہیں ان کے
 اطراف بدن اقطار عالم سے وسیع تر ہیں اور ان کے کاندھے پایہ ہائے عرش کے

اٹھانے کے قابل ہیں ان کی نگاہیں عرش الہی کے سامنے جھکی ہوئی ہیں اور وہ اس کے نیچے پروں کو سمیٹے ہوئے ہیں ان کے اوپر دیگر مخلوقات کے درمیان عزت کے حجاب اور قدرت کے پردے حائل ہیں وہ اپنے پروردگار کے بارے میں شکل و صورت کا تصور بھی نہیں کرتے ہیں اور نہ اس کے حق میں مخلوقات کے صفات کو جاری کرتے ہیں وہ نہ اسے مکان میں محدود کرتے ہیں اور نہ اس کی طرف اشاہ و نظائر سے اشارہ کرتے ہیں“ (خطبہ ۱)

ملائکہ مام کسی قسم کی سستی و نافرمانی سے محفوظ ہیں۔ انسان کے عصیان و نافرمانی کی طرف مائل ہونے کی وجہ اس کی خواہشات جسمانی و نفسانی ہیں جبکہ ملائکہ اس سے محفوظ ہیں۔ یہاں سے فطروس کے بارے میں جو کہا جاتا ہے کہ اس نے خدا کی نافرمانی کی تو خدا نے اس پر عذاب نازل کیا اس کے پر جل گئے وہ ایک جزیرے میں گر گیا اور امام حسینؑ کی ولادت باسعادت کے موقع پر جبرئیل امینؑ خدا کی طرف سے تہنیت دینے آرہے تھے تو جبرئیل کا گزر اس جزیرے سے ہوا تو جبرئیل اسے پیغمبر کی خدمت میں لے گئے اور اس کے پروں کو حضرت امام حسینؑ کے گہوارے سے مس کیا تو وہ صحت یاب ہو گئے اور جبرئیل امینؑ کے ساتھ ملاء اعلیٰ کی طرف پرواز کر گئے۔ یہ خود ساختہ واقعہ جعل کرنے والوں نے داستانوں اور کہانیوں کو بنیاد بناتے ہوئے قرآن و سنت سے دوری اختیار کی ہے۔

ہمارے ہاں فضائلِ آئمہ کے نام سے نقائصِ آئمہ اور توہینِ آئمہ کا ارتکاب کرنے کیلئے ایسی بہت سی احادیث اور واقعات فراوانی سے ملتے ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ مذہب ہر آئے دن عقلیت سے گریبا ہے کیا یہ ممکن ہے جو ملائکہ حاملانِ عرش پر فائز ہوں وہ ایسی نافرمانی کریں اسی طرح ملائکہ کے پروں کا جو ذکر ہے وہ ان کے آسمان سے نیچے اترنے کے معنوں کے حوالے سے ہے نہ کہ وہ پرندوں جیسے پر رکھتے ہیں

اقسام ملائکہ:

ملائکہ اپنی ذمہ داریوں کے حوالے سے مختلف درجات اور مراتب کے حامل ہیں ہم ان کی چند اقسام ذیل میں پیش کرتے ہیں:

۱۔ بلند ترین درجے پر فائز ملائکہ جبرائیل امین ہے جبرائیل تمام ملائکہ سے بلند مقام و مرتبہ کے حامل ہیں:

﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ۔ عَلَى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ﴾ ”جسے روح الامین نے اتارا۔ آپ کے قلب پر تاکہ آپ تنبیہ کرنے والوں میں سے ہو جائیں“ (شعراء/۱۹۲، ۱۹۳) ﴿وَإِنَّ لِقَوْلِ رَسُولٍ كَرِيمٍ﴾ ”کہ یقیناً یہ (قرآن) معزز فرستادہ کا قول ہے“ (عنکبوت/۱۹) ﴿بِقَوْلِهِ ۹۸ تَجْرِمُ ۵۳ مَائِدَهُ ۱۱۰ آتِلْ عُرَانِ ۱۲۳﴾

انہیں اکابر و عملا ملائکہ میں حضرت جبرائیل امین شامل ہیں

۲۔ اسرافیل اور میکائیل بڑے ملائکہ میں سے ہیں:

﴿وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ نَفَخَ فِيْهِ اَنْحٰرٰی فَاذٰهُمْ يَخِيَامُ يَنْظُرُوْنَ﴾ ”اور (جب) صور پھونکا جائے گا تو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سب بیہوش ہو جائیں گے مگر جنہیں اللہ چاہے پھر دوبارہ پھونکا جائے گا تو اتنے میں وہ سب کھڑے ہو کر دیکھنے لگیں گے“ (زمرہ/۶۸) ﴿وَيَوْمَ يَنْفُخُ فِي الصُّوْرِ فَفَرَّعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ وَكُلُّ اَتَوْهَ دَاخِرِيْنَ﴾ ”اور جس روز صور پھونکا جائے گا آسمانوں اور زمین کی تمام موجودات خوفزدہ ہو جائیں گے سوائے ان لوگوں کے جنہیں اللہ چاہے اور سب نہایت عاجزی کے ساتھ اس کے حضور میں پیش ہو گئے“ (نمل/۸۷)

۳۔ عرش الہی کو اٹھانے والے ملائکہ سب سے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں:

﴿وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَنِيَّةٌ﴾ ”اور اس دن آٹھ فرشتے آپ کے رب کا عرش ان سب کے اوپر اٹھائے ہونگے“ (حاقہ/۱۷) ﴿الَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ﴾ ”جو فرشتے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں“ (غافر/۷)

۴۔ ان کے بعد وہ فرشتے ہیں جو عرش کے گرد طواف کرتے ہیں:

﴿وَنُورِي الْمَلَائِكَةَ حَافِينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ﴾ ”اور آپ فرشتوں کو عرش کے گرد حلقہ باندھے ہوئے اپنے رب کی ثناء کے ساتھ تسبیح کرتے دیکھیں گے“ (زمر/۷۵)

۵۔ قرآن کریم میں جن ملائکہ کا چوتھے درجے پر ذکر ہوا ہے وہ خازن جنت ہیں، خازن جنت کا ذکر سورہ عدد کی آیت ۲۲، ۲۳ میں ہے:

﴿حُفَّتْ عَدْنٌ يَدْخُلُونَهَا مِنْ صُلْحٍ مِنْ ابْنائِهِمْ وَازْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّهِمْ وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ۔ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ﴾ ”ایسی دائمی جنتیں ہیں جن میں وہ خود بھی داخل ہونگے اور ان کے آباء اور بیویوں اور اولاد میں سے جو نیک ہونگے وہ بھی اور فرشتے ہر دروازے سے ان کے پاس آئیں گے (اور کہیں گے) تم پر سلامتی ہو یہ تمہارے صبر کا صلہ ہے پس عاقبت کا گھر کیا ہی عمدہ گھر ہے“

۶۔ خازن جہنم کا ذکر سورہ تحریم کی آیت ۶ میں ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَظٌ شِدَادٌ﴾ ”اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہونگے اس پر تند خور سخت مزاج فرشتے مقرر ہیں“

۷۔ انسانوں پر مومل فرشتے:

﴿لَهُ مَعْقِبَتٌ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يُحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ﴾ ”ہر شخص کے آگے اور پیچھے یکے بعد دیگرے آنے والے فرشتے (پہرے دار) مقرر ہیں جو تکلم خدا اس کی حفاظت کرتے ہیں“ (رعد/۱۱) ق ۱۷،

۸۔ وہ ملائکہ جو اطراف عالم کے موکل ہیں:

﴿وَالصَّافَّاتُ صَفًّا ۖ فَالزَّاجِرَاتُ زَجْرًا ۖ فَالتَّلَاتِيتُ ذُكْرًا﴾ ”قسم ہے قطار میں صف باندھنے والوں کی۔ پھر بطور کامل جھڑکی دینے والوں کی۔ پھر ذکر کی تلاوت کرنے والوں کی“ (سافات/۳۲۱)

۹۔ محافظین انسان:

﴿وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً﴾ ”اور تم پر نگہبانی کرنے والے بھیجتا ہے“ (انعام/۶۱)
﴿لَهُ مَعْقِبَتٌ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يُحْفَظُونَهُ﴾ ”ہر شخص کے آگے پیچھے یکے بعد دیگرے آنے والے فرشتے (پہرے دار) مقرر ہیں“ (رعد/۱۱)

۱۰۔ وحی لانے والے:

﴿فَنَادَاهُ الْمَلَكُ ۖ هُوَ قَائِمٌ يَصْلِي فِي الْمِحْرَابِ ۖ إِنَّ اللَّهَ بِبَشَرِكِ يَعْنِي﴾ ”چنانچہ جب وہ حجرہ عبادت میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے تو فرشتوں نے آواز دی: اللہ تجھے عیسیٰ کی بشارت دیتا ہے“ (آل عمران/۳۹) ج ۵/۷۵

۱۱۔ انسانوں کے اعمال نامہ لکھنے والے:

﴿أَذْيَلُ الْمُنَافِقِينَ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ ۚ مَا يَلْفَظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ ”(انھیں وہ وقت یاد دلا دیں) جس وقت (اعمال کو) وصول کرنے والے دو (فرشتے) اس کی دائیں اور بائیں طرف بیٹھے وصول کرتے رہتے ہیں۔ (انسان) کوئی بات زبان سے نہیں نکالتا مگر یہ کہ اس کے پاس ایک نگران

تیار ہوتا ہے“ (ق/۱۸، ۱۷) ﴿قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا﴾ ان رسالہ ای کتبوں
 مستمکروں ﴿﴾ ”کہہ دیجئے: اللہ کا حیلہ تم سے زیادہ تیز ہے بے شک ہمارے فرشتے
 تمہاری حیلہ بازیاں لکھ رہے ہیں“ (یونس/۲۱)

۱۲۔ انسانوں کو موت کا پیغام دینے کی ذمہ داری ملائکہ کے سپرد ہے:

﴿قُلْ يٰٓمُؤْمِنُوْا مَلِكُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وَکَلْ بِکُمْ﴾ ”کہہ دیجئے: موت کا فرشتہ جو تم
 پر مقرر کیا گیا ہے تمہاری رو جس قبض کرتا ہے“ (سجده/۱۱) ﴿عَلٰی ۲۸﴾

قصہ حضرت آدم علیہ السلام میں تیسرا فریق ابلیس ہے چونکہ ابلیس حسب سورہ کہف آیت ۵۰
 مخلوق جن سے تعلق رکھتا تھا لہذا ہمیں یہاں ”جن“ سے متعلق بھی کچھ گفتگو کرنا ہوگی۔

جن:

”جن“ جسے فارسی میں پری کہتے ہیں اس کے بارے میں علماء کا کہنا ہے جن بھی ارواح مجرد کے
 مالک ہیں یہ عنصریات میں تصرف رکھتے ہیں۔ بعض فلاسفہ کا خیال ہے کہ جن ایک تصوراتی چیز ہے
 اور حقیقت میں ان کا کوئی وجود نہیں چنانچہ ابوعلی سینا کی طرف نسبت دی گئی ہے کہ جن ایک حیوان
 ہوائی ہے اور یہ مختلف شکل اختیار کرتا ہے یہ شرح اسم ہے یعنی جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے جبکہ
 ارباب مذاہب اور وادیان کا عقیدہ ہے کہ جن ایک مخلوق ہے جو اس دنیا میں موجود ہیں انھیں
 ارواح ”سفلیہ“ کہتے ہیں جن بھی موجودات ذی العقول ہیں اور خود کو مختلف شکلوں میں تبدیل
 کر سکتے ہیں، جن مادہ جن سے ہے جس کے معنی پوشیدہ کے ہیں یعنی جن آنکھوں سے نہیں دیکھے
 جاسکتے لہذا بعض افراد جن چیزوں کا سبب معلوم نہیں کر سکتے۔ یا معلوم نہیں ہو سکتا انھیں وہ جن کی
 طرف نسبت دے دیتے ہیں:

﴿وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَکَآءَ الْحَنَ وَخَلَقَهُمْ﴾ ”اور ان لوگوں نے جنات کو اللہ کا شریک

بنایا حالانکہ اس نے انھیں پیدا کیا ہے“ (انعام/۱۰۰)

یہ جو کہا جاتا ہے جن وسوسہ ڈالتے ہیں، یہ بات صحیح نہیں کیونکہ اس کے صحیح ماننے سے دور لازم آئے گا کیونکہ انسانوں کو اور غلامانے کے لئے شیطان کو پہلے خود معصیت کا رہنا چاہیے جس کیلئے خود شیطان کے لئے بھی وسوسہ درکار ہے تاکہ بعد میں وہ معصیت کا ارتکاب کرے۔ جب تک شیطان کے پاس معصیت نہ ہو، اس وقت تک وہ انسان کے اندر وسوسہ پیدا نہیں کر سکتا لہذا ماننا پڑے گا کہ کوئی گروہ ہے کہ جو خدا کی بندگی اور عبادت سے پہلے خود نکل چکا ہوگا جو بندگان خدا کو گمراہ کرتا ہے۔

کلمہ نم ”جن“ قرآن کریم میں بائیس بار تکرار ہوا ہے۔ قرآن کریم میں ”جن“ سے متعلق آیات سے علماء کرام نے مندرجہ ذیل نکات اخذ کیے ہیں:

- ۱۔ جن آگ سے بنے ہیں جیسا کہ سورہ حجر آیت ۲۷ اور سورہ الرحمن کی آیت ۱۵ میں آیا ہے:
﴿وَالْحَا۟نَ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلِ مَنْ نَارِ الْمَسْمُو۟مِ﴾ ”اور اس سے پہلے ہم لو (گرم ہوا) سے جنوں کو پیدا کر چکے تھے“ (حجر/۲۷) ﴿وَعَلَقَ الْحَا۟نَ مِنْ مَّارِجٍ مِنْ نَارٍ﴾ ”اور جنات کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا“ (رحمن/۱۵)
- ۲۔ جن اور انسان دونوں اس روئے زمین پر حسب تعبیر سورہ الرحمن دو مخلوقات ہیں اور دونوں مورد خطاب الہی ہیں۔

- ۳۔ جن انسانوں کی طرح خداوند عالم کی طرف سے مکلف بہ عبادت و بندگی ہیں:
﴿وَمَا عَلَّمْتُ الْحٰنَ وَالْاِنْسَ الْاِلٰیْعِبٰدُو۟نَ﴾ ”اور میں نے جن و انس کو خلق نہیں کیا مگر یہ کہ وہ میری عبادت کریں“ (ذاریات/۵۶)

- ۴۔ جنات میں بھی انسانوں کی طرح گناہگار اور کافر و مشرک ہیں ان میں بھی اہل جہنم ہیں:
﴿وَلَقَدْ ذَرٰۤاْنَا الْحٰنَ کَثِیْرًا مِّنَ الْاِنْسِ﴾ ”اور تحقیق ہم نے جن و انس کی ایک

کثیر تعداد کو (گویا) جہنم ہی کیلئے پیدا کیا ہے“ (اعراف/ ۱۷۹) ہودہ ۱۱۹، بقرہ ۱۳۰،

۵۔ جن بھی انسانوں کی طرح مرتے ہیں اور مرنے والوں کی جگہ نئے گروہ آتے رہتے ہیں:

﴿قَالَ ادْخُلُوا فِي امِّمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِنَ الْحَنِّ وَالْأَنَسِ﴾

”اللہ فرمائے گا: تم لوگ جن و انس کی ان قوموں کے ہمراہ جہنم میں داخل ہو جاؤ جو تم

سے پہلے جا چکی ہے“ (اعراف/ ۳۸) فصلت ۱۰۴۵، انفاس ۱۸،

۶۔ جن انسانوں کو دیکھ سکتے ہیں لیکن انسان اُن کو نہیں دیکھتے:

﴿وَأَنَّهُ يَرْكُمُ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ﴾

”بے شک شیطان اور ان کے رفیق کار تمہیں ایسی جگہ سے دیکھ رہے ہوتے ہیں

جہاں سے انہیں تم نہیں دیکھ سکتے“ (اعراف/ ۲۷)

۷۔ جن انسانوں کی طرح کام کرتے ہیں اور قدرت کے حامل ہیں:

﴿وَمِنَ الْحَنِّ مَن يَعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِأَذْنِ رَبِّهِ﴾

”اور جنوں میں سے بعض ایسے تھے جو اپنے رب کی اجازت سے سلیمان کے آگے

کام کرتے تھے“ (سبا/ ۱۲) سبا ۱۳، نمل ۱۷، ۳۹، ۱۷۔

۸۔ جن شادی کرتے ہیں اور اسی طرح ان کی نسل پھیلتی ہے:

﴿كَأَن مِّنَ الْحَنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ فَتَنَحَّلُوهُ وَذُرِّيَّةَ أُولَآئِكَ﴾

”وہ جنات میں سے تھائیں وہ اپنے رب کی اطاعت سے خارج ہو گیا تو کیا تم لوگ میرے سوا اسے

اور اسکی نسل کو اپنا سرپرست بناؤ گے“ (کہف/ ۵۰)

۹۔ جن پیغمبر اکرم پر ایمان لائے:

﴿وَأَذْصَرْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْحَنِّ يَسْتَمْعُونَ الْقُرْآنَ فَلَمَّا حَضَرُوهُ

قَالُوا انصتوا فلما قضى ولو إلى قومهم منذرين.....﴾

”اور (یاد کیجئے) جب ہم نے جنات کے ایک گروہ کو آپ کی طرف متوجہ کیا تا کہ قرآن سنیں، پس جب وہ رسول کے پاس حاضر ہو گئے تو (آپس میں) کہنے لگے: خاموش ہو جاؤ! جب تلاوت ختم ہو گئی تو وہ تنبیہ (ہدایت) کرنے اپنی قوم کی طرف واپس لوٹ گئے“ (احقاف/۳۱ تا ۳۹) جن/۵۲۱۔

۱۰۔ سورہ رومن میں اللہ تعالیٰ نے اکتیس بار جن وانس سے مشترکہ خطاب فرمایا ہے۔

۱۱۔ جنوں میں بھی مذکر و مؤنث ہوتے ہیں:

﴿سَبِخْنَ الذی علق الاِزواج کلہا﴾ ”پاک ہے وہ ذات جس نے تمام جوڑے بنائے“ (نہین/۳۶) ﴿وانہ کسان رجال من الانس یعوذون برجال من الجن فزادوہم رجلاً﴾ ”اور یہ کہ بعض انسان بعض جنات سے پناہ طلب کیا کرتے تھے جس سے جنات کی سرکشی مزید بڑھ گئی“ (جن/۶) ذاریات/۳۹۔

۱۲۔ جن جب چاہیں ایسی جسمانی شکل میں آ سکتے ہیں کہ انسان انھیں دیکھ سکے:

﴿قال عمریت من الجن انا انیک بہ قبل ان تقوم من مقامک واتی علیہ لقوی امین﴾ ”جنوں میں سے ایک عیار نے کہا: میں اسے آپ کے پاس حاضر کر دیتا ہوں قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں اور میں یہ کام انجام دینے کی طاقت رکھتا ہوں امین بھی ہوں“ (نمل/۲۹)۔

ابلیس: مادہ بلس سے ہے یہ ابلاس سے لیا ہے اور ابلاس مایوس ہونے کو کہتے ہیں جیسا کہ سورہ روم کی آیت ۱۲ میں آیا ہے کہ بروز قیامت جب گناہ گار اپنے گناہوں کے اسباب و وجوہات پیش کرنے سے قاصر ہو جائیں گے تو وہ مایوس ہو جائیں گے:

﴿ویوم تقوم الساعة یلسس المجرمون﴾ ”جس روز قیامت برپا ہوگی مجرمین

ناامید ہوں گے“

راغب اصفہانی ابلاس کے معنوں میں لکھتے ہیں ان پریشان کن اور تکلیف دہ حالات کو ابلاس کہتے ہیں جو انسان کو سختی اور مشکلات و پریشانی کی صورت میں لاحق ہوتی ہے دیکھی انسان اکثر و بیشتر خاموش رہتا ہے کیونکہ اسے کامیابی نظر نہیں آتی وہ ہمیشہ حیرت و پریشانی میں سرگرداں رہتا ہے:

﴿وَاتُوا اخذنہم بغتۃ فاذا ہم مبسوءن﴾ ”تو ہم نے اچانک انھیں اپنی گرفت میں لے لیا پھر وہ مایوس ہو گئے“ (انعام/۴۴)

جو ابلیس حضرت آدم کے مقابلے میں آیا وہ ایک موجود زندہ اور باشعور لیکن نامرئی اور فریب کار تھا قرآن میں گیارہ جگہوں پر اسے ابلیس کے نام سے پکارا گیا ہے جبکہ باقی جگہوں پر اسے شیطان کہا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے ابلیس کسی فرد کا مخصوص نام ہے یا یہ اس کی صفت ہے جو اسکے نام گزاری کی وجہ بنی ہے بعض افراد کا کہنا ہے ابلیس اسکی صفت ہے جو اس کے نام پر غالب آئی ہے اور اسکا اصلی نام ازازیل ہے امام رضا سے ایک روایت نقل ہوئی ہے جس کے تحت اس کا نام حارث تھا سورہ کہف کی آیت ۵۰ کے مطابق ابلیس مخلوق جن سے تعلق رکھتا تھا: ﴿فسجدوا لا ابلیس کان منالحن﴾ ”سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے وہ جنات میں سے تھا“

اور یہ موجود نامرئی اور خفیف ہونے میں ملائکہ سے قریب ہے اللہ تبارک تعالیٰ نے جب آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو یہ حکم عدولی کرنے کی وجہ سے خدا کی طرف سے فاسق اور راندہ درگاہ قرار پایا یہ تھیں شیطان کی شخصی صفات آئیے دیکھتے ہیں اس کی نوعی صفات کیا ہیں۔

شیاطین جن و انس مومن کے مقابل ضعیف ہیں:

شیطان انسان سے زیادہ طاقت ور نہیں بعض انسان اپنے نفس امارہ و خواہشات کی پیروی، ضلالت و گمراہی اور جرم و جنایت میں خود کو شیطان کے سامنے بے بس پیش کرتے ہیں جبکہ خداوند متعال نے شیطان کو ارادہ انسان کے مقابلے میں ضعیف و ناتواں کہا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات

کس درجے پر فائز تھے اس سلسلہ میں یہ کلمہ جہاں استعمال ہوا ہے وہاں سے مدولینے کی ضرورت ہے خداوند عالم نے خلافت کی کیا تشریح و تفسیر کی ہے، اس کی حدود کیا ہے، اس طرح اسکی کیا ذمہ داریاں ہیں یہ تمام نکات بحث طلب ہیں۔

خلافت: خلافت مادہ خلف سے ماخوذ ہے جس کے معنی پیچھے کے ہیں:

﴿وَمَا خَلَفَهُمْ﴾ ”جو کچھ ان کے پیچھے ہے“ (بقرہ/۲۵۵) ﴿فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ﴾

”پھر ان کے بعد“ (اعراف/۱۶۹) فرقان/۶۲، مائدہ/۳۳۔

خلافت کی انواع ہیں:

۲۔ خلافت قوم کے پیچھے:

﴿وَإِذْ كَرَّوْا لِيُخْلِفَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ﴾ ”اور یاد کرو جب اس نے قوم نوح

کے بعد تمہیں جانشین بنایا“ (اعراف/۶۹) ﴿وَإِذْ كَرَّوْا لِيُخْلِفَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ

بَعْدِ عَادٍ وَابْنُ آدَمَ فِي الْأَرْضِ﴾ ”اور (وہ وقت) یاد کرو جب اللہ نے قوم عاد کے

بعد تمہیں جانشین بنایا اور تمہیں زمین آباد کیا“ (اعراف/۷۴) ﴿وَيُخْلِفُكُمْ خُلَفَاءَ

الْأَرْضِ﴾ ”اور تمہیں زمین میں جانشین بناتا ہے؟“ (نمل/۶۲) ان آیات کریمہ سے

پتہ چلتا ہے اسراء/۷۶، توبہ/۸۱۔

۳۔ خلافت مومنین:

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيُخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ

كَمَا خَلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ

مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا﴾ ”تم میں سے جو لوگ ایمان

لے آئے ہیں اور نیک اعمال بجالائے ہیں اللہ نے ان سے وعدہ کر رکھا ہے کہ انھیں

زمین میں اسی طرح جانشین ضرور بنائے گا جس طرح ان سے پہلوں کو جانشین

بنایا اور جس دین کو اللہ نے پسندیدہ بنایا ہے اسے پائیدار ضرور بنائے گا اور انھیں خوف کے بعد امن ضرور فراہم کرے گا وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں“ (نور/۵۵) انعام ۷۵ بقرہ ۳۰

۳۔ خلافت خاص جیسے حضرت داؤد کی خلافت:

﴿انسی حاسل فی الارض خلیفۃ﴾ ”میں زمین میں ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں“ (بقرہ/۳۰)

اهداف و مقاصد خلافت:-

۱۔ تعمیر و آبادی زمین:

﴿هو انشا کم من الارض واستعمرکم﴾ ”اسی نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور اس

میں آباد کیا“ (ص/۶۱) (سورہ اعراف ۱۷۹-۱۷۸)

۲۔ تسبیح و تقدیس:

﴿ونحن نسبح بحمدک ونقدس لک﴾ ”جبکہ ہم تیری حمد و ثنا کی تسبیح اور تیری

پاکیزگی کا ورد کرتے رہتے ہیں“ (بقرہ/۳۰)

۳۔ نفاذ اجراء شریعت الہی: یہاں خلافت سے مراد خلافت الہی اور قیادت ورہبری ہے جس کے

اپنے تقاضے ہیں جن میں علم اور حقیقت شناسی شامل ہے اس لئے خداوند عالم نے فرمایا:

خدا نے حضرت داؤد سے فرمایا ہم نے آپ کو زمین پر خلیفہ بنایا ہے آپ لوگوں میں حق پر فیصلہ

کریں:

﴿یندالودنا جعلناک خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الہوی

فیضلك عن سبیل اللہ﴾ ”اے داؤد! ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا لہذا لوگوں

میں حق کے ساتھ فیصلہ کریں اور خواہش کی پیروی نہ کریں وہ آپ کو اللہ کی راہ

بھٹکا دے گی“ (ص ۲۶)

یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ خلافت کا دوسرا مقصد حق و انصاف کو رواج دینا ہے۔

۳۔ خداوند عالم نے سورہ نور ۵۵ میں فرمایا ہے کہ خلافت کی اعلیٰ و ارفع ذمہ داریوں میں زمین پر ہر قسم کے شرک و کفر اور بت پرستی کا خاتمہ اور ایمان، توحید اور عمل صالح اور خدا پرستی کا بول بالا کرنا قرار دیا ہے:

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ
كَمَا اسْتَخْلَفْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ
مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا﴾ ”تم میں سے جو لوگ ایمان
لے آئے ہیں اور نیک اعمال بجالائے ہیں اللہ نے ان سے وعدہ کر رکھا ہے کہ انھیں
زمین میں اسی طرح جانشین ضرور بنائے گا جس طرح ان سے پہلوں کو جانشین
بنایا اور جس دین کو اللہ نے پسندیدہ بنایا ہے اسے پائیدار ضرور بنائے گا اور انھیں خوف
کے بعد امن ضرور فراہم کرے گا وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ
ٹھہرائیں“

حضرت آدم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو قسم کی خلافت کی نمائندگی ہے۔ ایک خالق کی خلافت کی نمائندگی
ہے اور دوسرا خلافت عدل و انصاف کی نمائندگی ہے خلافت نوعیت میں فتنہ و فساد خون ریزی ہے
جیسے خداوند متعال نے ملائکہ کو مسخر نہیں کیا۔ لیکن وہ خلافت انبیاء و مومنین کی خلافت ہے اس
حوالے سے آدم کو اپنا صلی قرار دیا ہے:

جرۃ ممنوعہ:

دین و دیانت داروں کے دل پر بننے والے کفر کے جال کی ایک علت غیر مفید حکمتوں اور غیر
ضروری معلومات کی تلاش کا آوری ہے انسان اس دنیا میں جن بتوں کے سامنے سرگموں ہوا ہے ان

میں سے ایک بت، بت معلومات ہے جمع معلومات کو اچھا اور مقدس کام گردانا گیا ہے یہیں سے انسان بے راہ روی اور گمراہی و ضلالت کی طرف گیا، بت معلومات کے سامنے سرنگوں ہو کر ہر طرح کی معلومات اکٹھی کرنے کا راستہ کفر و شرک کی طرف جاتا ہے۔ اس کی مثال وہ شجر و ممنوعہ ہے جسے آدم صلی اللہ نے چکھا چنانچہ لوگ ہاتھ دھو کر اس شجرہ ممنوعہ کی حقیقت جاننے میں سرگرواں ہو گئے کہ آخر یہ شجر کون سا شجر تھا اور یوں اس شجرہ ممنوعہ کے بارے میں اکیس سے زائد اقوال ہماری کتابوں کی زیر و زینت بنے ہیں حالانکہ اس سلسلے کی تمام کوشش و کاوش ہمیں اپنی منزل تک پہنچنے کے حقیقی راستے سے ہٹانے کی خاطر تھی یہ کارابلیس ہے کہ جس نے حضرت آدم کو اس شجر کے نزدیک کر کے گمراہ کیا ہے اور اب وہی ابلیس ہمیں اس شجر کی حقیقت سے دور کر کے گمراہ کر رہا ہے حقیقت میں اس شجرہ ممنوعہ کی مثال فوجی مشقوں میں استعمال ہونے والے نشان کی مانند ہے جسے مارنے کی مشق کی جاتی ہے، یہاں پر نشانہ باندھنے والے فوجیوں کیلئے یہ بحث بالکل بے ہودہ و بے معنی ہو گئی کہ یہ نشان و ہدف گتے کا بنا ہوا ہے لکڑی کا، اینٹوں اور پتھروں کا یا یہ لوہے کا بنا ہوا ہے۔ جس شجر کے قریب جانے سے آدم کو منع کیا گیا تھا ہمیں بھی اسے اسی طرح کا ایک علامتی نشان ہی سمجھنا چاہیے کیونکہ حضرت آدم صلی اللہ کو عملی زندگی گزارنے کی مشق کرواتے وقت خداوند متعال نے آدم کو وہ درخت ایک نشانی یا ہدف کے طور پر دکھایا تھا۔ جب انسانی اجتماع میں ضروریات زندگی کا حصول اگر کسی اصول و ضوابط سے باہر ہو تو ایک کشمکش کی صورت حال بہتر ہوتی ہے، لہذا ضروریات زندگی تک رسائی کیلئے ضروری ہے کہ انسان کسی نظام اور قانون کی پاسداری کرے اور اس کی حدود کا احترام کرے۔ اللہ تبارک تعالیٰ نے آدم سے کہا کہ آپ دونوں یہاں پر آرام و سکون کی زندگی گزاریں لیکن آپ کی سرحد یہ ہے کہ آپ اس درخت کے نزدیک نہ جائیں گویا اللہ تبارک تعالیٰ نے آدم پر واضح کر دیا کہ آرام و راحت اور آسائشوں کا مسلسل حصول صرف قانون کے احترام میں ہی مضمر و پوشیدہ ہے اور انسان صرف اسی وقت دکھ، و تکلیف اور پریشانیوں اور مصیبتوں میں مبتلا

ہوتا ہے جب وہ نظام و قانون کی حدوں کو پامال کرتا ہے پہلے مفروضے کے تحت ایک سادہ انسان ہونے کے حوالے سے آدم نے نظام و قانون یعنی مقرر کردہ حدود کا احترام نہیں کیا جس کے نتیجے میں آدم خداوند عالم کی عصیان و نافرمانی کرنے والوں میں قرار پائے۔ عصیان و نافرمانی پر اسرار و تکرار انسان کو کفر کی طرف لے جاتا ہے لیکن پشیمانی و ندامت انسان کو توحید و ایمان سے نزدیک کرتی ہے۔ اور صحیح معنوں میں پشیمان ہونے والا بالآخر اعلیٰ درجے پر فائز ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے اپنے منتخب بندوں میں بھی قرار دے سکتا ہے۔

آدم صلی اللہ علیہ وسلم ایک وقت تین صفات کے حامل ہیں:

۱۔ بے عیب و بے رنگ انسان۔

۲۔ انسان عاصی و خطار کار۔

۳۔ مجتبیٰ و مصطفیٰ

آدم سے دھوکہ ہوا: انسان کا دشمن اس کے باہر ہے، وہ اس کے اندر سے اسے گمراہی کی طرف نہیں دھکیلتا گویا انسان اس پتھر کی مانند نہیں جو کسی اونچائی و بلندی سے نیچے گرے تو جب تک کوئی چیز اس کے راستے میں مزاحم ہو کر اسے نہ روکے تو وہ نیچے ہی گرتا جاتا ہے بلکہ انسان اس پتھر کی مانند ہے جو ہموراز زمین پر پڑا ہوا اور جب تک اس کے آگے پیچھے یا اطراف سے کوئی بیرونی طاقت اسے دھکا دیکر اس کی جگہ سے نہ ہٹائے وہ اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے ان حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمیں حیات آدم صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھنے کی ضرورت ہے ممکن ہے ہمیں اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کو سنوانے میں دیگر انبیاء کرام کی نسبت آدم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں زیادہ عبرت و رہنمائی ملے کیونکہ حضرت آدم پہلے مرحلے میں ایک انسان مافوق نہیں بلکہ ایک عادی انسان تھے۔

تر بیت گاہ سے اخراج:

اکثر و بیشتر افراد کلمہ ”جنت“ سے وہ ”جنت“ مراد لیتے ہیں جو قیامت پر پا ہونے کے بعد خدا پرستوں کو عطا کی جائے گی۔

حضرت آدم صلی اللہ کو خداوند عالم نے جنت میں بسایا اسی طرح یہ بھی واضح ہے آپؑ نے شجرہ ممنوعہ سے تناول فرمایا جس کے نتیجہ میں آپؑ کو وہاں سے نکل جانے کا حکم ہوا۔ وہاں سے نکل جانے کا یہ تصور ایک معمہ ہے جو بظاہر آیات اور روایات اسلامی کے مخالف نظر آتا ہے کیونکہ جنت الخلد سے نہ تو کسی کو نکالے جانے کا تصور موجود ہے اور نہ ہی وہاں شیطان کے داخلے کا تصور پایا جاتا ہے لیکن کلمہ جنت اور مفہوم میں استعمال ہوا ہے جیسے جنت اس باغ کو کہتے ہیں جس کی چھت درختوں کے تنوں اور ان کے پتوں سے مل کر بنی ہو اللہ نے جنت الخلد کے علاوہ اس دنیا میں بھی چندین جنتیں بنائی ہیں اور پھر انہیں ویران و برباد بھی کیا ہے اس ضمن میں مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ کریں:

﴿اَبُو دَاوُدَ كَمِ اَنْ تَكُوْنَ لَهُ حَنَّةٌ مِّنْ نَّحِيلِ وَاَعْنَابٍ﴾ ”کیا تم میں سے کوئی یہ

پسند کرتا ہے کہ اس کیلئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو“ (بقرہ/۲۶۶)

﴿كُلُّنَا لِحَبَّتِهِنَّ اَنْتَ اَكْلُهُنَّ﴾ ”اور (اے محمد) ان سے دو آدمیوں کی ایک مثال بیان

کریں جن میں سے ایک کو ہم نے انگور دو کے عطا کئے“ (کہف/۳۲) سہا/۱۵، قلم/۱۷۔

ان آیات سے پتہ چلتا ہے، جنت بروز قیامت حساب و کتاب کے بعد مومنین کو عطا کئے جانے والا گھر ہی نہیں بلکہ خدا نے دنیا میں بھی کئی جنتیں بنائی ہیں لہذا حضرت آدمؑ کو خدا دنیاوی زندگی کی آزمائش و امتحان سے گزارے بغیر جنت الخلد میں نہیں بھیج سکتے کیونکہ یہ حکمت اور مشیت کے خلاف ہے، اس نے اپنی کتاب میں کہا ہے وہ اپنے صالح و فرمانبردار بندوں کو دنیاوی زندگی گزارنے اور امتحان و آزمائش سے کامیابی کے بعد جنت الخلد میں داخل کرے گا جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے بعض افراد کا یہ کہنا درست نہیں کہ آدمؑ شیطان کے بہکا دے میں نہ آتے تو آج ہم بھی جنت الخلد میں ہوتے کیونکہ سورہ بقرہ کی آیت ۳۰ میں خدا نے ارشاد فرماتا ہے کہ ہم نے

آدم کو اسی روئے زمین کے لئے خلق کیا ہے:

﴿إِنَّمَا جَعَلْتُ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ ”میں زمین میں ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں“

خلقت آدمؑ کے بعد آدمؑ کو جنت الخلد میں نہ بھیجے جانے کی ایک واضح دلیل یہ بھی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو جنت میں بسایا تو وہاں انہیں محدود سے اوامر و نواہی کی طرف بھی متوجہ کیا اور ان کی مخالفت کی صورت میں انہیں وہاں سے نکالنے کی وعید بھی سنائی جبکہ جنت الخلد میں جانے والوں پر نہ تو تکالیف شرعی عائد ہوتی ہیں اور نہ ہی وہاں داخلہ کے بعد وہاں سے نکالے جانے کا کوئی تصور ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس جگہ کو جنت الخلد کا نام دیا گیا ہے یعنی وہاں داخل ہونے کی سعادت پانے والے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وہیں رہیں گے اور انہیں داخلہ کے بعد اس لطف و کرم سے محروم نہ کیا جائے گا۔ قرآن کریم میں آدمؑ کا جنت سے نکالے جانے اور اس روئے زمین کے لئے تخلیق ہونے کا ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں جس جنت سے نکالا گیا وہ جنت الخلد نہ تھی بلکہ وہ ایک ایسا باغ اور ایک ایسی جگہ تھی جو آدمؑ و حوا کے لئے آسائشوں اور نعمتوں سے پُر تھی تاکہ وہ انہیں آخرت میں ملنے والی جنت الخلد کی یاد دلائے یہ جنت درحقیقت آدمؑ کے لئے ایک تربیت گاہ تھی یہاں بسانے کے بعد خداوند عالم نے آدمؑ کو ایک امر ایک نہی اور ایک حقیقت سے متعارف کروایا اور یہی انسان کی زندگی کے لئے خداوند تعالیٰ کی طرف سے عائد احکام و ہدایت کا خلاصہ و نچوڑ ہے یہاں پر خدا نے حکم دیا اے آدمؑ! آپ اور آپ کی زوجہ یہاں جس قدر عیش و عشرت و لذت اٹھانا چاہیں اٹھالیں اور آپ دونوں پر صرف ایک پابندی ہے کہ اس درخت کے قریب نہ جائیں گویا اللہ کی طرف سے اس دنیا میں انسان کو جو آزادی ملی ہے اس کے مقابلے میں جو پابندی ہے وہ سو میں سے ایک ہے یہ بات اس دنیا میں انسان کی آزادی کے جھوٹے علمبرداروں کے منہ پر ایک طمانچہ ہے اسی طرح یہاں جو دوسرا نکتہ بیان ہوا وہ یہ ہے کہ انسان کے لئے حرام سے بچنے کا سب سے بہتر

طریقہ یہ ہے وہ حرام سے دور ہی رہے اور کبھی بھی اس کے قریب نہ جائے اب آتے ہیں اس حقیقت کی طرف کہ جس سے خدا نے آدم کو متعارف کروایا اور آدم و حوا کو جنت میں بسا کر اور اس حقیقت سے آشنا کر کے رہتی دنیا تک کے تمام انسانوں پر واضح کر دیا کہ انہوں نے کس چیز سے بچنے کے رہنا ہے وہ یہ ہے کہ ہر انسان اپنے دشمن شیطان سے بچنے کے رہے کیونکہ وہ کبھی بھی آپ کا دوست اور خیر خواہ نہیں ہو سکتا چاہے وہ دوست کے چہرے میں ہی کیوں نہ آئے اور نصیحت کی زبان کھولے:

﴿ان هذا عدو لك ولزوجك فلا يخرجنكما من الجنة فتشقى﴾ ”ہم نے آدم سے کہا اے آدم! یہ آپ اور آپ کی زوجہ کا دشمن ہے کہیں یہ آپ دونوں کو جنت سے نکال نہ دے پھر آپ مشقت میں پڑھ جائیں گے“ (۱۱۷/۱)

حضرت ادریسؑ

حضرت ادریسؑ کا ذکر قرآن کریم میں دو بار سورہ مریم ۵۶ اور سورہ انبیاء ۸۵ میں آیا ہے:

﴿وَإِذْ كَرَّمْنَا الْكَتُبَ اِدْرِيسَ اِنَّهٗ كَانَ صَدِيقًا نَّبِيًّا﴾ ”اور اس کتاب میں ادریسؑ کا ذکر کیجئے: وہ یقیناً راستگو نبی تھے“ ﴿وَاسْمَاعِيلَ وَاِدْرِيسَ وَذَا الْكِفْلِ كُلٌّ مِّنَ الصَّابِرِيْنَ﴾ ”اور اسماعیلؑ و ادریسؑ اور ذوالکفلؑ کو بھی (اپنی رحمت سے نوازا) یہ سب صبر کرنے والے تھے“

ان دونوں آیات میں ان کے لئے دو صفات کا ذکر آیا ہے ایک صفت عام ہے جس سے خداوند متعال نے ہمیشہ اپنے ہر نبی کو یاد کیا وہ صفت صدیق ہے دوسری صفت مخصوص نظر آتی ہے فرمایا انہیں ہم نے بلند مقام پر اٹھایا ہے علماء میں مشہور یہ ہے کہ بلند مقام سے مراد ان کو آسمان کی طرف اٹھایا ہے اس سے کہتے ہیں حضرت ادریسؑ ان انبیاء میں سے ہیں جو ابھی تک زندہ ہے ہمیں اس آیت کریمہ کے اس جملے کے بارے میں کوئی وضاحت نظر نہیں آتی بلند مرتبے سے مراد مقام مادی ہے یا مقام معنوی یہ بھی ثابت نہیں ہے بلکہ عدم ثبوت یقینی ہے کہ وہ ابھی تک زندہ ہیں جو بھی ہو ہم گزشتہ انبیاء کے بارے میں کتب عہدین پر اعتماد نہیں کر سکتے اور ہماری روایات پر ابھی تک ہمارے علماء نے تحقیق شروع نہیں کی ہے لہذا ہماری رسائی آیات قرآنی تک محدود ہے ہم صرف حضرت ادریسؑ کی نبوت اور صداقت اور بلند درجے پر فائز ایمان لانے پر اکتفا کرتے ہیں اس کے علاوہ حضرت ادریسؑ کے بارے میں علماء کے نزدیک یہ بھی مشہور ہے کہ آپ حضرت ادریسؑ ابن برت بن شیش بن آدم کے فرزند ہیں لہذا آپ کی نبوت کا دور حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کے درمیان میں ہے اس

حوالے سے آپ سب سے پہلے نبی ہیں لیکن اس آیت کی وجہ سے آپ کی بنوت حضرت نوح سے پہلے ہونے میں شکوک شبہات پیدا ہوتے ہے جہاں خدا نے آغاز نبوت کو حضرت نوح سے متعارف کروایا ہے علماء مفکرین اس سلسلے میں از بھی رحمت فرمائیں۔

حضرت نوح علیہ السلام

حضرت نوح علیہ السلام

نوح بن لامک بن متوشلح بن اخنوخ بن یارد بن مہلئیل بن قنان بن انوش بن شیث بن آدم:
 نوح: بعض افراد کا کہنا ہے کہ یہ کلمہ عجمی عبری ہے جبکہ بعض نے کہا ”نوح“ نوح یا نوح سے
 مصدر ہے جسکے معنی پریشانی کے عالم میں رونے اور چیخنے کے ہیں اور بعض نے کہا نوح کسی چیز کے
 دوسری چیز سے مقابلہ کرنے کو کہتے ہیں، حضرت نوح علیہ السلام کو اس لئے نوح کہتے ہیں کہ آپ
 تقریب خدا کی خاطر اپنے نفس پر بہت زیادہ روتے تھے، نوح کے القاب میں ایک لقب آدم ثانی
 ہے اور اس لقب کی وجہ یہ ہے کہ طوفان نوح سے تمام لوگوں کے غرق ہونے کے بعد دنیا تمام
 انسانوں کی نسل آپ ہی سے پھیلی، اہل تاریخ لکھتے ہیں روئے زمین پر بسنے والے تمام انسان نسل
 نوح سے ہیں حضرت نوح علیہ السلام کے چار فرزند تھے ان میں سے ایک کا نام ”سام“ تھا جس سے
 عرب، فارس اور اہل روم پھیلے ہیں۔ دوسرے کا نام ”حام“ تھا جس سے سوڈانی پھیلے اور تیسرے
 کا نام ”یافث“ تھا جس سے ترک پھیلے ان کے علاوہ یاجوج و ماجوج، فرنج اور قبط، ہود بن ہام سے
 پھیلے ہیں کشتی نوح میں آپ کے تین فرزندوں کی بیویاں بھی تھیں اس میں چالیس مرد اور چالیس
 عورتیں سوار تھیں کل اسی (۸۰) تھیں اسی وجہ سے جہاں کشتی رکی اس جگہ کا نام ثمانین بن گیا
 جن سورہ آیات میں حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر آیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

حضرت نوح آیات قرآنی میں:

سورہ سورہ نمبر آیت نمبر

آل عمران ۳ ۲۳

النساء ٣	١٩٣
الانعام ٦	٨٣
الاعراف ٧	٦٩، ٥٩
التوبة ٩	٤٠
يونس ١٠	٤١
هود ١١	٣٩، ٣٨، ٣٦، ٣٥، ٣٢، ٣١، ٣٢، ٣٥
ابراهيم ١٣	٩
الاسراء ١٤	١٤، ٣
مريم ١٩	٥٨
الانبياء ٢١	٤٦
الحج ٢٢	٣٢
المؤمنون ٢٣	٢٣
الفرقان ٢٥	٣٤
الشعراء ٢٦	١١٦، ١٠٦، ١٠٥
العنكبوت ٢٩	١٣
الاحزاب ٣٣	٤
الصفافات ٣٤	٤٩، ٤٥
ص ٣٨	١٢
غافر ٤٠	٣١، ٥
الشورى ٤٢	١٣

فی	۵۰	۱۲
الذاریات	۵۱	۴۶
النجم	۵۳	۵۲
القمر	۵۴	۹
الحدید	۵۷	۲۶
التحریم	۶۶	۱۰
نوح	۷۱	۲۶، ۲۱، ۱

حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی دعوت

حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں وارد آیات کریمہ سے پتہ چلتا ہے آپ کی دعوت دیگر انبیاء کرام کی دعوت سے مختلف تھی گرچہ حضرت نوح علیہ السلام حسب تصریح قرآن کریم سب سے پہلے نبی تھے جو انسان کی ہدایت و رہنمائی کیلئے مبعوث ہوئے۔

حضرت نوح علیہ السلام پہلے اولی العزم پیغمبر ہے حسب ترتیب قرآن کریم حضرت آدم صلی اللہ کے بعد آپ ہی ہیں آپ کا اسم تنخائیس (۴۳) بار قرآن کریم میں آیا ہے۔ آپ کی اولادوں کے نام جو تورات میں تحریر ہیں: حام، سام، یافث اور وہ بیٹا جو آپ کی اطاعت سے نکل گیا اس کا نام کنعان تھا آپ کی دعوت نبوت کا دور حسب قرآن نو سو پچاس (۹۵۰) سال ہے، عام طور پر یہ تصور پایا جاتا ہے کہ ہم سے پہلے والے انسان صاف ستھری اور سادہ فکر کے حامل تھے وہ جلدی مطمئن ہونے والے تھے، ان میں انحرافات کی شرح اس دور کی بہ نسبت بہت کم تھی لیکن حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں وارد آیات کریمہ سے پتہ چلتا ہے کہ نوح نبی کو جس قوم کا سامنا کرنا پڑا وہ انتہائی لجاجت اور عناد کی صورت میں بت پرستی میں مستغرق تھی، کسی بھی حوالے سے انھیں ان کی روش سے

بنانا ممکن نہیں تھا انھیں دعوت دیتے وقت وہ طریقہ کار اور ایسے جملے استعمال نہیں کیے جاسکتے تھے جیسا اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ فرعون کے پاس جاؤ اور اس سے نرم زبان میں گفتگو کرو یا خاتم الانبیاءؑ سے فرمایا ہم نے آپ کو نرم مزاج بنایا اگر آپ ٹھنڈ مزاج ہوتے تو لوگ آپ سے دور ہو جاتے لیکن جس قوم کا حضرت نوحؑ کو سامنا تھا اس کے بارے میں ابتداء ہی میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے نوح کو یہ کہہ کر اس قوم کی طرف بھیجا کہ انھیں ڈرائیں اس سے پہلے کہ ان پر دردناک عذاب نازل ہو جائے۔

اس آئیہ کریمہ سے پتہ چلتا ہے کہ قوم نوحؑ بت پرستی میں غرق تھی اور اس فعل کے خلاف کسی قسم کی بات سننے کے لئے آمادہ نہ تھی گرچہ ان سے ہر قسم کے بہانے اور عذر کو چھیننے کیلئے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو حکم دیا پہلے آپ انھیں ڈرائیں، دوسرے مرحلہ میں آپ انھیں یہ طمع دیں کہ بت پرستی چھوڑنے کے نتیجے میں ان کی گذشتہ غلطیاں بخش دی جائیں گی، تیسرے مرحلہ میں ان سے کہیں اگر فوراً اور بیک وقت نہیں چھوڑ سکتے تو ہم تمہیں کچھ مہلت بھی دے دیں گے اور بت پرستی چھوڑنے پر خداوند متعال تمہیں نعمتوں سے بھی نوازے گا۔

حضرت نوح علیہ السلام اپنی دعوت میں تمام تر نرمی اور خود رگزر کے مراحل سے گزرے لیکن قوم نوحؑ پر کسی قسم کا اثر نہ ہوا یہاں تک حضرت نوحؑ نے درگاہ رب العزت میں ان کی سرکشی کی شکایت کی اور کہا کہ اے باری تعالیٰ! میں نے انھیں جتنی بھی دعوت دی اور عفو و بخشش کیلئے بھی کہا لیکن یہ لوگ اتنا ہی میری بات سننے سے انکاری ہو گئے، یہ لوگ میری دعوت کو نہ سننے کیلئے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیتے ہیں اور کبھی لباس میں چھپ جاتے ہیں۔ یہ غرور و تکبر اور استکبار کرنے والے ہیں پھر فرمایا میں نے انھیں دن رات دعوت دی مگر ان پر کچھ اثر نہ ہوا حضرت نوح علیہ السلام کی حیات طیبہ سے پتہ چلتا ہے قوم نوحؑ بت پرستی اور بتوں سے لگاؤ میں اس مرحلے تک پہنچ چکی تھی کہ ایک آدمی نے اٹھ کر کہا کہ اپنے خداؤں کو مت چھوڑ دپھر اس نے ایک ایک بت کا نام لیکر کہا ان کی

محافظت و پاسداری کرو۔

حضرت نوح علیہ السلام کے صفات والقبابت:

صافات کی آیت ۷۹ میں خدا نے آپؑ پر سلام بھیجا ہے:

﴿سَلِّمْ عَلَىٰ نُوحٍ فِي الْعِلْمِينَ﴾ ”تمام عالمین میں نوحؑ پر سلام ہو“

خدا نے آپؑ کو عید شکور کہا ہے:

﴿إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا﴾ ”نوحؑ یقیناً بڑے شکرگزار بندے تھے“ (اسراء/۳)

آپؑ سورہ آل عمران آیت ۳۳ کے تحت حضرت آدمؑ کے بعد خدا کا دوسرا برگزیدہ بندہ ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَابْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ عَلَىٰ الْعَالَمِينَ﴾ ”بے اللہ نے

آدمؑ، نوحؑ، آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام عالمین سے برگزیدہ فرمایا ہے“

اور سورہ نساء کی آیت ۱۶۳ کے تحت آپؑ سب سے پہلا نبی ہے:

﴿وَأَنبَأُوا حِثْنَكَ كَمَا وَحَّيْنَا لِنُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ﴾ ”(اے رسول) ہم نے

آپؑ کی طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوحؑ اور ان کے بعد کے نبیوں کی

طرف بھیجی“

سورہ عنکبوت کی آیت ۱۲ کی رو سے آپؑ اپنے قوم میں ایک ہزار سال سے کچھ کم عرصہ کی عمر کی ہے:

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا﴾ ”اور تحقیق

ہم نے نوحؑ کو ان کی قوم کی طرف بھیجا تو وہ ان کے درمیان پچاس سال کم ایک

ہزار سال رہے“

اور روایات میں دو ہزار تین سو (۲۳۰۰) یا دو ہزار پانچ سو (۲۵۰۰) سال تک بھی نقل ہوا ہے

شاید طول عمر نوحؑ ہی حضرت نوحؑ کے معجزات میں سے ہو۔ آیات مبارکہ قرآن کریم میں حضرت

نوح علیہ السلام کے دو معجزوں کا ذکر ہے ان دو معجزوں میں سے ایک تو آپ کی طول عمر ہے اتنی طول عمر نہ تو آپ سے پہلے کسی کو ملی اور نہ ہی بعد میں آنے والوں میں سے کسی کو ملی۔

قصہ حضرت نوح علیہ السلام

سورہ مبارکہ ہود کی آیت نمبر ۲۵ میں خداوند عالم نے فرمایا ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا تاکہ قوم کو ڈرائیں:

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ﴾ ”اور ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ میں تمہارے لئے کھلے ہوئے عذاب الہی سے ڈرانے والا ہوں“

یہاں ایک بحث کلمہ قوم کے بارے میں ہے یہاں بھی اور دیگر مقامات پر خداوند عالم نے انبیاء و مرسلین کے بارے میں فرمایا فلاں نبی کو اپنی قوم کی طرف بھیجا یا وہ اپنی قوم میں رہے یہاں قوم سے مراد کیا ہے بعضوں کا خیال ہے قوم قبیلے کو کہتے ہیں یا اس شہر کے رہنے والوں کو جبکہ حقیقت میں قوم سے مراد مرد ہیں وہ اس لئے کہ ہمیشہ دعوت انبیاء و مرسلین کا مقابلہ ہمیشہ مردوں نے ہی کیا کیونکہ عورتیں حجاب میں رہتی تھیں عورتیں ہمیشہ آسانی پیغام باپ، بھائی، شوہر سے سنتی تھیں لہذا اسی وجہ سے پیغمبر اکرمؐ کے زمانہ میں خواتین نے احتجاج کیا کہ مرد دینی معلومات میں ہم سے آگے ہیں آپ اپنی خدمت میں ہماری حاضری کے لیے ایک دن معین فرمائیں تاکہ عورتیں بھی دین اسلام کے بارے میں دریافت کریں چنانچہ پیغمبر اکرمؐ نے ایک دن معین فرمایا۔ انبیاء کے سامنے آنے والے قوم تھے اسکی کیا دلیل ہے، قوم مادہ قائم یا قیوم سے ہے یہ دونوں صفات مردوں کی ہیں لہذا سورہ مبارکہ حجرات آیت نمبر ۱۱ میں فرماتے ہیں:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرُ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ﴾ ”اے ایمان

والوں کوئی قوم کسی قوم کا مسخر نہ کرے ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں۔“

مردہی دعوت انبیاء کا مقابلہ کرتے تھے انکار کرتے تھے سورۃ اعراف آیت نمبر ۵۹ میں حضرت نوح کے بارے میں ہے حضرت نوح نے قوم کو چند چیزوں کی دعوت دی۔ دعوت عقیدہ توحید یعنی خدا ایک ہے دوسرا اسکے علاوہ کسی کی عبادت و پرستش نہ کریں عبادت سے مراد اطاعت خدا ہے۔ ایک دن خدا کے حضور حاضری دنیا ہے گناہ گار عذاب کا مزہ چکھیں گے اور قیامت سے پہلے اس دنیا میں بھی عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ حضرت نوح نے اپنی قوم کو ڈرایا کہ تم پر عذاب نازل ہوگا اور تم اسکے رفع کرنے پر قادر بھی نہیں ہو گے۔ اس حوالے سے حضرت نوح پریشان تھے لوگ عذاب سے نجات پائیں، یہ اسی صورت ممکن ہے کہ وہ اطاعت گزار بن جائیں لہذا اس سورۃ مبارکہ اعراف کے مطابق حضرت نوح کی دعوت تبلیغ تین نکات پر مشتمل ہے اللہ کے علاوہ کوئی خدا نہیں اس کی عبادت کرو ورنہ ایک عذاب تمہاری طرف آنے والا ہے ان احکام سے جو فرار کرتے ہیں اور فرار کی دعوت دیتے ہیں وہ طاغی، جبار، رئیس اور قوم کے سربراہ ہوتے ہیں کیونکہ قیادت و سیادت اسکے ہاتھ میں ہوتی ہے باقی تمام لوگ انکی رعیت اور انکی اطاعت میں ہوتے ہیں اگر یہ دین خدا کی واحدانیت کے بارے میں متحد ہو جائیں۔ ایک خدا کی اطاعت و بندگی میں آجائیں تو اس وقت کیا ہوگا۔ ان قائدین و سربراہان کی بود و باش کرسی کو لوگ ان سے کھینچ لیں گے کیونکہ حکومت صرف اللہ کی ہے انسان کسی انسان کے سامنے خاضع نہیں ہے لہذا انہی لوگوں کی طرف سے دعوت انبیاء کی مخالفت ہوئی چنانچہ فرماتے ہیں قوم کی ایک جماعت نے حضرت نوح سے آکر کہا ہم تمہیں کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتے ہیں وہ قوم کے روسا و صاحبان حشمت و ہیبت تھے انہوں نے دیکھا دعوت نوح نے انہیں تہہ بالا کر دیا اس سے جان چھڑاؤ حضرت نوح نے فرمایا میں گمراہ نہیں ہوں:

﴿يٰۤاَقۡوَمِ لَیۡسَ بَیۡ ضَلٰلَۃٍ وَّلٰکِنِّیۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الْعٰلَمِیۡنَۙ اِلَیَّکُمۡ رَسٰلَتُیۡ دِیۡی

وَ اَنۡصَحۡ لَکُمۡ﴾ ”کہا: اے میری قوم! میں گمراہ نہیں ہوں بلکہ عالمین کے پروردگار کی

طرف سے ایک رسول ہوں میں تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور تمہیں نصیحت کرتا ہوں“ (اعراف/ ۶۲، ۶۱)

انکی حیثیت مبلغ کی ہے حضرت نوح عظیم حاکم یا سردار نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے نجات انسانیت کے پیغام رساں تھے انبیاء و مرسلین کو، حاکم یا حکمران کہنا غلط ہے بلکہ وہ مخلوقات کے لیے خالق کی طرف سے نمائندہ ہیں تمام انعامات چاہے وہ روئے زمین پر ظاہر ہوں جیسے پانی، ہوا، سورج، چاند یا زمین کے اندر چھپے ہوئے خزانے سب خدا کی طرف سے ہیں اور یہ تمام مخلوقات کے لیے ہیں اس میں کوئی امتیاز مومن یا کافر نہیں ہے سورج کی کرن سب کے لیے ہے حضرت نوحؑ نے بھی فرمایا یہ سب خدا کی طرف سے ہے میں صرف مبلغ ہوں یہ میری طرف سے نہیں بلاغ کے معنی پیغام کو سائل تک پہنچا دینا ہے۔ دیگر انبیاء و مرسلین نے بھی یہی دعوت لیکر لوگوں کو ایک خدا کی طرف بلایا کوئی نبی دوسرے نبی کے خلاف پیغام نہیں لایا جو پیغام حضرت آدم صلی اللہ لائے وہی بعد میں آنے والے انبیاء لاتے رہے:

﴿شرع لكم من الدين ما وصى به نوحا والذي اوحينا اليك وما وصينا به ابراهيم وموسى وعيسى ان اقيموا الدين ولا تتفرقوا فيه﴾ ”اس نے تمہارے لئے دین کا وہی دستور معین کیا جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جس کی ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا کہ اس دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا“ (شوریٰ/ ۱۳)

سب ایک ہی دین کے مبلغ تھے یہ احکام ناقابل تغیر ہیں سب نے رسالت خدا کا پیغام خدا سے لیا عزالت و گمراہی میں گھرے ہوئے انسانوں تک پہنچایا اور لوگوں کو عذاب خدا سے بچنے کے لیے نصیحت کرتے رہے انبیاء ہمیشہ قوم کو رغبت دلاتے اور خدا کے احکام کی پیروی کی دعوت دیتے تھے نصیحت بلاغت سے باہر ہے بلاغت پہنچانے کو کہتے ہیں اور نصیحت اس کو کہتے ہیں جس میں فائدہ ہو

فرماتے ہیں میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں خدا نے فرمایا ہے میری نصیحتوں کا فائدہ تمہارے لیے ہی ہے۔

معجزات حضرت نوح علیہ السلام

طول عمر: انسان کی عمر قلیل و طول کے بارے میں قدیم زمانے سے عصر حاضر تک علماء و ماہرین کے مختلف نظریات پائے جاتے ہیں بعض کا کہنا ہے ابتداء میں انسان کی عمر طویل ہوتی تھی رفتہ رفتہ زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کی عمر میں بھی کمی آتی گئی یہاں تک کہ عصر حاضر میں سو (۱۰۰) سے ساٹھ (۶۰) سال کے درمیان عادی عمر رہ گئی ہے بعض کا کہنا ہے انسان کو مناسب غذا اور فضاء ملے تو وہ ہمیشہ زندہ رہنے کی صلاحیت رکھ سکتا ہے یعنی انسان کی عمر میں کبھی اس کی غذا و فضاء میں کمی کی وجہ سے ہوتی ہے۔

یہ تمام نظریات رحم بالغیب تفسر اور تحرص گوئی ہے خداوند متعال قرآن کریم کے سورۃ فاطر کی آیت ۱۱ میں فرماتے ہیں کہ ہر ایک کی عمر پہلے سے متعین ہے:

﴿وَمَا يَعْصِرُ مِنْ مَعْمُرٍ وَلَا يَنْقُصُ مِنْ عَمْرِهِ إِلَّا بِمَا كُتِبَ﴾ ”اور نہ کسی زیادہ عمر والے کو عمر دی جاتی ہے اور نہ ہی اس کی عمر میں کمی کی جاتی ہے مگر یہ کہ کتاب میں (ثبت) ہے“

اسی طرح ان آیات میں بعض کو عمر طویل دینے کا ذکر آیا ہے:

﴿وَلَكِنَّا نَشَاءُ أَقْوَامًا فَتُطَوَّلُ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ﴾ ”لیکن ہم نے کئی امتوں

کو پیدا کیا پھر ان پر طویل مدت گزر گئی“ (قصص/۲۵) انبیاء/۴۲

جبکہ سورۃ بقرہ کی آیت ۹۶ میں خداوند متعال نے یہودی اس خواہش کو ناممکن قرار دیا ہے کہ جس میں وہ اپنی عمر ایک ہزار سال سے بھی زندگی مل جائے تو پھر بھی ان پر موت آئے گی:

﴿يُودِ احدهم لِيُوعمر الف سنة و ما هو بمز حزنه من العذاب﴾ ”ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کاش اسے ہزار سال عمر ملے حالانکہ اگر اسے یہ عمر مل بھی جائے تو یہ بات اس کے عذاب کو ہٹا نہیں سکتی“

قرآن کریم میں کسی بھی نبی کی عمر کا ذکر نہیں آیا، انبیاء کی عمر کی استناد صرف کتب عہدین تورات و انجیل ہے ہاں چونکہ ہم تورات و انجیل میں موجود تمام مطالب کو مسترد نہیں کرتے اس لئے یہاں سے ہم ایک جامع نقطہ نظر اخذ کرتے ہیں وہ یہ کہ ان کتب میں اکثر و بیشتر انبیاء کی عمریں سو (۱۰۰) ایک سو بیس (۱۲۰) ایک سو پچاس (۱۵۰) اور دو سو (۲۰۰) سال تک ملتی ہیں۔ یہ کہنا کہ مناسب غذا و فضا سے انسان کو لمبی عمر ملتی ہے اور چونکہ اس وقت انسان کو نصیب غذائیں ہر قسم کی مصنوعی اور ملاوٹ شدہ ہیں جس میں دوام و بقاء کی گنجائش کم ہے یا سابق زمانے میں عمر طویل ہوتی تھی اور عصر حاضر میں عمر کم ہے یہ تجربے کے خلاف ہے کیونکہ آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل مثلاً جہاں خاتم الانبیاء اور امیر المومنین جنہوں نے ایک محدود اور سادہ غذا سے زندگی گزاری ہے ان کی عمر ۶۳، ۶۵ سال سے زیادہ نہیں گزری اور ان کے بعد آئمہؑ کی عمریں آٹھائیس (۲۸) سے تیس (۳۰) سال تک رہی ہے۔ ان قدیم و جدید اعداد و شمار کو ایک طرف جمع کرتے ہیں اور دوسری طرف خدا نے صرف حضرت نوح علیہ السلام کی عمر کا ذکر قرآن میں کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے خدا نے جو عمر حضرت نوح علیہ السلام کو دی ہے وہ ایک غیر عادی عمر ہے ایسی عمر تاریخ بشریت میں کسی کی نہیں تھی یہاں سے یہ نتیجہ آسانی سے اخذ کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ یہ عمر نوح بذات خود ایک معجزہ ہے خداوند متعال نے اس کائنات کو حضرت نوح علیہ السلام کے توسط سے دکھایا ہے اگر خدا چاہے تو کسی بشر کو اتنی طویل عمر بھی دے سکتا ہے جس کی تاریخ بشریت میں کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔

دوسرا معجزہ طوفانِ نوح ہے:

عذابِ الہی میں تاخیر: بعض مومنین کو ظالمین پر نزولِ عذاب کی جلدی ہے اس سلسلہ میں کسی مومن نے کسی عالمِ دین سے پوچھا کہ خداوند متعال ان ظالمین پر کیوں عذاب نازل نہیں کرتا ہے جبکہ اس نے خود وعدہ دیا ہے تو اس عالم نے بہت اچھا جواب دیا فرمایا تاکہ نزولِ عذاب کے موقع پر ان پر رحم کیلئے دعا کرنے والے باقی نہ رہے ہمارے ملک میں کتنے ظالمین گزرے بعض ان پر نزولِ عذاب کیلئے دعا کر رہے تھے اور بعض ان کے طولِ عمر کیلئے۔ قومِ نوح پر بھی عذاب نازل کرنے میں خدا نے دو طرح کی مہلت دی:

۱۔ طولِ عمر حضرت نوح۔

۲۔ کشتی بنانے میں طویل عرصہ گزرا یہاں تک کہ صدیاں گزر گئی پھر ان پر عذاب نازل ہوا:

”نوح“ کشتی بنے رہے تھے اور اس کے قوم کے سرداروں میں سے جو کوئی اس کے پاس سے گزرتا تھا وہ اس کا مذاق اڑاتا تھا اس نے کہا: اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم بھی تم پر ہنس رہے ہیں عنقریب تمہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اُسے رسوا کر دے گا اور کس پر وہ بلا ٹوٹ پڑتی ہے جو نالے نہ ٹلے گی۔ یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ گیا اور وہ تنور ابل پڑا تو ہم نے کہا: ہر قسم کے جانور کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو اپنے گھر والوں کو بھی سوائے اُن اشخاص کے جنکی نشاد نبی پہلے کی جا چکی ہے اس میں سوار کرادو اور ان لوگوں کو بھی بٹھا لو جو ایمان لائے ہیں اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوح کے ساتھ ایمان لائے تھے نوح نے کہا: سوار ہو جاؤ اس میں اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا بھی اور اس کا ٹھیرنا بھی میرا رب غفور و رحیم ہے“ (صو/ ۳۸، ۳۹، ۴۰) ساقات ۲۷، مومنون ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱

۲۔ نوح اور غرقِ عالم:

پہلا عنصر پانی کا ذکر ان آیات میں آیا ہے:

﴿وَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُنْهَمِرٍ۔ وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا فَالْتَقَى الْمَاءُ عَلَى أَمْرٍ قَدْ قُدِّرَ﴾ ”پھر ہم نے زوردار بارش سے آسمان کے دھانے کھول دیئے۔ اور زمین کو شگافہ کر کے ہم نے چشمے جاری کر دیئے تو (دونوں) پانی اس امر پر مل گئے جو مقدر ہو چکا تھا“ (قر/۱۱:۱۱)

مود۳ کے تحت آسمان و زمین نے اپنا پانی باہر پھینکا:

﴿وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكَ وَاسْمَاءُ أَفْلَحِي وَغِيصَ الْمَاءُ وَفُصِّي الْأَمْرُ﴾ ”اور کہا گیا: اے زمین! اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان! بھتم جا اور پانی خشک کر دیا گیا اور کام تمام کر دیا گیا۔“

وہ ذات جس نے ہر چیز کو پانی سے خلق کیا اور ہر چیز کی حیات و بقاء کو پانی سے جوڑ کر رکھا اُسی ذاتِ باری تعالیٰ نے چندین بار انسان ناپاس کو یہ سمجھایا جس چیز سے تمہاری تخلیق ہوئی ہے اور جس چیز سے تمہاری دوام و بقاء ہے، اگر ہم چاہیں تو اُسی چیز کو تمہاری نابودی و بربادی اور فنا و زوال کا سبب بنا سکتے ہیں۔

قوم حضرت نوح علیہ السلام پر خدا نے پانی ہی کے ذریعے عذاب نازل کیا یہ وہی پانی ہے کہ جس کے بارے میں اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ہم نے زمین سے پانی نکالا اور آسمان سے پانی برسایا۔ جب یہ پانی گودیوں کو پُر کر کے سطحِ زمین سے بلند ہو گیا یہاں تک کہ پہاڑوں کی چوٹیاں بھی اُس میں ڈوبنے لگیں تو خداوندِ عالم نے ہوا جاری کر دی اور اس پانی سے پہاڑ کی شکل کی موجیں بنا کیں:

﴿وَمِثْلَ نَحْرِي بِهِمُ فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ﴾ ”اور کشتی انھیں لے کر پہاڑ جیسی موجوں

میں چلنے لگی“ (ہود/۴۲)

دوسرا عنصر فلک: فلک یعنی کشتی، سورہ ہود کی آیت ۳۷ میں اللہ تعالیٰ نے نوح کو اپنی نگرانی میں اور اور ہدایت کے مطابق کشتی بنانے کا حکم دیا:

﴿وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيُنَا﴾ ”اور ہماری نگرانی میں اور ہمارے حکم سے ایک

کشتی بنائیں“ سورہ نحل کی آیت ۱۲ میں بھی اس کا ذکر ہے، سورہ شعراء ۱۱۸، یسین

۴۱ میں بھی فلک کا ذکر ہے۔

تیسرا عنصر طوفان: ہر اس حادثے کو طوفان کہتے ہیں جو انسان کو گھیر لے لیکن یہاں اس پانی کو طوفان کہا گیا ہے جس میں طغیانی تھی جس نے قوم نوح کو گھیر لیا تھا، ہر چیز پر غالب آ گیا تھا، زمین کو چھپا لیا اور کشتی کے علاوہ باہر رہنے والی ہر جاندار چیز کو ہلاک کر دیا تھا جیسا کہ سورہ غلجوت کی آیت ۱۲ میں آیا ہے:

﴿فَاَحْزَمَهُمُ الطُّوفَانُ وَهُمْ ظَالِمُونَ﴾ ”پھر طوفان نے انھیں اس حال میں اپنی

گرفت میں لیا کہ وہ ظلم کا ارتکاب کر رہے تھے“

چوتھا عنصر دوسر: دوسر جمع دسار ہے دسار میخ کو کہتے ہیں:

﴿وَحَمَلْنَاهُ عَلَىٰ ذَاتِ الْوَاحِ وَدَسْرَ﴾ ”اور تختوں اور کیلوں والی (کشتی) پر ہم نے

نوح کو سوار کیا“ (قر/۱۳)

یعنی حضرت نوح کو ایک ایسی کشتی پر سوار کیا جو تختوں اور میخوں سے بنی ہوئی تھی یہ کلمہ قرآن کریم میں ایک دفعہ آیا ہے۔

نوح علیہ السلام اور دعوت قوم

(۱) قوم نوح نے حضرت نوح سے کہا ہم تم کو کھلی گمراہی پر دیکھتے ہیں:

﴿فَلِیُفْلِلَ الْعَمَلَامِنْ قَوْمِهِ اِنَّ اِلٰهَكَ فِی ضَلٰلٍ مّبِیْنٍ﴾ ”ان کی قوم کے سرداروں نے کہا: ہم تو تمہیں صریح گمراہی میں مبتلا دیکھتے ہیں“ (اعراف/۶۰)

(۲) جن لوگوں نے تمہاری پیروی کی ہے وہ ہماری نظر میں پست ہیں:

﴿وَمَا نَرٰكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الذِّہِنُ هُمْ اِرَادُوْا لَنَا بِدِی الرَّایِ﴾ ”اور ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ہم میں سے صرف ادنیٰ درجے کے لوگ سطحی سوچ سے تمہاری پیروی کر رہے ہیں“ (حود/۲۷)

(۳) ہم تم میں کوئی برتری نہیں دیکھتے:

﴿قَالُوْا اِنَّكُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا﴾ ”وہ کہنے لگے: تم تو ہم جیسے بشر ہو“ (ابراہیم/۱۰)

(۴) ہم تم کو جھوٹے لوگوں میں سمجھتے ہیں:

﴿بَلْ نَحْسِبُكُمْ كٰذِبِیْنَ﴾ ”بلکہ ہم تو تمہیں کاذب خیال کرتے ہیں“ (حود/۲۷)

(۵) ہم تمہیں اپنے جیسا بشر دیکھتے ہیں:

﴿فَقَالِ الْعَمَلَامِلِ الذِّہِنُ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهِ مَا نَرٰكَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا﴾ ”تو ان کے قوم کے

کافر سرداروں نے کہا: ہماری نظر میں تو تم صرف ہم جیسے بشر ہو“ (حود/۲۷)

قوم کو نوح کا جواب:

(۱) میں نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں:

﴿وَلَا اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ﴾ ”اور میں تم سے نہ تو یہ کہتا ہوں کہ میرے پاس

اللہ کے خزانے ہیں“ (حود/۳۱)

(۲) نہ میرے پاس علم غیب ہے:

﴿وَلَا اَعْلَمُ الْغٰیْبِ﴾ ”اور نہ میں علم غیب جانتا ہوں“ (حود/۳۱)

(۳) میں ملک بھی نہیں ہوں:

﴿وَالْأَقْوَلُ أَنِّي مَلَكٌ﴾ ”اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں“ (حور/۲۱)

(۴) میں نہیں سمجھتا کہ جنہیں تم حقارت سے دیکھتے ہو وہ خدا کی نظر میں اچھا نہیں ہے:

﴿وَالْأَقْوَلُ لِلَّذِينَ تَرْدِي أَعْيُنَكُمْ لَنِ يُوَفِّيَهُمُ اللَّهُ خَيْرًا﴾ ”اور جنہیں تمہاری نگاہیں

حقیر سمجھتی ہیں ان کے بارے میں بھی یہ نہیں کہتا کہ اللہ کی انہیں بھلائی سے نہیں

نوازے گا“ (حور/۲۱)

ان سب باتوں کے جواب میں قوم کے رؤساء نے اپنے قوم سے کہا کہ اپنے خداؤں کو مت

چھوڑو ”وَدَّ“ اور ”عَزَّيْ“ کو مت چھوڑو:

﴿وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ

وَنَسْرًا﴾ ”اور کہنے لگے: اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور وُد، سواع، یغوث، یعوق

اور نسر کو نہ چھوڑنا“ (نوح/۲۳)

قوم:

حضرت نوح وہ پہلے نبی تھے جنہیں بت پرستوں کا سامنا کا ہوا جن بتوں کی پوجا قوم نوح کرتے

تھے ان کا نام سورہ نوح کی آیت ۲۳ تا ۲۴ میں بیان ہوا ہے وہ درج ذیل ہیں قوم نوح میں بت

پرستی کیسے آئی اس سلسلہ میں علماء و ماہرین مذاہب و ادیان نے لکھا ہے:

یہ تمام بت ان صالح بندوں کے نام سے تھے جب یہ صالح افراد مر گئے تو شیطان نے اس قوم سے

کہا کہ اپنی مجالس میں ان صالح بندوں کے مجسمے رکھیں اور ان (مجسموں) کو ان کے نام سے

پکاریں انھوں نے ایسا ہی کیا ان کے بعد دوسری نئی نسل آئی تو شیطان نے اس نئی نسل سے کہا کہ تمہاری

آباد اجداد انہی بتوں کی پرستش کرتے تھے اور انھیں سے اپنے آرزوئیں مانگتے تھے لہذا تم بھی

ایسا ہی کرو۔ لیکن عرب جاہلیت کے نزدیک ان بتوں کے علاوہ اور بھی بت تھے جنکے نام یہ ہیں:

(۱) وُد: وہ بنی کلب

(۲) سواع: سواع بنی ہذیل

(۳) یغوث: یغوث غطفان

(۴) یعوق: یعوق ہمدان

(۵) نسر: نسر حمیر آل ذی الکلاع

لیکن اہل اسلام سے پہلے سرزمین حجاز کے مشرکین ان کے علاوہ مندرجہ ذیل بتوں کی بھی پوجا کرتے تھے:

(۱) لات: یہ طائف میں قوم ثقیف کا بت تھا۔

(۲) عزی: یہ قوم سلیم، غطفان اور جہنم کے بت تھے۔

(۳) منات: یہ قوم خزاعہ کے بت تھے۔

(۴) اساف، نائلہ، جہل: یہ اہل مکہ کے بت تھے۔

لیکن اہل سب سے بڑے بت کا نام ہے جو کعبہ کی چھت پر نصب تھا۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام

سورة . سورة نمر آيت نمبر

يوسف	١٢	٣٨٠٦
ابراهيم	١٣	٣٥
الحجر	١٥	٥١
النحل	١٦	١٢٣، ١٢٠
مريم	١٩	٥٨، ٣٦، ٣١
الانبيا	٢١	٦٩، ٢٢، ٦٠، ٥١
الحج	٢٢	٤٨، ٢٣، ٢٦
الشعراء	٢٦	٦٩
الغنيوت	٢٩	٣١، ١٦
الاحزاب	٣٣	٤
الصفات	٣٤	١٠٩، ١٠٣، ٨٣
ص	٣٨	٢٥
الشورى	٣٢	١٣
الزعر	٣٣	٢٦
الذاريات	٥١	٢٣
النجم	٥٣	٣٨
الحديد	٥٤	٢٦
الممتحنة	٦٠	٣
الاعلى	٨٤	١٩

حضرت ابراہیم علیہ السلام

حضرت ابراہیم کی سیرت طیبہ میں چند امور ایسے ملتے ہیں جن کی وجہ سے قصہ ابراہیم کے بیان میں تسلسل کے ساتھ بحث کرنے میں دو قسم کی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اگر اس موضوع سے اجمال اور خلاصہ سے گزریں گے تو اس موضوع کا حق ادا نہیں ہوگا اور قاری کے لیے موضوع تشہد طلب رہے گا۔ اگر ان امور کو تفصیل اور وضاحت سے بیان کریں گے تو آگے چل کر تسلسل ٹوٹ جائے گا آنے والے قصے کا حصہ پہلے سے بے ربط اور اجنبی ہو جائے گا اور قاری کے لیے اس میں ربط قائم رکھنا مشکل ہو جائے گا لہذا ہم نے مناسب سمجھا ان امور سے متعلق گفتگو کو قصہ سے پہلے بیان کریں تاکہ بحث کا صحیح معنوں میں حق ادا ہو جائے اور قصہ بھی اپنے تسلسل کو باقی رکھ سکے لہذا مناسب سمجھا کہ جن نکات پر بحث ہونی چاہئے ان پر پہلے بحث کریں اور قصہ کو اپنے تسلسل کے ساتھ آخر میں لائیں۔ جن امور میں پہلے بحث ہونا ضروری ہے وہ امور مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ والد ابراہیم: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد موصوفہ و خدا پرست تھے یا مشرک کیونکہ جس شخص کو ابراہیم نے ”یا ابت“ کہا ہے وہ مشرک تھا آیا وہی ابراہیم کے والد تھے یا کوئی اور؟

۲۔ حضرت ابراہیم اور بت پرستی کے خلاف جنگ: حضرت ابراہیم دیگر انبیاء کی نسبت بتوں کے ساتھ وسیع پیمانے پر نبرد آزما ہوئے، بت انسان بت نجوم و سیارات بت شمسی و قمری اور بت ساز و بت فروشی سب کے ساتھ بیک وقت مقابلہ ہو کیا اس حوالے سے دین و دیانت میں بت پرستی بت فروشی اور بت فروغی کرنے والوں کے ساتھ دین داروں کی ذمہ داری بھی ایک اہم موضوع ہے۔

۳۔ حضرت ابراہیم اور ذبح ولد: حضرت ابراہیم نے حکم خدا کے تحت مٹی میں قربانی

کی خاطر اپنے فرزند کی گردن پر چھری چلائی لیکن خدا نے اس کے بدلے میں فدیہ دیا اس مناسبت سے ہم ایک انسان کا دوسرے انسان کو خدا کی درگاہ میں پیش کرنے یا ذبح کرنے کی حیثیت کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

۱۔ حضرت ابراہیم اور مشرک باپ آزر

انبیاء کرام علیہم السلام کے والدین کا خدا پرست اور موحد ہونا ضروری ہے یا نہیں، اس پر بحث و گفتگو کا مناسب مقام حیات حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی ہے کیونکہ آپؑ نے اپنی دعوت کے آغاز کے موقع پر ایک بت پرست اور بت فروش جب کا نام ”آزر“ تھا، اس سے یوں خطاب کیا:

﴿اذ قال ابراهيم لايه آزر اتخذ الصناما الهة﴾ ”اور جب ابراہیم نے اپنے

باپ (چچا) آزر سے کہا: کیا تم بتوں کو معبود بناتے ہو؟“ (انعام/۷۴)

اور اس سے بت پرستی چھوڑنے کی دعوت دی اس سلسلے میں پانچ زاویوں سے گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔ مفسرین و مورخین نے حضرت ابراہیمؑ کی باپ کو مشرک قرار دیا ہے وہ ان آیات سے استفادہ کرتے ہیں:

جن مفسرین نے ”آزر“ کو حضرت ابراہیمؑ کا والد قرار دیا ہے انھوں نے اس کے ثبوت میں قرآن کی سورہ مبارکہ مریم کی آیت ۴۳، ۴۴، ۴۵ سے استدلال کیا ہے۔ ان آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس بت ساز کو اے میرے باپ کہہ کر خطاب کیا ہے:

﴿ہایت انی قد جاء نبي من العلم﴾ ”اے ابا: تحقیق میرے پاس وہ علم آیا ہے“

(مریم/۴۳) ﴿ہایت لا تعبد الشيطان﴾ ”اے ابا: شیطان کی پوجا نہ کریں“ (مریم

/۴۴) ﴿ہایت انی احاف ان يعصك عذاب من الرحمن﴾ ”اے ابا: مجھے خوف

ہے کہ خدائے رحمن کا عذاب آپ کو گرفت میں لے لے“

اس نظریے کے مقابل میں اکثر و بیشتر مورخین اور مؤلفین قصص انبیاء نے حضرت ابراہیمؑ کے

باپ کو موحد قرار دیا ہے وہ حضرات یہ کہتے ہیں کہ ہم پہلے آزر اور معنی اب کے بارے میں تحقیق کریں گے:

۱۔ آزر: آزر قوت، شدت کے معنوں میں آیا ہے اس کے علاوہ آزر شلوار کو بھی کہتے ہیں اس کے آخر میں ت بھی آتا ہے اس طرح آزر مدد کرنے کو بھی کہتے ہیں سورہ مبارکہ طہ آیت ۳۱ میں آزر بمعنی قوت و قدرت کے آیا ہے:

﴿اَشْدَدُ بِهِ اِزْرٰی﴾ ”اس کے ذریعے میرا ہاتھ مضبوط کر“

بعض نے کہا ہے کہ ”آزر“ کمر کو باندھنے کو کہتے ہیں۔

تفسیر طبری میں آزر کے بارے میں چار نظریے پیش کیے گئے ہیں:

۱۔ یہ اسم علم ہے۔

۲۔ یہ اسم منادی ہے جہاں حرف معروف ہے۔

۳۔ آزر بت کا نام ہے یعنی ابراہیم نے اپنے باپ سے کہا بت کو چھوڑے۔

۴۔ آزر ایک صفت ہے آزر کے معنی مخرف اور خطا کار اور فرسودہ، بوڑھا، بازو، قوت،

توانائی کے ہیں۔

جس شخص کو ابراہیم نے باپ کہا ہے، اس کا نام ”آزر“ تھا آیا آزر اس کا اسم علم تھا یا اس کی صفات و

القابات میں شمار ہوتا تھا۔

علماء و مورخین کا انساب اور محققین قصص انبیاء کے نزدیک آزر حضرت ابراہیم کے حقیقی باپ نہیں تھے

بلکہ ان کے باپ کا نام بعض نے تارج بعض نے تارخ بعض نے تسارخ کہا ہے حضرت ابراہیم

کا آزر سے کیا رشتہ تھا اس سلسلے میں چند نظریے پائے جاتے ہیں:

۱۔ آزر اسم اصلی ہے ابی کے بدل میں آیا ہے۔

۲۔ آزر منادا (ندا) ہے آزر۔

۳۔ آزر ایک بت ہے ابراہیم نے آزر سے کہا اس بت کی پرستش مت کرو۔

۴۔ آزر صفت ہے اس انسان کی جس کی طبیعت منحرف ہو منحرف طبیعت غلط کرنے والے نا سمجھ بوڑھے کا معنی ہے۔

۵۔ آزر با معنی بازو قوت و طاقت کے ہیں یعنی بت کو مایہ طاقت و قدرت سمجھ میں لیا ہے۔

۶۔ آزر مادہ و زر سے بنایا ہے جس کا معنی گناہ ہے۔

آزر کا ذکر سورہ انعام آیت نمبر ۷۵ میں آیا ہے:

﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لَأَيُّهُمُ أَزْرَأُ أَتَعْبُدُونَ أَصْنَامًا مِّنْ آلِهَةٍ﴾ ”اور جب ابراہیم نے اپنے باپ (بچا) آزر سے کہا: کیا تم بتوں کو معبود بناتے ہو؟“ آزر یہ اسم بابلی یا آریائی زبان ہے۔

۷۔ بعض نے کہا ہے آزر عبرانی زبان کے آزر اس ”ز“ سے بنا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے باپ کے بارے میں وارد آیتوں کو ایک دوسرے سے جوڑنے کے بعد واضح ہو جاتا ہے آزر حضرت ابراہیمؑ کا باپ نہیں تھا جس کی چند دلیل پیش کرتے ہیں۔

۱۔ ”اب“: حضرت ابراہیمؑ نے آزر سے ”اب“ کہہ کر پکارا:

﴿يَا أَبَتِ إِنِّي أَخَافُ﴾ ”اے ابا! مجھے خوف ہے“ (مریم/۳۵)

ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ لغت عرب اور قرآن کریم میں یہ کلمہ کن کن رشتوں کے بارے میں استعمال ہوا ہے اسی طرح کہاں پر یہ کلمہ مجازی معنوں میں اور کہاں پر اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

”اب“: اس کی اصل ”ابو“ ہے اور اس کا مصدر ”ابود“ ہے کسی چیز کے بنانے میں یا اس کی اصلاح کرنے میں یا اس کے ظاہر ہونے میں جس کا کردار ہوا سے ”اب“ کہتے ہیں جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ

کو ”اب المومنین“ کہتے ہیں لیکن سورہ احزاب کی آیت ۴۰ میں میں پیغمبر اکرمؐ کی ابوت کی جو نفی کی گئی ہے اُس سے مراد بنوت تمیمی کی نفی کی ہے:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ﴾ ”محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہارے

مردوں میں کسی کے باپ نہیں ہیں“

اب اصلاح: خاتم المرسلین حضرت محمدؐ نے امام المفسرین علیؑ سے فرمایا: ”میں اور آپ اس امت کے باپ ہیں“

اب الحرب: جو جنگ کی آگ کو روشن کرے اُسے ”اب الحرب“ کہتے ہیں۔

اب الضیوف: مہمان نوازی کرنے والے کو ”اب الضیوف“ کہتے ہیں۔

لغت عرب میں باپ دادا پر دادا چچا ماں اور خالہ ان سب کیلئے لفظ ”اب“ استعمال ہوا ہے قرآن کریم میں بھی یہ کلمہ انھیں رشتوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ سورہ یوسف کی آیت ۱۰۰ میں ماں باپ دونوں کے لئے کلمہ ”ابویہ“ استعمال ہوا:

﴿وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ﴾ ”اور یوسف نے والدین کو تخت پر بٹھایا“

سورہ بقرہ کی آیت ۱۳۳ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے فرزندوں نے اپنے دادا اسحاقؑ ابراہیمؑ اور چچا اسماعیلؑ کے لئے لفظ ”آباؤکم“ استعمال کیا ہے:

﴿قَالُوا نَعْبُدُ إِلَهُكَ وَالْآبَاءَ إِلَهُنَا وَإِسْمَاعِيلُ وَإِسْحَاقُ إِلَهُنَا وَجَعَلَنَاهُ إِبْرَاهِيمَ﴾ ”سب نے

کہا: ہم اس خدائے واحد کی بندگی کریں گے جو آپ کا اور آپ کے آباء و اجداد ابراہیم

اسماعیل اور اسحاق کا معبود ہے“

جب ہم کلمہ ”اب“ کے مصداق کو کتب لغت اور قرآن میں تلاش کرتے ہیں تو یہ کلمہ بطور مفرد اور جمع

دونوں میں استعمال ہوا ہے۔ سورہ یوسف آیت ۳۸ میں یہ کلمہ بطور جمع استعمال ہوا ہے:

﴿وَاتَّسَعَتْ مَلَأَ أَبَاءُ يٰ اِبْرَاهِيمَ وَاسْحٰقَ وَ يَعْقوبَ﴾ ”اور میں نے تو اپنے اجداد

ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے مذہب کو اپنایا ہے“

یہاں حضرت یوسف علیہ السلام کے آباء میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ علیہ السلام تینوں کو شامل ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے جہاں کلمہ ”اب“ صلیبی باپ کیلئے استعمال ہوا ہے وہاں ہی دادا اور پردادا کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے کیونکہ اسحاق اور ابراہیمؑ یوسفؑ کے دادا اور پردادا ہیں۔ سورہ بقرہ آیت ۱۳۳ میں فرزند ان یعقوبؑ نے اپنے باپ یعقوبؑ کے سوال کے جواب میں کہ تم میرے بعد کس کی پرستش کرو گے کہا آپ کے خدا اور آپ کے آباء کے خدا کی یہاں ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اور اسحاقؑ کا ذکر ہے اسحاقؑ، یعقوبؑ کے باپ ہیں ابراہیمؑ دادا اور اسماعیلؑ چچا ہیں اور ان سب کیلئے ”اب“ استعمال ہوا ہے۔

کلمہ ”اب“ کے استعمال کے موارد واضح اور روشن ہونے کے بعد یہ کلمہ صرف حقیقی باپ سے ہی مخصوص نہیں بلکہ باپ کے ساتھ دادا، پردادا اور چچا کیلئے بھی قرآن اور عربی زبان میں استعمال ہوا ہے اس کے بعد ان آیات سے یہ نتیجہ نکالنا حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام نے انھیں اپنا حقیقی باپ ہی کہا ہے صحیح نہیں رہتا لہذا ہمیں ان کے حقیقی باپ کی تلاش و جستجو کیلئے قرآن کی دیگر آیات جو ان کی زندگی سے متعلق ہیں رجوع کرنے کی ضرورت ہے۔

۲۔ برائمت ابراہیم از آزر:

حضرت ابراہیمؑ جب آزر کے ایمان لانے سے مایوس ہو گئے تو آپؑ نے ان سے جدائی اور دوری کا اعلان کیا۔

۳۔ حرمت استغفار مشرک

خداوند متعال نے انبیاء کرامؑ اور مومنین کو مشرکین کے لئے استغفار طلب کرنے سے منع فرمایا ہے۔

مردہ مشرکین کیلئے مغفرت طلب نہیں کی جاسکتی:

ایک اصول جو قرآن میں بطور واضح پیش ہوا ہے۔ وہ انبیاء و مومنین کو یہ حق حاصل نہیں وہ شرک پر مرنے والوں کیلئے طلب مغفرت کریں۔ سورہ توبہ آیت ۱۱۳ میں ابراہیمؑ بت شکن تو درکنار یہ حق عام مومنین کو بھی نہیں کہ وہ مردہ مشرکین کیلئے طلب استغفار کریں:

﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ﴾ ”نبی اور ایمان والوں کو یہ

حق نہیں پہنچتا کہ وہ مشرکوں کے لیے مغفرت طلب کریں“ (توبہ/۱۱۳)

لیکن جب ہم ابراہیم علیہ السلام کی زندگی سے متعلق آیات کی طرف رخ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے والدین کی مغفرت کیلئے دعا گو ہیں:

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ﴾ ”ہمارے رب مجھے اور

میرے والدین اور ایمان والوں کو بروز حساب مغفرت سے نواز“ (ابراہیم/۳۱)

اس آیت سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے آزر ابراہیم علیہ السلام کا باپ نہیں کیونکہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والدین کیلئے طلب مغفرت کی لہذا وہ آپ کے حقیقی باپ یقیناً مشرکین میں سے نہیں ہو سکتے بلکہ وہ موحد اور خدا پرست تھے۔ اگر کوئی سورہ مریم ۷۴ اور متحدہ ۳ سے استدلال کرے کہ ابراہیمؑ نے آزر کیلئے طلب مغفرت کی ہے تو اسکا جواب خود ان آیات میں ہے کہ یہاں طلب مغفرت شرط ہے کہ آزر بت پرستی چھوڑ دیں تو ابراہیم علیہ السلام طلب استغفار کریں گے۔

والد حضرت ابراہیمؑ کا تعین:

قرآن کریم میں جس سے حضرت ابراہیمؑ نے ”یا آبا“ کہہ کر خطاب کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے والد ”آزر“ نہیں تھے جو آپ کی دعوت توحید کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے بت پرستی میں مرے آیا یہی آپ کے چچا یا کوئی اور رشتہ دار تھے یا آپ کے والد حقیقی وہ ہیں جنکا نام ماہر

ین و انساب اور محققین سیر و تاریخ نے ”تاریخ“ بتایا ہے جن کے حق میں تعمیر بیت کے موقع پر طلب مغفرت کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ موحد تھے کیونکہ کسی مسلمان انسان یا نبی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ کسی شرک پر مرنے والے کے لیے طلب مغفرت کرے۔

۳۔ ابراہیمؑ کی اپنے والدین کے لئے مغفرت:

تعمیر کعبہ کے اختتام پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے والدین کے لئے دعائے مغفرت کی ہے۔

ذبح عظیم کا فدیہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب بابل سے ہجرت کر کے فلسطین کی طرف گئے تو وہاں درگاہ خداوندی سے اپنے لئے اولاد صالح کی دعا کی تو خداوند متعال نے ان کی دعا کو قبول فرمایا:

”پروردگار! مجھے صالحین میں سے (اولاد) عطا کر چنانچہ ہم نے انھیں ایک برادر بیٹے کی بشارت دی پھر جب وہ ان کے ساتھ کام کاج کی عمر کو پہنچا تو کہا: اے بیٹا! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں پس دیکھ لومہاری کیا رائے ہے اس نے کہا: اے ابا جان! آپ کو جو حکم ملا ہے اسے انجام دیں اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے پس جب دونوں نے (حکم خدا کو) تسلیم کیا اور اسے ماتھے کے بل لٹا دیا تو ہم نے ندا دی: اے ابراہیم! تو نے خواب سچ کر دکھایا ہے شک ہم نیکو کاروں کو ایسے جزا دیتے ہیں یقیناً یہ ایک نمایاں امتحان تھا اور ہم نے ایک عظیم قربانی سے اس کا فدیہ دیا اور ہم نے آنے والوں میں ان کیلئے (ذکر جمیل) باقی رکھا“ (صافات/ ۱۰۸ تا ۱۱۰)

یہاں سے ہر شخص کی ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے آیا انسان گمشدہ سے بھی خدا سے قرب حاصل کیا جاسکتا ہے اگر ایسا ہے تو اس سے دین اسلام دشمنوں کے نقد و تنقید کا نشانہ بنے گا اور بعض گمراہ اور لادین ادیان بھی اس کو اپنے غلط عمل کیلئے سند بنائیں گے لہذا ضروری سمجھتے ہیں انسان کی

قربانی کے مسئلہ پر بحث کی جائے:

ارمان و آرزوؤں کی خاطر انسانی قربانی:

اپنی حاجتوں آرزوؤں تک رسائی یا خدا کی خوشنودی کی خاطر کسی اور انسان کو یا اپنی عزیز اولاد کو ذبح کرنے کی داستانوں کو دینی رنگ پہنایا گیا ہے جس میں سے چند کا ہم تذکرہ کریں گے۔

۱۔ حضرت اسماعیل کی قربانی جو سورہ صافات آیت نمبر ۱۰۰ سے ثابت ہے۔

۲۔ حضرت عیسیٰ روح اللہ کی قربانی جسے یہودیوں اور مسیحیوں کی کتب میں گھڑا گیا ہے۔

۳۔ حضرت عبداللہ کی قربانی کی داستان جسے یہودیوں نے گھڑ کر مسلمانوں کی کتب میں شامل کیا ہے۔

نذر عبدالمطلب سے متعلق تاریخ طبری جلد اول میں بیان کیا گیا ہے راوی کہتا ہے ہم ایک دن معاویہ ابن ابی سفیان کے دربار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ذبح حضرت اسماعیلؑ یا اسحاقؑ ہونے کا سوال اٹھا تو معاویہ نے کہا تم حقیقت سے تم دور ہو گئے ہو ایک دن ہم رسول اکرمؐ کے پاس بیٹھے تھے تو ایک شخص رسول اللہؐ کے پاس آکر مخاطب ہوا یا رسول اللہؐ خدا نے جن نعمتوں سے آپ کو نوازا ہے وہ مجھے ایک ایک کر کے بیان کریں۔ جن میں سے ایک ذبح یحییٰؑ بھی ہے پیغمبر مسکرائے تو کسی نے پوچھا یا رسول اللہؐ ذبح یحییٰ کون ہیں تو آپؐ نے فرمایا عبدالمطلب کو جب حکم ہوا وہ چاہہا زہم زہم کھودے تو انھوں نے خدا سے نذر کی اگر اس میں مجھے آسانی ہو جاتے تو میں ایک بیٹے کو ذبح کروں گا جب نوبت آئی تو قرعہ عبد اللہ کے نام پر نکلا تو عبد اللہ کے ماموں نے منع کیا اور اپنے بیٹے کا سوانح فدیہ دیا یہی قصہ کامل فی التاريخ ابن اثیر میں بھی بغیر کسی سند کے درج ہے۔

دوسری روایت جب حضرت عبدالمطلب نے دیکھا کہ پورے قریش ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں تو خدا سے نذر کی اگر خدا نے انہیں دس بیٹے دئے اور وہ بڑے ہو گئے اور ان سے دفاع کرنے لگے اور قریش کے مقابلے کیلئے اٹھے تو تقرب خدا کی خاطر ایک کو ذبح کروں گا یہ قصہ اور

جگہ پر بھی ذکر ہوا ہے۔

تیسری روایت عبدالمطلب نے جب چاہ زم زم کھودنا چاہا تو قریش نے انکی مخالفت کی تو انھوں نے نذر کی کہ اگر خدا نے ان کو دس فرزند عطا کئے اور وہ اس عمر کو پہنچے کہ قریش کے مقابلے میں ان کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں اور ان سے دفاع کریں تو ان میں سے ایک کو کعبہ لے جا کر قربان کروں گا جب ان کی تعداد دس ہوگئی اور وہ اس مرحلے پر پہنچے ان کا دفاع کر سکیں تو عبدالمطلب نے اپنے بچوں کو اس نذر سے آگاہ کیا انھوں نے اطاعت کی اور کہا اس سلسلے میں ہم کیا کر سکتے ہیں تو عبدالمطلب نے کہا تم میں سے ہر شخص ایک ایک برتن اٹھائے اس میں اپنا اپنا نام لکھے اور ان کو کعبہ کے اندر سب سے بڑے بت ہبل کے سامنے رکھ دے۔ عبدالمطلب نے قرعہ نکالنے والے سے کہا یہ برتن ہمارے بیٹوں کے ہیں میں نے ان میں سے ایک کو ذبح کرنے کی نذر کی ہے آپ ان میں سے ایک کے نام قرعہ نکالیں ان فرزندوں میں سب سے چھوٹے اور عزیز عبد اللہ تھے۔ قرعہ نکالنے والے جب قرعہ نکالنے کیلئے اٹھے تو عبدالمطلب دعا کرنے لگے، قرعہ نکالنے والے نے عبد اللہ کے نام پر قرعہ نکالا تو عبدالمطلب اس کے ہاتھ کو پکڑ کر بت اساف اور نائلہ کے پاس لائے تاکہ وہاں ذبح کریں تو قریش بے ساختہ اٹھ کھڑے ہوئے اور عبدالمطلب سے کہا تم کیا چاہتے ہو۔ خدا کی قسم اس کو ذبح نہ کریں ہم اس کے متبادل کی چارہ جوئی کریں گے اگر یہ سلسلہ چل پڑا تو یہ ایک سنت بن جائے گی اور ہمارے سارے بیٹے ذبح ہوں گے تو مغیرہ بن عبد اللہ بن عمرو بن مخزوم نے کہا اگر کاہن مال فدیہ دینے کیلئے کہے تو تمہارے لئے آسان ہوگا وہ سب اس کے پاس گئے تو اس نے اونٹ کے فدیہ کے بارے میں حکم دیا تو عبد اللہ اور اونٹ میں قرعہ اندازی ہوئی جب اونٹوں کی تعداد سو کو پہنچی تو عبد اللہ کی جگہ اونٹوں کے نام قرعہ نکالا اس طرح عبد اللہ ذبح ہونے سے بچ گئے یہاں سے عبد اللہ کا لقب ذبیح ہوا۔

تیسرا واقعہ جسے عام طور پر ذاکرین اور مقررین مصیبت امام حسین علیہ السلام میں ذکر کرتے

ہیں کہ امام حسینؑ نے علی اکبرؑ اور علی اصغرؑ کو خدا کی رضایت حاصل کرنے کیلئے انھیں ذبح ہونے کیلئے پیش کیا۔

یہاں دنیائے کفر و شرک کی طرف سے یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ اسلام کیسا مذہب ہے جہاں انسانوں کی قربانی کی سنت رائج ہے اس مذہب کی کیا منطق ہو سکتی ہے اسکے علاوہ اس عمل میں کوئی خوبی و حسن ہے جبکہ انکا دین خود کہتا ہے کوئی انسان کسی انسان کا بندہ نہیں بلکہ انسان پیدا ہوتے ہی آزاد پیدا ہوتا ہے۔ اگر والد داد یا کسی ولایت کو تصرف حاصل ہے تو وہ صرف خیر خواہی تک محدود ہے چنانچہ نوحؑ البلاغہ کلام نمبر ۳۱ پیرا گراف نمبر ۷ میں ہے:

”تم کسی کے بندے نہیں خدا نے تمہیں آزاد قرار دیا ہے“۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ابراہیمؑ غلیل اللہ اپنے بیٹے کو اپنے محبوب کی خاطر قربان کریں اور اسی طرح حضرت عبدالمطلبؑ اپنی خواہش و ارمان کی خاطر اپنے بیٹے کو قربان کریں۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کام کرنے سے انکی خواہش و ارمان تو چلتیں پوری ہوئیں وہ تو خدا سے نزدیک ہوئے لیکن مقتول بے چارے کا کیا قصور تھا اس منطق سے خود مذہب کے اصول و قوانین میں ہلکی نظر آتی ہے اس کے علاوہ تمام اقوام و ملل خصوصی طور پر کتب آسمانی خاص طور پر قرآن کریم کی کثیر آیات میں انسان کشی کو ایک بڑا جرم قرار دیا ہے ممکن ہے غیر مسلم یہ سوال اٹھائیں ہم مانتے ہیں پورا قرآن ٹھیک ہے لیکن آپ ہمیں اس سوال کا جواب دیں، لہذا یہ سوال ان افراد کیلئے تو کوئی مسئلہ نہیں جو ذکر اور خطیب سے تمام ضد و نقیض سننے کے عادی ہیں انکا کام تو بس سننا اور جاتے ہوئے تہرک لے کر جانا ہے یہ اپنے اوپر کسی ذمہ داری کا احساس نہیں کرتے اور کہتے ہیں تحقیق کرنا ہماری ذمہ داری نہیں اور خاص کر ایسی جگہ جہاں تحقیق کرنے والے کو ”مفسد فی الارض“ کا لقب دیا جاتا ہو وہاں وہ افراد جو اسلامی آئیڈیالوجی کا دفاع کرنا چاہیں وہ کہاں جائیں وہ ان مخالفین کے پھیلانے جانے والے اشکال و اعتراضات کا کیا جواب دیں۔ یہ سوال ایک چیلنج ہے قارئین کرام کے سامنے کتاب میں اس سوال کا جواب پڑھنے

سے پہلے ان افراد سے درخواست کریں جو نقد و اعتراض کرنے کے عادی ہیں وہ اس سوال کا جواب از خود پیش کریں اور ہمیں اپنے خیالات سے نوازیں۔

قتل نفس

۱۔ کسی انسان کو تکلیف و ضرر پہچانے یا قتل کرنے کا حق صرف اس کے مالک حقیقی کو ہی حاصل ہے۔ اس کائنات میں ملکیت حقیقی صرف خدا کو حاصل ہے۔ ملک، منلک، مالک سب کا مادہ ایک ہی ہے ان تمام کے مفہوم کی برگشت کسی چیز پر تسلط اور غلبہ حاصل ہونے کی طرف ہے یہ تسلط اور غلبہ ذات اور فرع دونوں سے متعلق ہو سکتا ہے۔

۲۔ اعتباری ملکیت: یعنی شریعت نے ایک چیز کو کسی انسان کی ملکیت کی طرف نسبت دی ہے جیسے غلام، کنیز اور دیگر متاع دنیا وغیرہ۔

۳۔ ملکیت منافع: کسی چیز کی منفعت پر تسلط حاصل ہوتا ہے۔ جیسے کرایہ اور نکاح وغیرہ۔

۴۔ ملکیت حکومتی: اجتماع کے نفع و نقصان کا اختیار ہونا۔

۵۔ ملکیت نفس: ایک مہذب انسان اپنے نفس پر تسلط حاصل کرتا ہے۔

مندرجہ بالا ملکیت میں انسان کا دوسرے انسان پر حق تصرف ایک محدود حد تک ہی ہے اور اسکی حدود قرآن و سنت میں بیان ہوئی ہیں لیکن تسلط کامل صرف مالک حقیقی کو ہی حاصل ہے وہ خالق مٹی و میت و مربی ہے اور وہ ذات باری تعالیٰ ہی ہے مندرجہ ذیل آیات کریمہ ملاحظہ فرمائیں:

﴿قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكُ الْمَلَائِكَةِ مُتَوَكِّلٌ ۖ تَبْتَغِي السَّلَاطَةَ وَتَنْزِعُ الْمَلَائِكَةَ مِمَّنْ تَشَاءُ ۚ وَتَعَزُّزُ مِمَّنْ تَشَاءُ ۚ وَتَدُلُّ مِمَّنْ تَشَاءُ ۚ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۚ﴾ ”کہہ دیجئے: اے اللہ! اے مملکت

(ہستی) کے مالک تو جسے چاہے حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہے حکومت چھین

لیتا ہے اور تو جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے ذلیل کر دیتا ہے بھلائی تیرے

ہی ہاتھ میں ہے“ (آل عمران ۲۶) آل عمران ۱۸۹، ۱۱۶، مائدہ ۲۰، اسراء ۱۱۱۔

لہذا جسکی ملکیت محدود ہے اسکا ان حدود سے زائد تصرف کرنا ظلم کہلائے گا کسی انسان کو دوسرے انسان کو مارنے یا قتل کرنے کا حق حاصل نہیں مگر جہاں خدا کا حکم موجود ہو چنانچہ قرآن کریم کی کثیر آیات میں قتل نفس کی ممانعت آئی ہے سوائے وہاں جہاں مالک حقیقی کی طرف سے حکم ہو۔ موجودہ تمام ادیان میں قتل نفس اہمہات محرمات جیسے شراب، جھوٹ، فساد فی الارض سے بھی زیادہ بڑا گناہ ہے۔

۱۔ خود اپنے نفس کو قتل کرنے کی ممانعت:

﴿وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ﴾ ”اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو“ (نساء/۲۹)

۲۔ کسی کو ناحق قتل کرنے کا کسی کو حق نہیں اور غلطی پر کفارے کا ذکر:

﴿وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَا فَتَحَرِيرَ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَّةٌ مُسْلِمَةً إِلَىٰ أَهْلِهَا إِنْ بَصَدَّقُوا﴾ ”اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ ایک مومن کو غلامی سے آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو خون بہادے یا پھر یہ کہ وہ خون بہا معاف کر دیں“ (نساء/۹۲)

۳۔ جو کسی مومن کو قتل کرے گا اسکا ٹھکانہ جہنم ہے اور اس پر خدا کا عذاب:

﴿وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَحَزَّاءُ جَهَنَّمَ﴾ ”جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزا جہنم ہے“ (نساء/۹۳)

۴۔ خود کو قتل کرنے والے سے کہنا میں یہ عمل تمہارے ساتھ نہیں کروں گا:

﴿لَنْ يَسُطَ إِلَيْكَ يَدُكَ لِتَقْتُلَنِي مَا أَنَا بِسَاطِئِ يَدِي إِلَيْكَ لَا قَتْلُكَ﴾ ”اگر تو مجھے قتل کرنے کیلئے ہاتھ بڑھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کیلئے ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا“ (مائدہ/۴۸)

۵۔ بھائی نے بھائی کو قتل کیا اور خسارے میں رہا:

﴿فطوعت له نفسه قتل اخيه فقتله فاصبح من الخاسرين﴾ ”آخر کار اس کے
 نفس نے اپنے بھائی کا قتل اس کیلئے آسان کر دیا اور وہ اسے مار کر ان لوگوں میں شامل
 ہو گیا جو نقصان اٹھانے والے ہیں“ (ماہ/۳۰)

۶۔ جس نے کسی ایک شخص کو قتل کیا اس نے پوری انسانیت کو قتل کیا:

﴿من قتل نفسا بغير نفس او فسادا في الارض فكأنما قتل الناس جميعا﴾ ”جس
 نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل
 کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا“ (ماہ/۳۲)

۷۔ قتل روئے زمین میں سرکشی کے برابر ہے:

﴿كم اماقتل نفسا بالامس ان تريد الا ان تكون جبارا في الارض﴾ ”جس طرح
 کل ایک شخص کو قتل کر چکا ہے؟ تو اس ملک میں جبار بن کر رہنا چاہتا ہے“ (نفس/۱۹)

۸۔ قتل اولاد کی مذمت:

﴿قد حسر الذين قتلوا اولادهم سفها بغير علم﴾ ”یقیناً خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ
 جنہوں نے اپنی اولاد کو جہالت و نادانی کی بنا پر قتل کیا“ (انعام/۱۳۰)

۹۔ بغیر حق کسی کو قتل نہیں کر سکتے:

﴿ولا تقتلوا النفس التي حرم الله الا بالحق﴾ ”اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم
 ٹھہرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ“ (انعام/۱۵۱)

۱۰۔ اولاد کو فاقہ کے خوف سے قتل نہ کرو:

﴿ولا تقتلوا اولادكم خشية املاق﴾ ”اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ
 کرو“ (اسراء/۳۱)

۱۱۔ مقتول کے ولی کو قصاص کا حق:

﴿وَمَنْ قَتَلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لَوْلِيهِ سُلْطَانًا﴾ ”اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو اس

کے ولی کو ہم قصاص کے مطالبے کا حق عطا کیا ہے“ (اسراء/۳۲)

۱۲۔ اولاد کو قتل کرنے والے سے بیعت نہ لینا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يَبِيَعُكَ عَلَىٰ أَنْ لَا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ

وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلُوا أَوْلَادَهُنَّ﴾ ”اے نبی، جب تمہارے پاس مومن عورتیں بیعت

کرنے کیلئے آئیں اور اس بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ

کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی“ (ممتحنہ/۱۲)

۱۳۔ انسان کا خلیفہ بننے کے موقع پر فرشتوں کی گفتگو:

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن

يُفْسِدُ فِيهَا.....﴾ ”پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں

سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں انھوں نے عرض کیا: کیا آپ

زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے

گا اور خوریزیاں کرے گا؟“ (بقرہ/۳۰)

۱۴۔ ایک دوسرے کو قتل نہ کرنے کا عہد لینا:

﴿وَإِذَا حَضَرَ نَمِيشَا قُمْ لَاتَسْفِكُونَ دِمَائَكُمْ﴾ ”پھر ذرا یاد کرو، ہم نے تم سے مضبوط

عہد لیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہانا“ (بقرہ/۸۴)

مندرجہ بالا آیات میں قتل نفس کو شریعت میں امہات محرمات میں شامل کیا گیا ہے یہ فعل شریعت

آسمانی میں ابتداء سے ہی قبیح و مردود چلا آ رہا ہے مذہب تشیع کی اساس و بنیاد میں سے ہے تمام

احکام شریعت تابع حسن و قبح عقلی ہیں اسی اصول کے تحت حضرت آدم صلی اللہ کی تخلیق کے موقع پر

اور خلافت کی خلعت عطا ہونے کے موقع پر ملائکہ نے درگاہ خداوندی میں فرمایا یہ گروہ خون بہائے

گیا اور قتل نفس کرے گا لہذا محرمات اصلی کو تقرب خدا کی خاطر نذر نہیں کر سکتے۔ جس طرح خدا کی خوشنودی کی خاطر شراب نہیں پی جاسکتی، مال حرام کھایا نہیں جاسکتا، اس طرح قتل نفس بھی تقرب کا ذریعہ نہیں بن سکتا چاہے یہ اپنے عزیز یا اولاد کا ہی کیوں نہ ہو۔ قتل نفس وہاں ہی صحیح ہے جہاں حکم شریعت موجود ہو۔ اس اصول کے تحت کوئی بھی انسان اپنی امیگوں اور اربابوں کی خاطر اپنی اولاد کو قتل کرنے کی نذر نہیں کر سکتا اس طرح یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوتی ہے کہ حضرت عبدالمطلب کا پیغمبر اکرمؐ کے والد کو ذبح کرنے کی نذر کرنے کا واقعہ عقل اور روایات قرآنی سے متصادم و متعارض ہے۔

عبدالمطلب اور نذر، ذبح و فرزند:

تاریخ طبری اور کامل ابن اثیر میں اس روایت کا راوی معاویہ بن ابوسفیان ہے۔ اور بعض اسے سند بخشنے کیلئے ابن عباس اور اہل بیت علیہ السلام کی طرف نسبت دیتے ہیں اسکی سند پر کسی بھی حوالے سے اعتماد و اطمینان نہیں کر سکتے، اگلا مرحلہ اس روایت کے مضمون کا ہے اس نذر کو ہم چند حوالوں سے نقد و انتقاد کا موضوع بنائیں گے:

۱۔ یہ ایسی نذر ہے جس پر عمل کرنے کی کافرو مشرک اور کابین بھی مخالفت کر رہے ہیں چنانچہ قریش اور ان کے فرزندان اور کابین نے بھی اس نذر پر عمل کرنے سے منع کیا یہاں اس روایت کا کھوکھلا ہونا واضح ہو جاتا ہے۔

۲۔ آیا تاریخ بشریت میں حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر خاتم انبیاء تک اور کتب آسمانی میں یا کسی امام سے کوئی ایسی روایت ملتی ہے کہ انسان نذر کیلئے اپنی اولاد کو ذبح کر سکتا ہے تاکہ اسے غمونہ بنا کر اسے حضرت مطلب کے حوالے سے تطبیق کر سکیں۔

۳۔ کتاب بحار انوار جلد ۱۵ صفحہ ۱۲۷ حدیث نمبر ۶۷ میں پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہے آپ نے حضرت

علی سے خطاب کر کے فرمایا عبدالمطلب کبھی بھی کوئی حکم فیصلہ یا راز و نیاز بتوں سے نہیں کرتے تھے اور نہ بتوں پر ذبح ہونے والا گوشت کھاتے تھے بلکہ فرماتے تھے کہ میں اپنے باپ ابراہیمؑ کے دین پر ہوں اسی طرح اسفغ ابن نباتہ نے حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا واللہ میرے باپ عبدالمطلب اور نہ ہاشم نہ عبدالمناف بت پرستی کرتے تھے بلکہ وہ خدا کی عبادت کرتے تھے وہ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے، ان روایات کو سامنے رکھنے کے بعد آپ اس سابق روایت کے بارے میں فیصلہ کر سکتے ہیں جہاں عبدالمطلب نے اپنے بیٹے عبد اللہ کو ہبل کے سامنے قرعہ ٹکانے اور اسحاق و نائلہ کے سامنے ذبح کرنے کے لئے لے گئے۔ حالانکہ وہ بت پرست نہیں تھے۔

۴۔ تاریخ طبری جلد دوم میں ہے کہ ایک عورت نے اپنے بیٹے کو کسی مشکل کے وقت کعبہ کے سامنے ذبح کرنے کی نذر کی، جب اسکی حاجت بر آئی تو یہ عبد اللہ بن عمر کے پاس گئی اور پوچھا آیا اس پر عمل کرنا واجب ہے یا نہیں، تو انھوں نے کہا مجھے معلوم نہیں خدا کا حکم نذر کے بارے میں وفا کے علاوہ کوئی نہیں تو عورت نے پوچھا اس کا مطلب ہے کہ میں اپنے بیٹے کو ذبح کروں تو ابن عمر نے کہا خدا نے تمہیں قتل کرنے سے منع کیا ہے جواب متفاد ہونے کی وجہ سے عورت عبد اللہ بن عباس کے پاس آئی تو عبد اللہ بن عباس نے کہا اپنے بیٹے کے بدلے میں سواونٹ ذبح کرے جس طرح عبدالمطلب نے کیا اس وقت حاکم مدینہ مروان بن حکم تھا اس نے یہ حکم سننے کے بعد کہا ابن عمر اور ابن عباس نے غلط فتویٰ دیا ہے کیونکہ معصیت خدا پر نذر ہوتی ہی نہیں لہذا تم استغفار کرو مروان کے اس فتویٰ پر سب اہل مدینہ خوش ہوئے۔

نذر عبدالمطلب کے قصے میں یہودیوں کا کردار:

مختلف تاریخی واقعات میں آیا ہے علماء انصاری نے جب حضرت محمدؐ کو بچپن میں دیکھا تو حضرت

عبدال مطلب و ابوطالب سے اس بچے کو یہود سے بچانے کیلئے کہا۔ چنانچہ راہب نے حضرت ابوطالب سے کہا اس بچے کو یہود سے بچا کر رکھیں۔ اگر انھیں پتا چلا تو وہ اسے قتل کر دیں گے کیونکہ یہود نے حضرت مسیح کو قتل کرنے کی سازش بھی کی ہے لیکن انھوں (یہود) نے حضرت عبداللہ کو مدینے میں زہر سے قتل کیا اور اس راز کے فاش ہونے سے بچنے کی خاطر نذر عبدال مطلب کی ایک من گڑھت کہانی بنائی، ان تمام کوششوں کے باوجود یہ روایات اپنے ضعف و تضاد کے ساتھ کثیر آیات قرآنی کے بھی خلاف ہیں لہذا اس روایت نذر عبدال مطلب کی تصحیح کرنے اور اسکا دفاع کر نیکی ہر کوشش غلط ہے جس طرح شراب پینے، گناہ کبیرہ کرنے مال حرام کھانی کی نذر کرنا صحیح نہیں اسی طرح اولاد کو ذبح کرنا بھی نص قرآنی کے تحت حرام ہے اور حرام حرام ہی رہتا ہے۔

حضرت عیسیٰ کی قربانی

عیسائی اپنے عقیدے کے مطابق حضرت مسیح کو کافر سمجھتے تھے اور انھیں قتل کرنا چاہتے تھے اس خوف سے حضرت عیسیٰ ان کی نظروں سے چھپے حضرت مسیح کے ایک پیروکار جس کا نام یہو زائے اخر ہوتی تھا اس نے مال کے لالچ میں آکر حضرت مسیح کی نشاندہی کرائی چنانچہ یہودیوں نے جمعہ کی رات کو نماز کے بعد حضرت مسیح کو گرفتار کیا اور انھیں کہانت کے گھر لے گئے جہاں انھیں قتل کا مستحق قرار دیا پھر والی رمان کے گھر لے گئے جس نے سولی پر چڑھانے کا حکم دیا۔ جمعہ کی صبح کو مسیح کو دار پر چڑھایا اور انھیں اس وقت موت آئی جب وہ چیخ چیخ کر پکار رہے تھے کہ الہی الہی مجھے کیوں چھوڑا عصر کے وقت انھیں تختہ دار سے اتار کر قبر میں دفن کیا ہفتہ کا دن گزر گیا اتوار کی رات بھی گزر گئی جب اتوار کی صبح کو قبر میں دیکھا تو قبر خالی تھی۔

مسیحیوں کا عقیدہ ہے مسیح کی موت درحقیقت حضرت آدم صلی اللہ کی ان غلطیوں کا کفارہ تھی جو ان کی اولاد میں سرایت کر چکی تھیں لہذا ان کا قتل اولاد آدم کے گناہوں کا کفارہ واقع ہوا ہے وہ

اس سلسلہ میں یہ سند پیش کرتے ہیں انجیل یوحنا میں آیا ہے کہ حضرت مسیح کہتے ہیں میں وہ صالح رائی ہوں جو اپنے نفس کو غلطیوں کے خلاف بدل کے طور پر دے گا تاکہ مجھ پر ایمان لانے والے سب ہلاک نہ ہوں بلکہ انھیں ابدی زندگی نصیب ہو فرزند انسان اس لئے نہیں تاکہ وہ آقا بنے اور لوگوں سے خدمت لے لے، وہ اس کی خدمت کرے اور اپنے نفس کو بہت سے لوگوں کے بدلے میں فدیہ کے طور پر پیش کرے، انجیل یوحنا میں مذکور ہے اس طرح مسیح نے اپنے نفس کو ہمارے لئے پیش کیا ہے وہ ہماری خاطر قربان ہوا ہے وہ خدا کا ذبیح ہے طیب و خوشبو کا حامل ہے۔ قارئین کرام آپ سب جانتے ہیں ان کی یہ فکر اپنی سند و نسبت میں بے ہودہ و غلط ہونے کے علاوہ عقل و شرع اور ادیان عالم کے تحت بھی بے بنیاد ہے کیونکہ بنی آدم کے وہ گناہ جو گذر گئے ہیں وہ توبہ سے قابل بخشش تھے ان کیلئے مسیح جیسی ہستی کی قربانی دینے کی ضرورت نہیں اگر آنے والے گناہوں کی بخشش ہے تو اس کا مطلب یہ ہے حضرت مسیح آئندہ آنے والے مسیحیوں کے گناہ کو بخشوانا ہی نہیں بلکہ حلال کرنا چاہتے تھے گویا حضرت مسیح شریعت کے خاتمے کیلئے آئے تھے نہ کہ امت کی بخشش کیلئے۔ اسی طرح عیسائی ایک اور فلسفہ جو حضرات مسیح کے سولی چڑھنے کے بارے میں پیش کرتے ہیں وہ اس دارکشی کو اپنی جگہ خود بخود فضیلت و شرافت گناتے ہیں جو اپنی جگہ مسئلہ کو زیادہ پیچیدہ اور عقل سے بے بہرہ بنانے میں زیادہ اثر رکھتا ہے یہاں سے وہ آخر میں یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ چیزیں مافوق العقل ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنا۔

اس سلسلے میں اس واقعہ کو ملاحظہ فرمائیں جو قرآن کریم میں بیان ہوا ہے:

ترجمہ: ”پھر جب وہ ان کے ساتھ کام کاج کی عمر کو پہنچا تو کہا: اے بیٹا! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں پس دیکھ لو تمہاری کیا رائے ہے اس نے کہا: اے ابا جان! آپ کو جو حکم ملا ہے اسے انجام دیں اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے پس جب

دونوں نے (حکم خدا کو) تسلیم کیا اور اسے ماتھے کے بل لٹا دیا، تو ہم نے ندا دی: اے ابراہیم! تو نے خواب سچ کر دکھایا ہے شک ہم نیکوکاروں کو ایسے ہی جزا دیتے ہیں، یقیناً یہ ایک نمایاں امتحان تھا اور ہم نے ایک عظیم قربانی سے اس کا فدیہ دیا“ (صافات/۱۰۷ تا ۱۰۹)

مندرجہ بالا آیات کریمہ کے فقرات پر سرسری و سطحی نظر کرنے کے بعد ایک عام انسان کے لئے یہ بات روز روشن کی طرح واضح و عیاں ہو جاتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کو ذبح کر نیکی نذر نہیں کی۔

- ۱۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس ذبح کرنے کے عمل کو رویت خواب سے مربوط کیا۔
 - ۲۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس ذبح کی ذمہ داری و مسئولیت کو حضرت اسماعیلؑ کے ذمہ کیا۔
- ان نقاط کو مد نظر رکھنے کے بعد واضح ہوا شریعت اسلام میں ایک انسان دوسرے انسان کو چاہے وہ اس کا عزیز ہو قریبی دوست ہو یا دشمن کسی صورت میں بھی قتل کرنے کی اجازت نہیں ہے جب تک خداوند متعال از خود حکم نہ کرے یہ حق صرف خداوند متعال کو ہی حاصل ہے وہ جہاں اپنی خلائق کو تخلیق کر سکتا ہے وہاں اسے فنا بھی کر سکتا ہے۔ اور اسی طرح دوسرے کو اس کے قتل کا حکم بھی دے سکتا ہے مثلاً جس طرح گوسالہ پرستی کرنے والوں کو ایک دوسرے کو قتل کرنے کا حکم بھی خدا نے دیا۔ اسی طرح قصاص مفسدین فی الارض اور خدا و رسولؐ سے جنگ کرنے والوں کے بارے میں قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے دو فرزند تھے ایک اسماعیلؑ اور دوسرے اسحاقؑ۔ حضرت اسحاقؑ کے فرزند یعقوبؑ سے بنی اسرائیل کی نسل چلی ہے۔

تحریف کلام اللہ کے ماہر جبر و اسرائیلیوں نے قرآن میں موجود قصہ ذبح میں ذبح کو حضرت اسحاقؑ قرار دینے کی بھرپور کوشش کی ہے لیکن جب ہم اس سلسلہ میں وارد آیات قرآنی کو دیکھتے ہیں تو ان سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ بڑھاپے تک صاحب اولاد نہیں تھے حضرت ابراہیمؑ اور ان

کی زوجہ محترمہ اولاد سے مایوس ہو چکے تھے جیسا کہ سورہ ذاریات کی آیت ۲۹ اور سورہ ہود کی آیت ۷۲ سے واضح ہے:

﴿فَاقْبَلْتُ امْرَأَتِي فِي صُرَّةٍ فَصَكَتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوزٌ عَقِيمٌ﴾ ”اور ان کی زوجہ چلائی ہوئی آئیں اور اپنا منہ پیٹنے لگیں اور بولیں: (میں تو) ایک بڑھیا (اور ساتھ) بانجھ (بھی ہوں)“

﴿قَالَتْ يَوْلَنِي ثَالِدُوا نَاعُوجُوزٌ وَهَذَا بَعْلِي شَيْخًا﴾

”وہ بولی: ہائے میری شامت! کیا میرے ہاں بچہ ہوگا جبکہ میں بڑھیا ہوں اور یہ میرے میاں بھی بوڑھے ہیں؟“

اس دوران حضرت سارہ نے اپنی کنیز ہاجرہ کو حضرت ابراہیمؑ کیلئے ہبہ کیا جس سے حضرت اسماعیل پیدا ہوئے:

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ﴾

”شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے اس بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق جیسے بیٹے دیئے“ (ابراہیم/۳۹)

حضرت اسماعیل کے پیدا ہونے کے بعد جب سارہ نے حضرت ابراہیمؑ کی توجہ ہاجرہ واسماعیل کی طرف دیکھی تو انھیں اپنی نظروں سے دور لے جانے کو کہا۔

وہ وقت حضرت ابراہیمؑ پر کتنا بھاری گذرا ہوگا وہ ابراہیمؑ جو اپنے آپ کو ہمیشہ رضائے خدا کیلئے وقف کئے ہوئے تھے جو منظر حکم خدا رہتے تھے، خداوند عالم نے ان کی رہنمائی کرتے ہوئے حکم دیا کہ اس فرزند اور اس کی ماں کو میرے گھر کے پاس لے جائیں تو حضرت ابراہیمؑ ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کو لے کر خانہ خدا میں پہنچے اور ان کو وہاں چھوڑا جیسا کہ سورہ ابراہیم کی آیت ۳۷ میں ذکر آیا ہے:

﴿رَبَّنَا نَتْلُو اسْمُكَ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ

المحرم﴾ ”پروردگار، میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لایا ہے“

لہذا حضرت اسماعیلؑ اس خانہ خدا کے جوار میں پرورش پانے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ اس گھر کے معمار بنے:

﴿وَإِذْ تَرَفَعَ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ﴾ ”اور یاد کرو ابراہیم اور اسماعیل جب اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے“ (بقرہ/۱۲۷)

ذبح، اسماعیلؑ ہے یا اسحاقؑ

قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دو فرزند ان کی بشارت دی گئی ہے۔ جن میں سے حضرت اسماعیلؑ یعنی جن کی صفت میں ”علیم“ کہا ہے اور دوسرے حضرت اسحاقؑ ہیں جنکی صفت میں ”علیم“ بیان کیا گیا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بڑھاپے کی عمر میں خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے فرزند کو اپنے ہی ہاتھوں ذبح کر رہے ہیں آپ نے اسکا ذکر اپنے بیٹے سے کیا اور پوچھا بیٹا تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے:

﴿فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰ بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرَىٰ

قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمُرُ مَسْتَجِدِّنِ إِذَا شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصُّبْحِ﴾ ”پھر جب وہ ان کے ساتھ کام کاج کے عمر کو پہنچا تو کہا: اے بیٹا! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں پس دیکھ تو تمہاری کیا رائے ہے اس نے کہا: اے ابا جان! آپ کو جو حکم ملا ہے اسے انجام دیں اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے“ (صافات/۱۰۲)

تو فرزند نے جواب دیا آپ کو جو حکم خداوند کریم کی طرف سے ہوا ہے اس پر عمل کریں آپ مجھے

﴿انشاء اللہ صابرین میں سے پائیں گے جب دونوں تسلیم ہوئے اپنی جبین اطاعت خدا میں زمین پر رکھی تو خداوند عالم نے عداوی آپ نے خواب کو بچ کر دکھایا اور ہم محسنین کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں اور بے شک یہ بہت بڑی آزمائش تھی اور ہم نے اسکے بدل میں فدیہ دیا یقیناً جو فرزند خدا کی رضا میں اس حد تک تسلیم ہوئے وہ ایک عظیم فرزند ہیں، حضرت محمد خاتم انبیاء آپ ہی کی نسل سے ہیں یہاں یہود بنیغیر اکرم کی دشمنی میں اس حد تک گئے کہ انھوں نے کتاب خدا میں بھی تحریف کی جسکی ایک مثال انھوں نے اس ذبح عظیم کو حضرت اسحاق سے منسوب کیا قرآن کریم میں بشارت حضرت اسماعیل اور اسحاق کا ذکر مندرجہ ذیل آیات میں آیا ہے:

﴿وَبَشِّرْهُ بِاسْمٰحقَ نَبِیّٰمِنَ الصّٰلِحِیْنَ۔ وَبِزَکٰوٰتِہٖ وَ عَلٰی اسْمٰحقَ﴾

”اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق کی بشارت دی کہ وہ صالحین میں سے نبی ہونگے۔ اور ہم

ان پر اور اسحاق پر برکات نازل کیں“ (صافات/۱۱۲، ۱۱۳) سورہ ۲۹ سے ۷۳، حجر ۵۱، ۵۲ اور

ذاریات ۲۳ سے ۳۰۔

یہود کی یہ تحریف کہ ذبح عظیم سے مراد حضرت اسحاق ہیں اسکی حقیقت نہ ہونے کو کیسے ثابت کیا جائے۔ اس سلسلے میں قصص انبیاء کے ماہرین اور محققین نے ذبح عظیم سے مراد حضرت اسماعیل کو ثابت کرنے کیلئے ان دلائل سے استدلال کیا ہے۔

۱۔ قصہ ذبح بیان کرنے کے بعد خداوند عالم نے حضرت ابراہیم کو اسحاق اور انکی نبوت کی بشارت دی جس سے واضح ہوتا ہے کہ اسحاق ابھی پیدا ہوئے لہذا وہ ذبح نہیں ہو سکتے۔

۲۔ حضرت ابراہیم علیہ سلام نے درگاہ خدا میں فرزند کیلئے دعا کی تو خداوند متعال نے انھیں حضرت اسماعیل عنایت کیے جیسا سورہ صافات کی آیات میں ذکر ہے جبکہ حضرت اسحاق کی بشارت قصہ ذبح کے بعد دی ہے۔

۳۔ جس وقت خداوند متعال نے حضرت ابراہیم علیہ سلام سے فرزند کو ذبح کرنے کی آزمائش کی

اور اسے ایک بڑا امتحان قرار دیا یہ امتحان اس وقت بڑا ہو سکتا ہے جب فرزند ایک ہی ہو۔

۴۔ خداوند عالم نے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت سارہ کو حضرت اسحاق کے ساتھ ہی حضرت یعقوبؑ کی بھی بشارت دی لہذا ذبح سے مراد حضرت اسحاق کو مراد نہیں لیا جاسکتا کیونکہ کیسے ممکن ہے کہ خداوند عالم ایک طرف تو انھیں ذبح کرنے کا حکم دیں اور ساتھ ہی یعقوبؑ کی بھی بشارت دیں لہذا ذبح عظیم سے مراد حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی ہیں۔

۵۔ تاریخ میں ذکر ہے جس گوسفند کو حضرت اسماعیلؑ کی جگہ ذبح کیا گیا اسکے سینک کعبہ پر آویزاں تھے یہ اس بات کی دلیل ہے ذبح سے مراد حضرت اسماعیلؑ ہیں کیونکہ انھوں نے ہی مکہ میں قیام کیا جبکہ حضرت اسحاقؑ شام میں رہے۔

۶۔ خداوند عالم نے حضرت اسماعیلؑ کی صفت میں انھیں صابر کہا ہے:

﴿وَأَسْمِعِيلَ وَإِدْرِيسَ وَذَا الْكِفْلِ كُلٌّ مِنَ الصَّابِرِينَ﴾ ”اور اسماعیلؑ وادریسؑ اور ذوالکفلؑ کو بھی (اپنی رحمت سے نوازا) یہ سب صبر کرنے والے تھے“ (انبیاء/ ۸۵)

یہاں حضرت اسماعیلؑ کے خاص صبر کا ذکر ہے جبکہ ایسی آزمائش حضرت اسحاقؑ پر نہیں آئی:

﴿وَإِذْ كَرَّمْنَا نُوْحًا إِذْ قَامَ رَبُّهُ لِيُخْبِرَهُ بِأَمْرِهِ إِذْ يَمْلِكُ﴾ ”اور اس کتاب میں اسماعیلؑ کا ذکر کیجئے وہ یقیناً وعدے کے سچے اور نبی مرسل تھے“

(مريم/ ۵۴)

۷۔ فطری حوالے سے انسان کو اس کا بڑا بیٹا عزیز ہوتا ہے اور خاص کر انسان جب بڑھاپے کی دہلیز پر ہو اور ساتھ ہی یہ بیٹا بہت سی دعاؤں کے بعد ملا ہو۔ حضرت ابراہیمؑ کا لقب خلیل ہے اور خلیل وہ ہے جس کے دل میں خدا کے سوا کسی اور کی محبت نہ ہو لہذا خداوند عالم نے انھیں اپنے فرزند کو ذبح کرنے کا حکم دیا۔

توحید اور شرک میں تضاد

ابراہیم علیہ السلام کا مقابلہ مشرکین اور بت پرستوں کے ساتھ

قرآن کریم میں روئے زمین پر انبیاء کی بعثت کی غرض و غایت اور فرائض میں شرک اور بت پرستی کے خلاف جنگ و جہاد اور توحید خدا کا رواج دینا قرار دیا ہے۔ لیکن ہر نبی کو اپنے دور میں ایک خاص قسم کی بت پرستی کا سامنا ہوا۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بت انسان کا سامنا ہوا۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہر قسم کی بت پرستی کا سامنا ہوا جن میں انسانوں کے جعل کردہ بت ستارہ پرست اور بت حکمران بھی شامل تھے۔ اسی لئے قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بت پرستی سے نیرو آزمانی میں صف اول میں شمار کیا گیا ہے قرآن نے کبھی آپ کو کلمہ ”ضیف“ سے متعارف کروایا یعنی آپ ابتداء سے ہی حق کی طرف جھکنے والے ہیں، کبھی کلمہ ”قانت“ سے متعارف کروایا یعنی درگاہ خدا میں خاضع و خاشع اور ہر قسم کی بت پرستی سے پاک و منزہ شخصیت ہیں ملاحظہ کریں:

﴿مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلٰكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا﴾ ”ابراہیم نہ یہودی

تھے نہ عیسائی بلکہ وہ یکسوئی کے ساتھ مسلم تھے“ (مران/ ۶۷) بقرہ ۱۳۵، انفام ۱۶۲، نحل/

۱۲۳۔ ﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اٰمَةً قَانِتًا لِلّٰهِ حَنِيفًا﴾ ”ابراہیم (اپنی ذات میں) ایک امت

تھے اللہ کے فرمانبردار اور (اللہ کی طرف) یکسو ہونے والے تھے“ (نحل/ ۱۲۰)

ان آیات کو سامنے رکھتے ہوئے ہم پر واضح ہوتا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیسے بت اور بت پرستوں کا مقابلہ کیا اور اپنے جنگ و جہاد میں کیا اسلوب اپنایا۔ اس سلسلے میں ہم گفتگو کو آگے بڑھانے کیلئے قرآن کی روشنی میں شرک و بت پرستی کے مصادیق بیان کرتے ہیں۔

قرآن کریم کی ۱۰۷ سے زائد آیات میں انسانوں کو خدا سبحانہ کے علاوہ کسی قسم کے معبود و مطاع

بنانے کو مسترد کیا گیا ہے اور اسے ایک بڑا ظلم قرار دیا ہے:

﴿وَمَن اتَّخَذْتُمُ الْعَجَل مِّنْ بَعْدِهِ وَاَنْتُمْ ظَالِمُونَ﴾ ”پھر تم نے اس کے بعد گوسالہ

کو (بغرض پرستش) اختیار کیا اور تم ظالم بن گئے“ (بقرہ/۵۱)

اسکے علاوہ مشرکین کو بخش کہا ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ﴾ ”مشرکین تو بلاشبہ ناپاک ہیں“ (توبہ/۲۸)

مشرکین کو خدا کی نافذ کردہ حدود سے تجاوز کرنے والا قرار دیا ہے:

﴿وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَالْكَفُورُ الَّذِي يَتَجَادَىٰ مَعَهُ الظَّالِمُونَ﴾ ”جو لوگ حدودِ الٰہی سے تجاوز کرتے

ہیں پس وہی ظالم ہیں“ (بقرہ/۲۲۹)

شرک کو کفر کہا ہے:

﴿وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾

”اور ظالم وہی لوگ ہیں جنہوں نے کفر اختیار کیا“ (بقرہ/۲۵۴)

مشرکین کو خدا اور رسول پر تہمت باندھنے والا قرار دیا ہے:

﴿فَمَن اخْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ مِن بَعْدِ ذَلِكَ فَاولئك هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ ”اُس کے

بعد جنہوں نے اللہ کی طرف جھوٹی نسبت دی وہی لوگ ظالم ہیں“ (آل عمران/۹۴)

حکم خدا کو نافذ نہ کرنے والا قرار دیا ہے:

﴿يُحْكَمُ بِمَا نَزَلَ اللَّهُ فَاولئك هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ ”اور جو اللہ کی نازل کردہ حکم کے

مطابق فیصلہ نہ کریں پس وہ ظالم ہیں“ (مائدہ/۴۵)

قرآن کریم میں شرک اور بت پرستی سے متعلق آیات کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ خدا کے مقابل کسی اور کو خالقِ مذہبِ ربی، منعمِ محسن قرار دینا۔

خدا کے علاوہ کسی اور کے سامنے خاضع و خاشع ہونا اور اظہارِ تذلیل کرنا شرک کے مصداقِ حلی میں

سے ہے:

﴿ويعبدون من دون الله مالا يضرهم ولا ينفعهم..... سبحانه وتعالى عما يشركون﴾ ”اور یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ان کی پرستش کرتے ہیں جو نہ انھیں ضرر پہنچا سکتے ہیں اور نہ انھیں کوئی فائدہ دے سکتے ہیں..... وہ پاک و بالائے اس شرک سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں“ (یونس/۱۸) ﴿ان الذين تدعون من دون الله عبادا مما لكُم فادعوهم فليستحيوا لکم ان كنتم ضدقین﴾

”اللہ کے سوا تم جنہیں پکارتے ہو بے شک وہ تمہاری طرح کے بندے ہیں پس اگر تم سچے ہو تو تم انھیں ذرا پکار کر تو دیکھو انھیں چاہئے کہ تمہیں (تمہاری دعاؤں کا) جواب دیں“ (اعراف/۱۹۳) تم ۲۳

۲۔ حکم خدا کے بغیر کسی فرد کی اطاعت اور فرمانبرداری اختیار کرنا۔

اطاعت ہمیشہ مولا کی ہے۔ آیات قرآنی میں بندگان کا حقیقی مولا صرف خداوند سبحانہ ہے اس کے علاوہ کسی اور کی اطاعت صحیح نہیں۔ خدا اور رسول سے استناد کیے بغیر اگر کسی کی اطاعت کی تو یہ عمل واضح بت پرستی میں شمار ہوگا جیسا کہ سورہ مبارکہ توبہ آیت ۳۱ میں اسکا ذکر آیا ہے:

﴿اتخذوا احبارہم ورهبانہم اربابا من دون الله والمسیح ابن مریم وما امروا الا لیعبدوا اللہا واحدا لا الہ الا هو سبحانه عما يشركون﴾ ”انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور ربابوں کو اپنا رب بنالیا ہے اور مسیح بن مریم کو بھی حالانکہ انھیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ خدائے واحد کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ذات ان کے شرک سے پاک ہے“

۳۔ حکم خدا یا اسکی طرف سے دی گئی نسبت کے بغیر کسی کی تقدیس و احترام کرنا۔

بعض افراد کا یہ اسرار ہے شرک کو تہا تعدد خالق کے معتقد ہونے والوں تک محدود رکھیں انکا کہنا

ہے کسی چیز کے احترام کرنے کو شرک نہ قرار دیا جائے۔ یعنی انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جسے مناسب سمجھے اسے احترام دے لیکن آیات قرآنی کی رو سے خداوند متعال نے یہ حق اپنے پاس رکھا ہے۔ جسے خدا محترم قرار نہ دے بندوں کو اس کا احترام کرنے کا حق حاصل نہیں۔ جاہلیت عرب بعض حیوانات کو انتہائی احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ لیکن خداوند متعال نے انکے اس عمل کو مسترد کیا جس کا ذکر سورہ مائدہ ۱۰۳ میں موجود ہے:

﴿مَا جَعَلَ اللَّهُ مِنْ بَحِيرَةٍ وَلَا سَائِبَةٍ وَلَا وَصِيلَةٍ وَلَا حَامٍ وَلَكِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ﴾ ”اللہ نے نہ کوئی بحیرہ مقرر کیا ہے نہ سائبہ نہ وصیلہ اور نہ حام۔ مگر یہ کافر اللہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں۔“

فلسفہ و حکمت بعثت انبیاء کے بارے میں وارد آیات سے واضح ہوتا ہے کہ انبیاء عظام کی بعثت کا بنیادی مقصد روئے زمین پر اس خالق متعال کی خالقیت کے تمام مراتب درجات تخلیق مواد و شکل و صورت مزاج و خاصیت عبادت و بندگی خضوع اور اطاعت سب کو اس ذات کیلئے مخصوص کرنے کی خاطر اور اس راہ میں حائل تمام قسم کے طاغوت چاہے انسانی شکل میں ہوں یا جہل و نادانی عداوت و دشمنی بت پرستی و خود پرستی مفاد پرستی و منفعت پرستی فرد پرستی یا تنظیم پرستی کی صورت میں ہوں غرض ہر قسم کی انواع و اشکال شرک کا خاتمہ کرنا ہے اس سلسلہ میں ہم یہاں فلسفہ عبادت و بندگی اور شرک و بت پرستی اور ان دونوں سے مشابہ بت پرستی کی منطق کو قرآن کریم کی آیات سے پیش کریں گے۔

توحید

توحید یعنی خدا کو ذات و صفات و فعل میں واحد و یکتا و منفرد سمجھنا انبیاء الہی نے جب اپنی دعوت الی اللہ شروع کی تو لوگوں سے کہا اس ذات کی عبادت و پرستش کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلوں کو خلق کیا ہے لیکن لوگوں نے انکے مد مقابل یوں آواز اٹھائی ”وہ وسواع کو مت چھوڑنا کسی نے

کہا اپنے خداؤں کی مدد کرو کسی نے کہا تعجب کی بات ہے یہ بہت سے خداؤں کو ایک کرنے کی بات کرتے ہیں، اس طرح لوگوں نے بت پرستی پر باقی رہنے کا اعلان کیا۔ انبیاء نے کہا خدا کی ذات و صفات و فعل میں ایک کی پرستش کرنا بہتر ہے یا بہت سے خداؤں کی پرستش کرنا اسی طرح توحید و شرک کی جنگ شروع ہوئی ہے لہذا قصہ نوع و ابراہیم مناسب ترین جگہ ہے اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کرنے کی۔

شرک:

کسی فرد چیز یا فکر و تصور کو خداوند متعال کے لئے یا اس ذات کے برابر میں قرار دینے کو شرک کہتے ہیں شرک اللہ جل جلالہ کو چھوڑ کر کسی اور کی طرف رخ کرنے کو کہتے ہیں جبکہ شرک خفی جو ظاہری طور پر اللہ تعالیٰ کے لئے اور اندر سے کسی اور چیز کو شامل کرے۔ شرک جلی کے بہت سے مراتب ہیں:

دون:

یعنی کسی کی بد نسبت غیر یا حقیر ناقص پست تر پیچھے کیلئے استعمال ہوتا ہے قرآن کریم میں بہتر (۷۲) بار من دون اللہ من دون الرحمن من دونہ کی صورت میں خدا سے ہٹ کر کسی اور کی عبادت حاجت طلب کرنا اور خاضع ہونے سے منع کیا ہے، اٹھارہ (۱۸) بار غیر اللہ یا غیر الہی کی کلمہ سے کسی اور کی طرف رجوع کرنے والوں کی مذمت و ملامت کی ہے جن آیات میں یہ کلمہ استعمال ہوا ہے:

﴿وَمَالِكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وِلِيِّهِ وَلَا نَصِيرَ﴾ اور اللہ کے سوا تمہارا کوکار سا ز اور

مددگار نہیں (بقرہ/۱۰۷) ﴿وَيُغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ﴾ اس کے علاوہ

دیگر گناہوں کو جس کے بارے میں چاہے گا معاف کر دے گا (نساء/۴۸) جن ۱۱ مریم

۱۷، قصص ۲۳، زمر ۶۲، بقرہ ۹۴۔

عربی قواعد میں دون، فوق کے مقابل ہے۔ یعنی منزل سے پہلے، کسی سے پست دکھانے پیچھے

سے پہلے دکھانے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

﴿يُحْيِي ابْنُ مَرْيَمَ ثَلَاثَ قُلُوبٍ لِلنَّاسِ اتَّخَذُوْنِي وَاُمِّي الْيَهُيْمَيْنِ دُونَ اللَّهِ﴾ ”اے عیسیٰ بن مریم کیا آپ لوگوں نے سے کہا تھا کہ اللہ کے سوا مجھے اور میری والدہ کو خدا بناؤ؟“ (نور/۱۱۶) ﴿مَالِمُ دُونَهُ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا يَشْرُكَ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا﴾ ”اس کے سوا ان کا کوئی سرپرست نہیں اور نہ ہی وہ کسی کو اپنی حکومت میں شریک کرتا ہے“ (نہ/۲۹) بقرہ/۲۲۔

جس طرح اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے اسی طرح بعض چیزوں میں غیر خدا کو بطور استقلال یا بطور اختیار سپرد کرنا، وکالت دینا کو شرک در خالقیت کہتے ہیں قرآن کریم میں غیر خدا سے ہر قسم کی خالقیت کی نفی کی گئی ہے اللہ تعالیٰ نے جن آیات میں خالقیت کو اپنے لئے مختص کیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

﴿بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ”وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے“ (انعام/۱۰۲) ﴿قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلِ اللّٰهُ﴾ ”ان سے پوچھئے: آسمانوں اور زمین کا پروردگار کون ہے؟ کہہ دیجئے: اللہ ہے“ (زمر/۱۶) طہ/۳، زمر/۶۲، غافر/۶۲، حشر/۲۳، طور/۳۵، واقفہ/۵۹، مؤمنون/۴، صافات/۱۲۵، حجر/۸۶، تہیں/۸۱۔

خداوند عالم کے مقابل میں بطور استقلال کوئی شریک نہیں بن سکتا اگر ایسا ہوتا تو دونوں خالق اپنی مخلوق سمیت دیا ر عدم کی طرف زوال و فنا کا شکار ہو جاتے:

﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اِلٰهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ ”اگر اس آسمان و زمین میں اللہ کے سوا خدا ہوتا تو دونوں کا نظام درہم برہم ہو جاتا“ (انبیاء/۲۲)

اللہ تعالیٰ تخلیق کا ذات کسی اور کو سپرد کر دے، یہ بھی ناممکن ہے اس کا امکان نہ ہونے کے بارے میں قرآن کریم کی وہ آیات ہیں جو معجزات انبیاء کے بارے میں ہیں جہاں اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو فعل معجزات کا مظہر اور اصل فاعل اپنی ذات کو دکھایا ہے۔

تاریخ بت پرستی، بت سازی اور بتوں کو فروغ اور ترویج دنیا

بت پرستی کی پیدائش کب اور کیسے ہوئی اور کس طرح یہ اپنے ارتقائی مراحل کی طرف بڑھی یہ ایک اہم موضوع ہے۔ بت پرستی قدیم زمانے سے اقوام و ملل میں ایک وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا عمل ہے چنانچہ اس ضمن میں دو حوالوں سے گفتگو کی جاسکتی ہے ایک بت پرستی اور دوسرا بت سازی جہاں تک بت پرستی کا تعلق ہے اس کی تعریف یوں ہے کہ غیر خدا کی اطاعت اور اس کے سامنے خضوع و خشوع کرنا۔ تاریخ میں بت پرستی و بت سازی قدیم دور سے جاری ہے لیکن بت سازی یعنی بت بنانے اور ان کی شکل و صورت میں گزشتہ زمانے کے ساتھ ساتھ تبدیلی ہوتی رہی ہے سورہ ہود کی آیت ۵۶ اور ۶۲ میں بت پرستی کے بارے میں قوم عاد کے بارے میں ذکر آیا ہے جنہوں نے طوفان نوح کے بعد تین بتوں کی پرستش کی:

(۱) صد (۲) صودا (۳) ہرا۔

یہ چاروں عنوان اس باب میں توضیح طلب موضوع ہیں ہر ایک کے بارے میں بطور کامل بیان کی ضرورت ہے۔

۱۔ بت کی تعریف:

یہ ایک ایسا موضوع ہے جسکے آغاز کی دقیق تاریخ پیش کرنا اور اسکی انواع و اقسام کو پیش کرنے سے پہلے ہم بت کے لغوی معانی اردو کتب لغت اور عربی معاجم اور قرآنی اصطلاحات میں پیش کریں گے۔

۱۔ بت اردو کتب لغت میں:

احسن لغات: کتاب احسن لغات کے مطابق بت کے معانی کاٹنا، قطع کرنا اور مورتی کے ہیں بت فارسی کا لفظ ہے۔

بُت: 'مورتی'، 'مورت'، 'پتھر' یا 'پتیل' وغیرہ کی مورت جسکی پرستش کریں۔ 'معشوق'، 'محبوب'، 'خاموش'،
 'گوٹکا'، 'احق'، 'یوقوف'، 'مکا'، 'گھونسہ'، 'ڈک'۔ 'جوار یوں' کا 'کوڑیاں' لڑھکانے کا تختہ، 'مٹی' کا چراندان جسے
 تارکش اپنے کندھوں پر رکھ کر کام کرتے ہیں، 'بت' نیز ذیل کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے
 بتاؤ: 'فریب'، 'دھوکہ'، 'دھونس'، 'جھانسا'، 'حیلہ'، 'بھانہ'۔

بت بننا: 'چپ' ہونا، 'گنگ' ہونا، 'خاموش' ہونا، 'صم'، 'کلم' ہونا۔

بت تراش: 'بت' گر، 'بت' بنانے والا۔

بت خانہ یا بت کدہ: 'بت' رکھنے کی جگہ۔ 'مندر'، 'شوالہ'، 'شودوارہ'۔

بت شکن: 'بت' توڑنے والا۔

بت شکنی: 'بتوں' کو توڑنا۔

کتاب فیروز الغات: اس لغت کے مطابق 'بت' مذکر ہے اور یہ ہندی اور فارسی زبان کا لفظ ہے
 اس کے معانی پانے پھینکنے، چوسنے کی کوڑیاں لڑھکانے کا تختہ۔ 'مکا'، 'گھونسہ'، 'مورتی'، 'مجسمہ'، 'معشوق'،
 'محبوب'، 'چپ'، 'خاموش'، 'گنگ'، 'احق' اور 'مور کھ'، 'جمع'، 'بتان' کے ہیں۔

بتان آذری: آذر کے بنائے ہوئے بت جو بہت خوبصورت ہوتے تھے۔

بت بن جانا: (مخاورہ) 'چپ' اور 'خاموش' ہو جانا

بت بن کر بیٹھنا: بالکل 'خاموش' رہنا۔ کوئی بات نہ کرنا۔

بت بے پیر: بے رحم 'معشوق'۔

بت پرست: 'مورتی' پوجنے والا، 'کافر'، 'مشرک'، 'معشوق'۔

بت پرستی: 'بتوں' کی پوجا، 'مورتی' پوجا۔

بت تراشی: 'بت' گر۔ 'مورتی' بنانے والا۔

بت خانہ: 'بت' کدہ۔ 'شوالہ'۔ 'مندر'۔ 'کدہ'۔ 'مورتی' پوجا کی جگہ۔

بت خانہ آزر: مجوسیوں کا آتش کدہ۔

بت جنکن: بت توڑنے والا۔ موخذ۔ محمود غزنوی۔

بت ہرجائی: بے وفا معشوق جو کسی ایک عاشق کا ہو کے نہ رہے۔

بتا بنانا: بت بنانا۔ دھوکہ دینا، فریب دینا، فقرہ دینا۔

بتا دینا: دھوکہ دینا۔ جھانسنہ دینا۔ دغا دینا۔ بہانہ کرنا۔ ٹالنا۔

بتے بازی: حیلہ بازی، فریب دہی۔

بتے میں آنا: فریب میں آنا۔

اظہر الغات: بت: مورتی، پتلا، صنم، پتھر یا پتیل وغیرہ کی مورت جس کی پرستش کریں، معشوق

محبوب، گرم سم، مدہوش، خاموش، گونگا، اتق، بیوقوف، مکا، گھونسا، ڈک، جوار یوں کا کوڑیاں لڑھکانے

کا تختہ، مٹی کا چراندان جسے تارکش اپنے کاندھوں پر رکھ کر اس کی روشنی میں کام کرتے ہیں۔

بتا: اے بت۔ معشوق سے خطاب۔

بتا: فریب، دھوکہ، دھونس، جھانسنہ، چھیل، حیلہ، بہانہ۔

فرہنگ عمید فارسی: بت:۔ مجسمہ یعنی جو پتھر، لکڑی یا کسی دوسری چیز سے انسان یا حیوان کی شکل

میں بنا کر اسکی پرستش کی جائے۔

معشوق بت خانہ: خانہ بت، معبودیت پرستش۔

یہ تھے بت کے وہ معنی جو ہم نے چار لغات سے پیش کئے۔

اسباب و عوامل بت پرستی:

آیت اللہ جعفر سبحانی دام ظلہ العالی نے اس کے تین بنیادی محرکات بیان کئے ہیں اور اپنی کتاب

”معالم التوحید“ کے صفحہ نمبر ۳۸۳ ان تینوں محرکات کو یوں بیان کیا ہے:

(۱) مخلوقات و موجودات کے بارے میں متعدد خالق و صانع کے اعتقاد سے بت پرستی نے جنم لیا
مثلاً مذہب بوزی میں تخلیق کائنات کو تین خداؤں کی طرف نسبت دی گئی ہے۔

(۱) براہما: وہ خدا جس نے کائنات کی تخلیق کی۔

(۲) فیشو: جو پیدا شدہ کائنات کی محافظت کرتا ہے۔

(۳) سیفا: جو کائنات کو فنا کرتا ہے۔

دین زروشتی میں کائنات کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں سے ایک خیر اور دوسرا شر ہے وہ
کہتے ہیں اچھی چیزیں پیدا کرنے والے خدا کا نام یزدان ہے اور بری چیزیں پیدا کرنے والے خدا
کا نام اہرمن ہے۔

نصرانیت میں بھی یہ تصور موجود ہے۔ وہ تخلیق کائنات کو اب، ابن اور روح القدس کی طرف
نسبت دیتے ہیں اسی طرح نظریہ مشوضہ یعنی خدا نے پہلے آل محمد کو خلق کیا پھر کائنات کی تخلیق اور
تدبیر و اوراق انھیں تفویض کی۔

(۲) خدا کا اپنے مخلوق سے غایب ہونا:

ہر مشرک و بت پرست کا عقیدہ تھا خدا اپنی مخلوق سے دور ہے ان کی اس تک رسائی نہیں کہ وہ اپنی
آواز، نیاز مندی، اور راز و نیاز و مناجات کو خدا تک پہنچا سکیں لہذا انہوں نے یہ گمان کیا یہ چیزیں ان
کی دعاؤں، حاجات اور راز و نیاز و مناجات کو خدا تک پہنچنے کے وسائل میں سے ہیں۔ انہی وسائل
کے ذریعے نیاز مندوں کی حاجات و آرزوئیں خدا تک پہنچتی ہیں چنانچہ بعض افراد نے مظاہر
کائنات مثلاً چاند ستاروں کی پرستش شروع کی، بعض نے دریا کی اور بعض نے اس مقصد کے لئے
انسان کا انتخاب کیا اور حاجت روائی کے لئے انسان کے مجسمے اور بت بنائے اور پھر انکی پوجا پاٹ
شروع کی۔

(۳) تقویٰ بیض :

اپنے اوپر مسلط طاقت و قدرت کے سامنے خاضع ہونا انسان کی فطرت میں پوشیدہ ایک عنصر ہے یہ اپنے اوپر مسلط قدرتوں کے مقابلہ میں خود کو بہت چھوٹا اور کمزور سمجھتا ہے اگر چیز بان و جوارح اسکا اظہار نہیں کرتے لیکن یہ چیز اس کے ضمیر و ضمیر میں موجود ہے لہذا انسان نے یہ تصور کیا کہ وہ موجودات جو اس کے لئے باعث فیوض ہیں یا جن سے کوئی خارق عادت چیز سامنے آتی ہے، وہ ایسی چیزوں کو دیکھ کر یہ سمجھنے لگتا ہے خدا نے کائنات کو تدبیر، خیر و شر، رضا و رغبت اور غیض و غضب کو چھوٹے خداؤں میں تقسیم کر دیا ہے جیسے خدائے دریا، خدائے جنگ، خدائے سلامتی وغیرہ لہذا دریا کے کنارے رہنے والوں نے دریا کو خدائے دریا جان کر اس کی پرستش شروع کر دی تاکہ دریا انہیں اپنی نعمتوں اور فیوض و برکات سے نوازتا رہے اور اپنی طوفان و سیلاب جیسی آفات سے بچائے رکھے۔ اسی طرح بعض لوگوں نے میدانوں اور صحراؤں کے خدا بنائے تاکہ وہ انہیں ایک تو اپنے فیض سے نوازیں اور دوسرا یہ کہ انہیں زلزلوں اور دیگر آفات ارضی سے بچائے رکھیں چونکہ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے خدا کو نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی وہ ظاہری آنکھوں سے خدا کو دیکھ سکتے تھے لہذا انہوں نے خدا کے بارے میں اپنے اندر ایک وہمی و خیالی تصور کو پیدا کر لیا اور پھر اسی وہمی و خیالی صورت کی بنیاد پر مثال و نمونہ کے طور پر بت تراشی کی۔ انہوں نے ان قوتوں کی پرستش شروع کر دی کہ جن سے فیوض و فوائد کے ساتھ ساتھ ضرر و نقصان پہنچنے کا اندیشہ و خطرہ ہر وقت سر پر منڈلاتا رہتا تھا الغرض بعض نے وسائل کے طور پر بت بنا ڈالے اور بعض نے خدا کی خلق کی گئی طاقت و مخلوقات کو بتوں کے طور پر پوجنا شروع کر دیا۔ چنانچہ دور جاہلیت میں بعض لوگ ملائکہ کی پرستش کرتے تھے انہوں نے ملائکہ کے بت بنائے، بعض نے جنوں اور ستاروں کی پرستش شروع کر دی۔

انسان ایک لہے کے لئے بھی آزاد نہیں ہے اور نہ ہی کائنات بھر میں کوئی ایسا انسان یا ایسی قوت موجود ہے جو اسے حکومت خدا سے آزاد کرانے کی سکت رکھتی ہو۔ لہذا کوئی بھی انسان اپنی

سوچ و فکر و پسندیدگی اور اپنی تخصیص کی بنیاد پر عبادت و بندگی کا طریقہ وضع نہیں کر سکتا اور نہ ہی کوئی انسان ایسا کرنے کا اختیار رکھتا ہے کیونکہ وہ قادر مطلق کی مقرر کردہ حدود و قیود اور اوامر و نواہی کا پابند ہے۔ اسے اس دن کا ہر حال میں سامنا کرنا ہو گا جب اس کے ہر قول و فعل کے بارے میں اس سے باز پرس ہوگی لہذا انسان کیلئے کسی کی بطور مستقل بندگی یا شریک قرار دینے یا اسے واسطے کے طور پر استعمال کرنے کے عمل کیلئے کسی اس کے پاس اس کے اس عمل کے بارے میں دلیل ہو۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات میں آیا ہے:

﴿قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ رَحْمَةٌ وَغَضَبٌ اتَّحَادُ لَوْ نَشِئُ عَلَى اسْمَاءٍ سَمِعْتُمْوهَا أَنْتُمْ وَأَبْنَاكُمْ مَا نَزَلَ اللَّهُ بِهِمْ مِنْ سُلْطَانٍ﴾ ”اس نے کہا تمہارے رب کی پھونکار تم پر پڑ گئی اور اس کا غضب ٹوٹ پڑا کیا تم مجھ سے اُن ناموں پر جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں جن کیلئے اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے؟“ (اعراف/۷۱) ﴿فَاتُوا بِسُلْطَانٍ مِثْلِهِ﴾ ”اچھا تو لاؤ کوئی صریح سند.....“ (ابراہیم/۱۱۰) ﴿وَالْيَا تُنِیْ بِسُلْطَانٍ مِثْلِهِ﴾ ”اے میرے سامنے معقول وجہ پیش کرنی ہوگی“ (نمل/۲۱) نم ۲۳، حاقہ ۲۹۔

فلسفہ عبادت و بندگی

جس نقطہ نظر کے تحت خدا پرستان خداوند متعال کے حضور عبادت و بندگی، خضوع و خشوع کے معتقد ہیں وہ ہی فلسفہ مشرکین و بت پرست اپنائے ہوئے ہیں دلیل و منطق دونوں کی ایک ہی ہے لیکن صحیح مصداق اور غلط مصداق کے تعین کرنے میں فرق ہے۔ دونوں کی منطق بت پرستی کی زندگی کی سعادت اور نیک بختی اور شقاوت و بد بختی سے نجات کا ایک بڑا حصہ انسان کے ارادہ و اختیار سے باہر ہے۔ بہت سی نعمتیں و آسائشیں اُسے نصیب ہوتی ہے جو اسکی قدرت سے باہر ہیں جو باہر سے

اسے ملتی ہیں وہ کہاں سے آتی ہیں، کس کی طرف سے آتی ہیں اس بات کی تحقیق کرنے میں بہت سے مضمرات و تکلیف وہ حالات کا انسان کو سامنا ہے اسے روکنا اسکی قدرت سے باہر ہے جہاں تک جو چیزیں انسان کی قدرت و اختیار اور اسکی توانائی کی حدود کے اندر ہیں ان کے بارے میں اسکی فطرت اسے کہتی ہے اپنے فائدے و منفعت کی چیزیں جمع کروں نقصان دہ و ضرر رساں چیزوں سے اجتناب کرو اسی کا نام زندگی ہے۔ زندگی کا دار و مدار فوائد کو اپنی طرف کھینچنا اور ضرر کو اپنے سے دور کرنا ہے یہاں سے انسان اس تلاش میں نکلتا ہے اس کیلئے مسلسل خیرات و نیکی بھیجنے والا کون ہے انسان عاقل اس راہ میں ایسی ذات کی تلاش میں نکلتا ہے جو خود سے اور دیگر مخلوقات سے مافوق کوئی ہستی ہے جو تمام خیرات کا مالک ہے اور تمام چیز اس کے قبضہ و قدرت میں ہے وہ علم و قدرت کا مالک ہے جس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ یہاں سے خدا پرست خداوند متعال کی تلاش میں نکلے لہذا خداوند متعال نے اپنی بندگی کی منطق کو اس فکر پر استوار کیا تمہیں حیات دینے والا کون ہے، تمہیں موت دینے والا۔ اگر ہم حیات دینا چاہیں تو کون اسے روک سکتا ہے، تم جنہیں نفع و نقصان کا مالک سمجھتے ہو وہ تمہارے کسی کام کے نہیں، وہ خود عاجز و ناتواں ہیں انکے پاس کچھ اختیار نہیں، یہ ہے منطق خدا پرستوں کی ہے لیکن ان کے مقابل گروہ، گروہ در گروہ تقسیم ہوئے کسی نے سورج و چاند کی پرستش کی، کسی نے دریا، سیراب اور حیوانات کی کی پرستش کی، بعض نے خود بت تراشے اور بعض نے پتھروں اور ملٹکوں کی طرف نسبت دی۔

عبودیت و بندگی صرف ذات خدا سے مختص ہے:

عبادت مادہ ”عبد“ سے ہے جس کا معنی وہ صاف و شفاف راستہ ہے جو چلنے کیلئے ہموار ہو۔ عبادت کا معنی اپنے مولا کے سامنے اطاعت و ذلت کا اظہار کرنا ہے۔ یہ مفہوم تین طریقوں سے ادا ہو سکتا ہے۔

۱۔ طریقہ تکوینی: جیسا کہ سورہ مبارکہ مریم آیت ۹۳ میں ہے:

﴿ان کل من فی السموات والارض الا اتی الرحمن عبدا﴾

”جو کوئی آسمانوں اور زمین میں سے ہے وہ اس رحمن کے حضور صرف بندے کی

حیثیت سے پیش ہوگا“

ہر چیز خدا کی عہدیت میں ہے:

﴿وہو القاهر فوق عباده﴾ ”اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے“ (انعام/۲۱)

﴿وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون﴾ ”اور میں نے جن وانس کو خلق نہیں

کیا مگر یہ کہ وہ میری عبادت کریں“ (ذاریات/۵۲)

انسان کے ساتھ کائنات کی تمام مخلوقات اپنی حیات و بقاء کیلئے خدا کے سامنے ذلیل و خاضع ہیں۔ اس تعریف میں رضاعت و غیر رضاعت کا کوئی تصور نہیں کیونکہ یہاں عبودیت تکوینی راہ سے انجام پائی ہے۔

۲۔ عبودت اختیاری یا تشریعی:

﴿یایہا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم لعلکم

تتقون﴾ ”لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے والے

لوگوں کو پیدا کیا تاکہ تم (خطرات سے) محفوظ رہو“ (بقرہ/۲۱) ﴿ان اعبدوا اللہ واتقوہ

﴾ ”کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو“ (نوح/۳) اعراف/۲۵، آل عمران/۷۹،

کافرون/۲، آل عمران/۵۱۔

ان تمام آیات میں عبادت، عبودیت، اطاعت، خضوع اختیاری کے معنوں میں آیا ہے۔

۳۔ عبودیت جعلی:

﴿حسب اللہ مثلاً عبداً مملوئاً لا یقدر علی کل شیءٍ ومن رزقہ منا رزقاً حسناً

فہو ینفق منہ سرًا و جہرًا ھل یستون الحمد للہ بل اکثرھم لا یعلمون ﴿﴾ ”اللہ ایک غلام کی مثال بیان فرماتا ہے جو دوسرے کا مملوک ہے اور خود کسی چیز پر قادر نہیں اور دوسرا (وہ شخص جسے ہم نے اپنی طرف سے اچھا رزق دے رکھا ہے پس وہ اس رزق میں سے پوشیدہ و علانیہ طور پر خرچ کرتا ہے کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ ثنائے کامل اللہ کیلئے ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے“ (نحل/۷۵) (بقرہ/۱۷۸)

مندرجہ بالا تین اقسام عبودیت کو بیان کرنے کے بعد قارئین کرام کے لئے یہ مسئلہ واضح و آشکار ہو جائے گا کہ عبودیت اختیاری اگر عبودیت تکوینی کے مطابق ہو تو انسان جادہ مستقیم پر گامزن ہوگا اور اگر عبودیت تکوینی کے خلاف ہوگی تو وہاں ذلالت و گمراہی مقدر ہوگی۔ چنانچہ بت پرستی کی تمام اقسام چاہے وہ موجودات طبعی سے متعلق ہوں یا انسان یا جمادات سے متعلق ہوں یا ملائکہ یا جن سے متعلق ہوں یہ خداوند متعال کی درگاہ میں مردود ہیں کیونکہ عبادت تنہا اسی سے مختص ہے جو خالق و مربی ہے لہذا خداوند متعال نے ان تمام معبودوں اور عبادات کو مسترد کیا ہے جو انسان نے اپنی صوابدید پر اختیار کی ہیں:

﴿اَلَمْ اَعٰہِدَ الْکَیْمَ یٰحٰی اٰدَمُ اَنْ لَا تَعْبُدَ الشَّیْطٰنَ﴾ ”اے اولاد آدم! کیا ہم نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی پرستش نہ کرنا؟“ (البین/۶۰)

﴿و یوم یحشرھم جمیعًا ثم یقول للملآئکۃ اھلّوا لہا کم کسانو اعبدون﴾ ”اور جس دن وہ ان لوگوں کو جمع کرے گا پھر فرشتوں سے پوچھے گا: کیا یہ لوگ تمہاری پرستش کرتے تھے؟“ (سہ/۴۰)

عبودیت و بندگی:

عبادت و بندگی چاہے خداوند متعال کیلئے ہو یا طاغوت کیلئے دونوں کیلئے دلائل و استناد ایک ہی ہیں۔ انبیاء و آئمہ نے خدا کی عبادت و بندگی کیلئے خالق و مالک، رزاق منعم اور محافظ جیسے دلائل سے

استناد کیا ہے۔ لیکن طاغوت کی اطاعت کرنے والوں نے ان دلائل کو اپنے لئے استعمال کیا جبکہ حقیقت میں وہ اپنے زندہ رہنے کیلئے خالق ازلی کے محتاج ہیں۔

عبادت و بندگی انتہائی ذلت و اطاعت کا نام ہے۔ صاحب مجمع البیان میں ہے عبادت ذلت اپنانے کا نام ہے یہاں سے ہی ہموار راستہ کو طریقہ معبد کہتے ہیں۔ غلام کو اس لئے عبد کہتے ہیں کہ وہ انتہائی خشوع و ذلت سے اپنے مولا کی خدمت کرتا ہے، کتاب صحاح لغت میں عبادت کا معنی خضوع و ذلت بیان ہوا ہے اور اسی طرح عبادت بمعنی اطاعت بھی بیان ہوا ہے، اقرب الموارد میں عبادت کا معنی اطاعت بیان ہوا ہے اگر ان تمام معنی کو یکجا کیا جائے تو عبادت کا معنی ایسا اظہار ہے جس میں اطاعت و خضوع دونوں شامل ہوں۔

قرآن کریم میں عبادت بمعنی اطاعت و ذلت دونوں استعمال ہوئے ہیں۔ جیسے سورہ مریم ۴۴ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آزر سے کہا شیطان کی عبادت نہ کرو۔ آزر بت پرست تھا یہاں جو اسے کہا گیا ہے کہ شیطان کی عبادت نہ کرو یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ شیطان کی اطاعت میں بتوں کی پوجا کرتا تھا جو حقیقت میں شیطان ہی کی عبادت تھی۔ اسی طرح سورہ مائدہ ۶۰ میں لفظ عبد طاغوت استعمال ہوا ہے یعنی طاغوت کا مطیع و فرمانبردار۔ خداوند متعال کی عبادت کی دو قسمیں ہیں ایک زندگی میں درپیش مسائل میں اسکے حلال و حرام کی پیروی کرنا ہے چنانچہ مندرجہ ذیل آیات میں عبادت انہی معنوں میں ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَعْبُدُ اللَّهَ عَلَىٰ حَرْفٍ﴾ ”اور لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو اللہ کی یکطرفہ بندگی کرتا ہو“ (ج/۱۱) ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ ”اور ہم نے جن و انس کو خلق نہیں کیا مگر یہ کہ وہ میری عبادت کریں“ (ذاریات/۵۶) ﴿إِنْسِيَ إِلَهَ اللَّهِ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي﴾ ”میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری بندگی کرو“ (ن/۱۳) ﴿وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ﴾ ”اور یہ لوگ

اللہ کو چھوڑ کر ان کی پرستش کرتے ہیں جو نہ انہیں ضرر پہنچا سکتے ہیں اور نہ انہیں کوئی فائدہ دے سکتے ہیں“ (یونس/۱۸) ﴿إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ﴾ ”اللہ کے سوا تم جنہیں پکارتے ہو بے شک وہ تمہاری طرح کے بندے ہیں“ (اعراف/۱۹۳)

دوسری عبادت اظہارِ تذلیل کرنا ہے ایسی تذلیل کا اظہار کرنا جس سے واضح ہو جسکے لیے یہ عمل انجام دیا جا رہا ہے وہ ایک اعلیٰ درجہ پر فائز ہستی ہے جو ہر قسم کے نقص و عیب سے پاک و منزہ ہے:

﴿إِنَّ كُلَّ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا نَحْنُ الرَّحْمَنُ عَبْدًا﴾ ”جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اس رحمن کے حضور صرف بندے کی حیثیت سے پیش ہوگا“ (مریم/۹۳) ﴿قُلْ إِنْ كَانَ لِلرَّحْمَنِ وَلَدٌ فَأَنَا أَوَّلُ الْعَبْدِينَ﴾ ”کہہ دیجئے: اگر رحمن کی کوئی اولاد ہوتی تو میں سب سے پہلے (اس کی) عبادت کرنے والا ہوں“ (زمرہ/۸۱) بقرہ ۱۷۸، نمل ۷۵، شوریٰ ۲۲

مندرجہ بالا آیات کو سامنے رکھتے ہوئے دو حقائق سامنے آتے ہیں ایک تو اس قسم کی تذلیل و خشوع صرف ذاتِ خدا سے مخصوص ہے اور کسی کیلئے یہ عمل سزاوار نہیں۔ دوسرا نقطہ بغیر کسی استفسار کے اس قسم کی اطاعت و فرمانبرداری بھی کسی اور کیلئے جائز نہیں ہے بغیر کسی دلیل و برہان کے نہ تو کسی کے سامنے انتہائی خضوع و خشوع کے جھک سکتے ہیں اور نہ ہی اسکی اطاعت و فرمانبرداری کر سکتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں بعض علاقوں میں ادب اور اطاعت کیلئے پاؤں کو ہاتھ لگایا جاتا ہے جسکی قرآن و سنت سے کوئی دلیل نہیں ملتی، یہ ایک فعلِ حرام ہے اور بت پرستی کی ہی ایک شکل ہے قرآن کریم میں جہاں انبیاءِ آئمہ و اولیاء اور علماء کی اطاعت و پیروی کرنے کا حکم ملتا ہے اسے بت پرستی سے مشابہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس اطاعت کی برگشت خدا ہی کی طرف منتہی ہوتی ہے۔

۱۔ خضوع و خشوع انتہائی: عبادت و بندگی کے مراتب و درجات ہیں جیسے سر جھکانا یعنی رکوع

وہود کرنا جس کے بعد اس سے بہتر اعلیٰ و ارفع خضوع و خشوع کا تصور ممکن نہیں یہ خضوع و خشوع صرف ذات باری تعالیٰ کیلئے ہی مختص ہے اگر یہ کسی غیر خدا کے کیلئے انجام دیا جائے چاہے وہ انبیاء و اولیاء کیلئے ہی کیوں نہ شرک و کفر ہے یہ عمل کسی صورت میں بھی غیر خدا کے کیلئے تحقق پذیر نہیں ہے:

﴿اذ نسو بکم رب رب العلمین﴾

”جب تم کو رب العالمین کے برابر قرار دے رہے تھے“ (شعرا، ۹۸)

۲۔ اطاعت و تسلیم محض: خدا کے ہر امر و نہی کے سامنے خاضع اور فرمانبردار ہونا چاہیے میری نماز پڑھو میرا ذکر کرو میری راہ میں جہاد کرو وغیرہ یا اسکے خاص بندوں کی اطاعت جیسے جو رسول کی اطاعت کرے گا وہ میری اطاعت کرے گا ان اوامر و نہی کی اطاعت میں رسول کی اطاعت ہو یا رسول کی توسط سے جن کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہو جیسے آئمہ طاہرین اور علماء و فقہاء عادل۔ ان کے علاوہ ایسی اطاعت جس کی برگشت خدا کی طرف نہ ہو وہ شرک و کفر ہے چنانچہ روایات میں آیا ہے ہر وہ انسان جو کسی متکلم کے کلام کو سنے اگر وہ متکلم خدا کی طرف نسبت دیتا ہے تو یہ توحید ہے اور سامع نے خدا کی اطاعت کی ہے اگر اس نے اپنی یا کسی اور کی طرف نسبت دی تو اس نے غیر خدا کی عبادت کی ہے۔

۳۔ احترام: جن آیات میں عبادت کو صرف خدا کیلئے مختص کیا گیا ہے ان میں عبادت کے تمام مراتب کا بھی ذکر شامل ہے عبادت کا تیسرا درجہ جو ادنیٰ درجہ ہے وہ احترام ہے وہ احترام جو خدا اور رسول کی طرف سے ثابت نہ ہو وہ خود ساختہ احترام ہے یہ احترام شریعت میں قابل قبول نہیں چنانچہ جو حیوان حاجی نے کعبہ میں قربانی کیلئے مختص کیا ہے خدا نے اسے شعائر اللہ قرار دیا لیکن جن حیوانوں کو مشرکین نے اپنے بتوں کیلئے منسوب کیا ہے سورہ مبارکہ مائدہ کی

آیت ۱۰۳ میں خداوند عالم نے انھیں کوئی احترام نہیں دیا:

﴿ما جعل الله من بحيرة ولا سائبة ولا وصيلة ولا حام ولكن الذين كفروا يفترون على الله الكذب﴾ ”اللہ نے نہ کوئی بحیرہ مقرر کیا ہے نہ سائبہ نہ وصیلہ اور نہ حام۔ مگر یہ کافر اللہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں“

عبادت و بندگی کے تمام مراتب غیر خدا کیلئے قرار دینا شرک ہے۔

بت پرستی اور خدا پرستی

اللہ تبارک تعالیٰ نے جہاں اپنی عبادت و بندگی کا حکم دیا ہے وہیں بت پرستی سے شدت اور سختی سے منع کیا ہے اللہ تعالیٰ نے بت پرستی کو اس دلیل و برہان سے مسترد کیا ہے وہ کسی بھی حوالے سے ہمیں نفع و نقصان پہنچانے سے قاصر ہیں:

﴿قل اتعبدون من دون الله مالا يملك لكم ضرا ولا نفعا والله هو السميع العليم﴾ ”کہہ دیجئے کیا تم اللہ کے سوا ایسی چیز کی پرستش کرتے ہو جو تمہارے نقصان اور نفع پر کوئی اختیار نہیں رکھتی اور اللہ ہی خوب سننے والا ہے“ (مائدہ/۷۶) ﴿قل الانسان احدثتم من دونه اولياء لا يملكون لا نفسهم نفعا ولا ضرا﴾ ”کہہ دیں تو پھر کیا تم نے اللہ کے سوا ایسوں کو اپنا اولیاء بنایا ہے جو اپنے نفع و نقصان کے بھی مالک نہیں ہیں“ (رعد/۱۶) ﴿افلا يرون الا يرجع اليهم قولا ولا يملك لهم ضرا ولا نفعا﴾ ”کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ یہ ان کی کسی بات کو جواب تک نہیں دے سکتا اور وہ نہ ان کے کسی نفع اور نہ کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہے“ (طہ/۸۹) ﴿واتخذوا من دونه الهة لا يخلقون شيئا وهم يخلقون ولا يملكون لا نفسهم ضرا ولا نفعا ولا يملكون موتا ولا حيوة ولا نشورا﴾ ”لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر ایسے معبود بنالے جو کسی چیز کو خلق نہیں کر سکتے بلکہ خود مخلوق ہیں اور وہ اپنے لیے بھی کسی نفع نقصان کا اختیار نہیں

رکھتے اور وہ نہ موت کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ حیات کا اور نہ ہی اٹھائے جانے کا“
(فرقان/۳)

بت ہمیں اس لئے نفع و نقصان پہنچانے سے قاصر ہیں کہ وہ نہ تو ہماری فریاد کو سن سکتے ہیں اور نہ ہی ہماری حالت زار کو دیکھ سکتے ہیں:

﴿اِنَّ تَدْعُوهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دَعْوَاكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ.....﴾ ”اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار سن نہیں سکتے اور اگر سن بھی لیں تو وہ تمہیں جواب نہیں دے سکتے“ (فاطر/۱۴) ﴿اِذْ قَالَ لَآئِهٖ يٰاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْءٌ﴾ ”جب انہوں نے اپنے باپ (پچا) سے کہا اے ابا آپ اسے کیوں پوجتے ہیں جو نہ سننے کی اہلیت رکھتا ہے اور نہ دیکھنے کی اور نہ ہی آپ کو کسی چیز سے بے نیاز کرتا ہے“ (مریم/۴۲) ﴿قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ﴾ ”ابراہیم نے کہا: جب تم انہیں پکارتے ہو تو کیا یہ تمہاری سنتے ہیں“ (شعرا/۷۲)

قرآن کریم میں بت کا تصور اور انکے نام

صنم پرستی یا بت پرستی کا تصور انسان کے اندر کہاں سے داخل ہوا اس کے بارے میں کہتے ہیں لوگ زندگی کے مسائل و ضروریات کے بارے میں خاص اسباب رکھتے ہیں انسان جب روشنائی چاہتا ہے تو سورج کو دیکھتا ہے کہ یہ طلوع ہوا رات کو انھیں چاند نظر آتا ہے طاقت و قدرت کے مظہر میں پہاڑ کو دیکھتا ہے اس کو اپنی زندگی کے اسباب میں دیکھتے ہیں۔ صنم بننے سے پہلے انسان ستاروں کی پوجا کرتے تھے صنم پرستی اس کے بعد میں وجود میں آئی ہے لیکن صنم پرستی اور ستارہ پرستی میں گہرا رشتہ ہے جب انسان نے ایک چیز کو دیکھا جو اسے فائدہ دے سکتی ہے تو وہ ہر فائدہ کو اسی کی طرف نسبت دیتا ہے انسان اپنے اندر قوت کو دیکھتا ہے تو اسے اچھا سمجھتا ہے لیکن انسان نے سوچا کہ خالق اشیاء غیب ہے تو اس نے ظاہر کی پرستش شروع کی، جب انسان نے دیکھا کہ ستارے

غروب ہوتے ہیں تو بعض نے کہا کیوں نہ اس کی جگہ صنم بنائیں تاکہ وہ ہمیں ان چیزوں کی یاد دلاتے رہیں یہیں سے سورج اور چاند کی شبیہ بنی، یہاں سے یہ واضح ہوا کہ بت ستاروں کی یاد دلانے کیلئے وجود میں آئے ہیں یہیں سے کہتے ہیں کہ انسان اس سبب سے غافل نہ ہو جو ان اسباب کے پیچھے ہے جتنی عقل ترقی کرے گی اسباب و دراسباب بنائے گی سلسلہ اسباب ختم ہو کر اس مسبب تک پہنچ جائے جہاں مخلوق سبب بنانے سے عاجز آجائے وہیں سے خالق شروع ہوتا ہے جو افراد اسباب کے فریفتہ ہوتے ہیں وہ سمجھتے ہیں یہ اسباب خود مسبب ہیں بت پرستی کے شروع ہونے کا امکان وہ جگہ ہے جہاں انسان کی نظروں سے دین چھپ جاتا ہے انسان اپنے گرد و نواح دیکھنا شروع کرتا ہے کون سی چیز اس کیلئے نقصان دہ اور کون سی چیز فائدہ مند ہے اور پھر غلط مصداق کا تعین کر کے اسکی پرستش شروع کرتا ہے۔

”ضلالت“ یعنی کسی منزل کو تلاش کرتے ہوئے راستہ گم ہو جائے۔ بت پرست یہ گمان کرتے تھے کہ یہ سب کچھ انھیں کے مرہون منت ہیں یہاں سے ہی یہ اصل راستے سے منحرف ہوئے اور سبب اصلی کو درک نہ کر سکے۔ یہاں اسباب نے انھیں مسبب تک نہیں پہنچایا یہاں آکر انسان ایک ایسی چیز کے سامنے رک گیا جو اس خدا کی مخلوق ہے زمین کی طرف ’سورج‘ چاند ستارے‘ بادلوں کی طرف (جب وہ بارش برسائے) پہاڑوں کی طرف جھلکنا شروع کیا۔ انسان کو چاہئے تھا اس مسئلہ کی طرف دیکھتا کہ ان فوائد کو ان چیزوں نے خلق نہیں کیا‘ پست سے پست چیز وجود میں آنے کیلئے کسی صانع کی محتاج ہے مثلاً ایک کپ کو لے لیں جس سے ہم چائے پیتے ہیں وہ چند دین مراحل سے گزرنے کے بعد ہمارے ہاتھ میں آیا ہے کس نے اس کے مادہ کو کشف کیا‘ کس نے اس کو شکل میں لایا، اسی طرح اس چراغ کو دیکھیں جس کے وجود کیلئے کتنی وسائل فکری و مادی صرف ہوئے ہیں مثلاً تاری کو لے لیں‘ کاخانہ‘ لوہے اور آگ ان سب مراحل سے گزر کر بنا ہے تو اس سورج کے بارے میں آپ کیا کہیں گے کہ جو پورے کرۂ زمین کو روشنی دیتا ہے۔ اس میں نہ کوئی

تار ہے اور نہ ہی کسی لمحہ اس کی روشنی میں کمی آتی ہے ہم نے سکولوں میں پڑھا تھا کس نے اس بجلی کو ایجاد کیا کتنے لوگوں نے ہمیں بجلی بنانے والے کے بارے میں تعجب اور حیرت کے ساتھ دروس دیئے لیکن کسی نے یہ درس نہیں دیا کہ پوری دنیا کو روشنی دینے والی بجلی کو کس نے پیدا کیا ہے ہم ہمیشہ نزدیک والے سبب پر ہی رکتے ہیں ہمیں گہرائی تک سوچنے اور فکر میں عمق پیدا کرنے کیلئے سلسلہ سبب میں تسلسل جاری رکھنا چاہئے تاکہ مسبب اصلی تک پہنچ جائیں چنانچہ انبیاء آئے ہیں ہمیں ان چیزوں کے خالق کا بتانے کیلئے یعنی سبب اصلی سے متعارف کروانے کیلئے۔

(۱) ”صنم“:

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ
كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ
مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا﴾ ”تم میں سے جو لوگ ایمان
لے آئے ہیں اور نیک اعمال بجالائے ہیں اللہ نے ان سے وعدہ کر رکھا ہے کہ انھیں
زمین میں اسی طرح جانشین ضرور بنائے گا جس طرح ان سے پہلوں کو جانشین
بنایا اور جس دین کو اللہ نے پسندیدہ بنایا ہے اسے پائیدار ضرور بنائے گا اور انھیں خوف
کے بعد امن ضرور فراہم کرے گا وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ
ٹھہرائیں“

یہ کلمہ قرآن کریم میں بھی چندین بار آیا ہے، صنم جسکی جمع اصنام ہے جیسا کہ سورہ مبارکہ
ابراہیم ۳۵ میں آیا ہے:

﴿وَاجْتَنِبْنِي وَبَنِيَّ ان نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ﴾ ”اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا“
”صنم“ اس ڈھانچے کو کہتے ہیں جو چاندی، تانبے یا لکڑی سے بنایا گیا ہو جو جسم کے ساتھ شکل و
صورت کا بھی حامل ہو۔ یہ کلمہ قرآن میں پانچ مرتبہ آیا ہے:

﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لَأَبِيهِ إِذْ رَأَىٰ أَنِ اتَّخَذَ صَنَامًا مِّنَ الْهَتَكِ﴾ ”اور جب ابراہیم نے اپنے باپ
 آزر سے کہا کیا تم بتوں کو معبود بناتے ہو“ (ابراہیم/۵۷) ﴿فَاتَّوَا عَلَىٰ قَوْمٍ يَعْكُفُونَ
 عَلَىٰ صَنَامِهِمْ﴾ ”وہ ایسے لوگوں کے پاس پہنچ گئے جو اپنے بتوں کی پوجا میں لگے
 ہوئے تھے“ (اعراف/۱۳۸) ﴿وَتَاللَّهِ لَا كَيْدَ لَنَا صَنَامًا مَّكَمٌ بَعْدَ أَن تُولُوا مُدْبِرِينَ﴾
 ”اور اللہ کی قسم جب تم یہاں سے پیٹھ پھیر کر چلے جاؤ گے تو میں تمہارے ان بتوں کی
 خبر لینے کی تدبیر ضرور سوچوں گا“ (انبیاء/۵۷)

ارباب ماہرین لغت عرب کا کہنا ہے کہ صنم اصل میں عجمی کلمہ ہے جیسا کہ کتاب لغت تاج
 العروس میں آیا ہے صنم اصل میں کلمہ عجمی ہے۔ لیکن اس میں یہ ذکر نہیں یہ کلمہ کس زبان سے ماخوذ
 ہے۔ بعض نے کہا یہ کلمہ یورپی زبان کے لفظ SELEM سے بنا ہے جو کہ عبری سے لیا گیا ہے۔ اسی طر
 ح بعض نے کہا ہے صنم صالم سے ماخوذ ہے جو زبان عبرانی آرمیانی سے ہے۔

کتب تاریخ اور اخبار میں نقل ہے سرزمین حجاز مکہ میں سب سے پہلے ”صنم“ نصب کرنے والا
 شخص عمر ابن لُحی ہے جس نے ایک بت سرزمین شام سے لا کر مکہ کے کسی کنواں پر نصب کیا اور لوگوں
 کو کہا کہ اس کی پوجا کریں اس کا نام اس نے ”جبل“ رکھا یہ سب سے مشہور بت تھا جو مکہ میں مشہور
 ہوا۔

(۲) ”وثن“: بت کے لئے استعمال ہونے والا یہ کلمہ بھی قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات میں آیا
 ہے:

﴿فَاسْتَحْيُوا الرَّحِمَىٰ مِنَ الْاَوْثَانِ﴾ ”پس تم لوگ بتوں کی پلیدی سے اجتناب کرو“
 (نح/۳۰) ﴿وَقَالَ إِنَّمَا اتَّخَذْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ اَوْثَانًا﴾ ”اور ابراہیم نے کہا تم صرف اس
 لیے اللہ کو چھوڑ کر بتوں کو لیے بیٹھے ہو“ (مکہ/۲۵) ﴿إِنَّمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ

اونٹاناکے ”تم تو اللہ کو چھوڑ کر بس بتوں کو پوجتے ہو“ (علکبوت/۱۷)

”وثن“ جسکی جمع اونٹان ہے۔ اس کے بارے میں قاموس قرآن میں ہے ”وثن“ ایک بت ہے۔ یہ چاہے پتھر سے بنا ہو یا لکڑی سے ہو لیکن اس میں شکل و صورت کا ہونا ضروری نہیں۔ وثن ان مجسموں کو کہا جاتا ہے جو پتھر سے بنائے گئے ہوں اور معبود ہونے کی نشانی ہوں انکے سامنے زمانہ جاہلیت میں لوگ اپنی نذر و نیاز اور قربانیاں پیش کرتے تھے۔

”صنم“ اسے کہا جاتا ہے کہ جسکی شکل و صورت ہو اور ”وثن“ اسے کہا جاتا ہے جسکی شکل و صورت نہ ہو بلکہ ایک ڈھانچہ ہو لیکن اسے مقدس گردانا جاتا ہو جیسے کعب کا پتھر۔ وثن کو وثن اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ ایک جگہ قائم رہتا ہے۔

”وثن“ جیسا کہ صاحب تحقیق کلمات قرآن نے اس کلمہ کے ذیل میں ”لسان العرب“ سے نقل کیا کہ ”وثن“ اور محکم المراقد اور اثابت الدائم کو کہتے ہیں۔ یعنی کوئی چیز کسی جگہ قائم و دائم ہو۔ ”وثن“ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جسکا ڈھانچہ پتھر لکڑی وغیرہ سے بنا ہو اور کسی جگہ نصب کر دیا جائے تاکہ اسکی پوجا کی جائے تحقیق یہ ہے کہ وثن کے اصل معنی ثابت و دائم کے ہیں۔

وثن ایک اصطلاح ہے جو ان مجسموں اور تصویروں کے لیے استعمال ہوتی ہے جسکی عرب دور جاہلیت میں پرستش کرتے تھے قدیم دور جاہلیت میں عرب اس کلمے کو ان چیزوں کے لیے استعمال کرتے تھے جنہیں وہ بت سمجھتے تھے کتاب مسند اور ابن کلبی میں صنم اور وثن دونوں میں فرق رکھا گیا ہے انسانی شکل کا پردہ مجسمہ جو سونے چاندی یا لکڑی سے بنایا گیا ہو اسے صنم کہتے ہیں لہذا وثن کی اصطلاح ہمیشہ پتھر سے بنائے گئے بتوں کے لیے استعمال ہوتی تھی اور عرب مشرکین انہیں کے سامنے اپنی نذورات پیش کرتے اور حیوانات ذبح کرتے تھے لیکن صاحب لسان العرب نے کہا ہے کہ وثن اور صنم میں فرق یہ ہے ہر وہ بت جو صورت نہ رکھتا ہے اسے وثن کہتے ہیں اور جس کی شکل و صورت ہو اسے صنم کہتے ہیں چنانچہ انسانی یا حیوانی شکل میں بنائے گئے بتوں کو صنم کہتے ہیں چاہے

وہ سونے چاندی اور حتمی جواہرات سے بنے ہوں یا پتھر سے اور وشن ان بتوں کو کہتے ہیں جنکے لئے شکل و صورت کا ہونا ضروری نہیں لیکن عرب بت پرست وشن کو مقدس گردانتے تھے یہی وجہ ہے کہ دور جاہلیت میں عرب کعبہ اور مکے کے پتھروں کو وشن کہتے تھے۔

وثن ایک اصطلاح ہے جو ان مجسموں اور تصویروں کے لیے استعمال ہوتی ہے جنکی عرب دور جاہلیت میں پرستش کرتے تھے قدیم دور جاہلیت میں عرب اس گلے کو ان چیزوں کے لیے استعمال کرتے تھے جنہیں وہ بت سمجھتے تھے کتاب مسند اور ابن کلبی میں صنم اور وثن دونوں میں فرق رکھا گیا ہے انسانی شکل کا مجسمہ جو سونے چاندی یا لکڑی سے بنایا گیا ہو اسے صنم کہتے ہیں لہذا وثن کی اصطلاح ہمیشہ پتھر سے بنائے گئے بتوں کے لیے استعمال ہوتی تھی عرب مشرکین انہیں کے سامنے اپنی نذرانے پیش کرتے تھے اور یہاں حیوانات ذبح کرتے تھے۔ لیکن صاحب لسان العرب نے کہا ہے کہ وثن اور صنم میں فرق یہ ہے کہ ہر وہ بت جو صورت نہ رکھتا ہے اسے وثن کہتے ہیں اور جس کی شکل و صورت ہو اسے صنم کہتے ہیں چنانچہ انسانی یا حیوانی شکل میں بنائے گئے بتوں کو صنم کہتے ہیں چاہے وہ سونے چاندی اور حتمی جواہرات سے بنے ہوں یا پتھر سے اور وثن ان بتوں کو کہتے ہیں جنکے لئے شکل و صورت کا ہونا ضروری نہیں لیکن عرب بت پرست وثن کو مقدس گردانتے تھے یہی وجہ ہے کہ دور جاہلیت میں عرب کعبہ اور مکے کے پتھروں کو وثن کہتے تھے۔

سب سے قدیم ترین بت:

(۱) ود (۲) سواع (۳) یغوث (۴) یعوق (۵) نسر

سب سے قدیم ترین بت جنکا ذکر سورہ نوح آیت ۲۳ میں آیا ہے:

﴿وَقَالُوا لَا تَدْرِيْنَ الْهٰنِكُمْ لَا تَدْرِيْنَ وَاُولٰٓئِكَ سِوَا عٰوَالٍ يٰغٰوْثُ وَيٰعٰوِقُ

وَنَسْرًا﴾ ”اور کہنے لگے: اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور ود، سواع، یغوث، یعوق

اور نسر کو نہ چھوڑنا“

یہ پانچ نام ان صالح و متعبدین افراد کے ہیں جو حضرت نوح سے پہلے حضرت ادریس کے دور میں تھے یہ لوگ محبوب خدا ہونے کے ساتھ لوگوں کے بھی محبوب و پسندیدہ تھے۔

(۱) ”وذ“:

عرب جاہلیت میں قوم بنی برہ نے بت کو عوف بن عذرا بن قاصد بن قدح کے حوالے کیا یہ لوگ دومتہ الجدل میں آباد تھے اس عوف نے اپنے بیٹے کا نام عبدود رکھا یعنی وذ کا بیٹا اسی طرح اپنے دوسرے بیٹے عامر کو اس بت کا خادم مقرر کیا۔

یہ بت ایک انسان کی شکل میں بنایا گیا جس کے اوپر ایک چادر پڑھائی گئی، ہاتھ میں تلوار بازو میں کند ایک ہاتھ میں پرچم اور ترکش دیا جس میں تیر تھے اس بت کو اسلام کے آنے کے بعد ختم کیا گیا۔

بعض کہتے ہیں کہ اس کی شکل یونان کے عروس کی شکل پر تھی لیکن اس کا کوئی نام نہیں رکھا ہوا تھا اسی طرح عجم البلدان میں ”وذ“ کو چاند کا نام دیا ہے۔

(۲) ”سواع“:

یہ بت مدینے کے اطراف میں بنیع کے مقام پر نصب تھا وہاں کے مقیم قبائل اس کی پرستش کرتے تھے اس کے خادم قبیلہ تہیان کے لوگ تھے۔

(۳) ”یعوث“:

اس بت کی پرستش قبیلہ مذحج اور اس کے حلیف کرتے تھے جسے عمرو ابن لُحی نے اپنے بیٹے انعام ابن عمرو مرادی کو دیا یہ لوگ یمن میں آباد تھے۔ انہوں نے اس بت کو وہاں سے نجران منتقل کیا یہ ایک شیر کی شکل پر بنا ہوا تھا۔

(۴) ”یعوق“:

اس بت کی شکل گھوڑے جیسی بنائی گئی یہ بت عمرو ابن لُحی نے قبیلہ ہمدان سے تعلق رکھنے والے

شخص مالک بن مرصد بن شثم بن خبران کے حوالے کیا یمن کے لوگ اس کی پرستش کرتے تھے۔
(۵) ”نسر“:

عمر و ابن لُحی کی بت پرستی کی مہم میں نسر بھی شامل ہے اس نے اس بت کو قبیلہ حمیر کے حوالے کیا جو ارض سہا میں رہتے تھے۔

اسی طرح جو عرب بت نہیں بنا سکتے تھے ان کے ہاں پتھر بہت محترم تھے جن کی وہ پوجا کرتے چنانچہ حرم کے باہر یا دوسری جگہوں پر ایک پتھر نصب کرتے اور اس کے گرد طواف کرتے تھے وہاں پر لوگ قربانی کرتے جسے ذبح عشاء کہا جاتا تھا چنانچہ مشرکین کے اس عمل قبیح کیخلاف قرآن کریم کی سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۳ اور ۹۰ میں آیا ہے:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ الْمَيْتَةُ وَالْدَّمُ وَلَحْمُ الْخَنَازِيرِ وَمَا هَلَكَ لَغَيْرِ اللَّهِ﴾ ”تم پر حرام کیا گیا

مردار، خون، سور کا گوشت، وہ جانور جو خدا کے سوا کسی اور نام پر ذبح کیا گیا ہو“

زمانہ بعثت سے پہلے عربوں میں بت پرستی اس حد تک پھیلی کہ ہر قبیلے نے اپنے لئے ایک بت بنانا رکھا تھا۔

اولاد ابراہیم بن اسماعیل کے دور میں سب سے پہلے جس قبیلے نے بت بنایا اس کا نام ہذیل بن مدرکہ بن الیاس بن مضر ہے انہوں نے سوا کا بت بنایا اور انہوں نے دین ابراہیم کو چھوڑ کر دین بت پرستی کو اپنایا۔

کیونکہ ان کا ارتباط مدینے کی شیخ سے تھا اس لئے کلب بن وبرة جو خاندان قضاعہ سے تعلق رکھنے والے نے وہ کو اپنا بت بنایا۔

عرب میں بتوں کی تعداد:

کیا یہ ممکن ہے عرب میں موجود بتوں کے اعداد و شمار کا پتہ لگایا جاسکے آیا وہ صنم و ثن اور نصب ہی

کو خدا مانتے تھے یا انھیں خدائے واحد کی طرف علامت دے کر ان کی پرستش کرتے تھے یا ہر بت ایک جداگانہ خدا کی حیثیت رکھتا تھا عرب میں اہم بت اصنام اوٹان اور انصاب تھے لیکن ان کی تعداد کو محصور کرنا ممکن نہیں بعض اصنام، اوٹان اور انصاب کی تعداد حد سے زیادہ ہے اس سلسلے میں محمد جاوری کہتے ہیں ہر قبیلے میں ایک سے زائد بت ہوا کرتا تھا اور ہر قبیلے کی طرف سے ایک بت کعبہ میں رکھا جاتا تھا۔

جن افراد نے بتوں کی تعداد کو شمار میں لانے کی کوشش کی ہے یہ کوئی ایسی تحقیق نہیں جس پر اعتماد کیا جائے کہ ہر ایک عرب کے پاس ایک بت وثن یا نصب ہوتا تھا جو اس کا ذاتی خدا سمجھا جاتا تھا بعض نے کھجور کو بت بنایا ہوا تھا جب بھوک لگتی تو اس کا پھل کھاتے اوٹان اصنام اور انصاب کی تعداد حد سے زیادہ تھی۔

بعض کتب سیر و تواریخ ابن اسحاق اور ابن ہشام وغیرہ نے ذکر کیا ہے کعبے میں ہر دن کے حوالے سے ایک بت تھا جنگی تعداد ۳۶ تھی۔ ابن کلبی نے کہا اگر کوئی انسان اس وقت کسی جگہ کیلئے سفر کرتا تو چار پتھر وہاں سے اٹھاتا اور ان میں سے خوبصورت پتھر کو اپنا رب قرار دیتا باقی تین کو چولہے کے طور پر استعمال کرتا اور پھر وہاں چھوڑ کر چلا جاتا۔

بعض نے کہا ہے ہم جاہلیت میں پتھر کی پوجا کرتے تھے یہاں تک کہ کسی منادی نے ندا دی اے جانے والے تمہارا رب نابود و ختم ہو گیا ہے تم اپنے لئے ایک اور رب تلاش کرو تو سب پہاڑوں میں گھس کر اپنے لئے رب تلاش کرتے جب کوئی پتھر مل جاتا تو اس وقت آواز دیتے ہم نے اپنا رب پالیا ہے پھر اس کی پوجا کرتے اور اس کے سامنے حیوانات ذبح کرتے اتاریدی یا عطاریدی کہتا ہے اگر ہمیں پتھر نہ ملتا تو ہم مٹی جمع کرتے اس پر بکری یا گوسفند کو پیشاب کراتے اور اس کیچڑ سے بت بناتے اور پھر اس کا طواف کرتے اہل مکہ کے ہر گھر میں ایک بت ہوتا تھا جب سفر کے لئے گھر سے نکلنے لگتے تو اس وقت بت کو مس کرتے اور سفر سے واپسی پر پھر اسے مس کرتے قریش میں

کوئی ایسا نہیں تھا جس کے گھربت نہ ہوتا بڑے لوگوں کے گھر بڑے بت ہوتے، یہاں تک کہ قبائل کے نام بھی بتوں کے نام پر تھے۔

عرب میں مشہور بتوں کے نام منات عزنی، لات اور اہل تھے یہ بتوں کی مثال نہیں تھے یا خدا کی پہچان نہیں تھے بلکہ یہ بذات خود انھیں خدا تصور کرتے تھے لہذا وہ لوگ ان کی تعظیم کرتے اور ان کے لئے خاص مراسم ادا کرتے یہ چاروں بہت مشہور تھے ان میں سے بعض طبیعت سے منسوب تھے بعض حیوانات اور بعض کسی اور چیز سے، منات صنم اور لات سب سے قدیم ترین بت تھے۔

ان بتوں کو مکہ و مدینہ کے درمیان دریا کے کنارے رکھا جاتا تمام عرب ان کی تعظیم کرتے اور یہاں آکر قربانی کرتے تھے۔ اوس و خروج مکہ و مدینہ سے آتے جاتے وقت اسکے گرد گھومتے اور ان کی طرف نسبت دے کر بندوں کے نام رکھتے مثلاً زید منات، عبد منات اور اوس منات کہتے تھے۔

بتوں سے راز و نیاز

تاریخ بت پرستی میں بت پرستی کے مختلف اشکال و انواع دیکھنے میں آتے ہیں ان میں سے ایک بتوں کے سامنے تحفہ و تحائف ذبح حیوانات انسانوں حیوانوں اور املاک کو ان کے لئے وقف کرنا ہے۔

۱۔ اپنی اولادوں کی بتوں کے بندے کے عنوان پر نام گزاری کرنا۔

۲۔ وہ حیوانات جو خدا نے انسانوں کیلئے بطور نعمت بہہ کیے ہیں انھیں بتوں کے نام وقف کر کے اپنے اوپر حرام قرار دینا، چنانچہ جن حیوانات کو مشرکین بتوں کے نام وقف کر کے اپنے اوپر حرام قرار دیتے تھے خدا نے ان کی مذمت میں آیت نازل کی ملاحظہ کریں:

﴿مَا جَعَلَ اللَّهُ مِنْ بَحِيرَةٍ وَلَا سَائِبَةٍ وَلَا وَصِيلَةٍ وَلَا حَامٍ وَلَكِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يَفْقَرُونَ

عَلَىٰ اللَّهِ الْكَذِبُ﴾ ”اللہ نے نہ کوئی بحیرہ مقرر کیا ہے نہ سائبہ نہ وصیلہ اور نہ حام

مگر یہ کافر اللہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں“ (نملہ/۱۰۳)

۱۔ بحیرہ: اگر کوئی اونٹنی چار بار لگا تار مادہ بچے پیدا کرتی اور چوتھی بار نہ پیدا کرتی تو اسکا مالک اسکا کان چیر دیتا اور اسے آزاد کر دیتا۔ اب وہ جہاں چاہے گھومے اسے کوئی نہیں روک سکتا اور نہ ہی کوئی اس پر سوار ہو سکتا ہے چاہے کوئی کتنا ہی مجبور کیوں نہ ہو۔ اسکے علاوہ اسے ذبح کرنے کا حق بھی کسی کو حاصل نہیں تھا۔

۲۔ وصیلہ: اگر کوئی گوسفند مادہ بچہ دیتا تو اسے یہ اپنے لئے مخصوص کرتے اور اگر نہ ہوتا تو اسے بتوں کیلئے ذبح کرتے، اگر اسکے بعد پھر اس نے نر اور مادہ بچہ دیا تو نر کو ذبح نہیں کرتے بلکہ اسے آزاد چھوڑ دیتے تھے۔

۳۔ حام: وہ نر اونٹ ہے جس سے دس بچے پیدا ہوتے یہ اسکی پشت پر زخم لگاتے اور اس پر کوئی سوار نہیں ہوتا تھا۔

۴۔ بتوں کے نام سے نیاز کردہ حیوانات کو ان کے سامنے ذبح کرنا جسے ذبح علی الانصاب کہا ہے۔ اسے خدا نے حرام قرار دیا ہے:

﴿وَمَا ذَبَحْ عَلَى النَّصَبِ﴾ ”اور جو انصاب پر ذبح کیا جائے“ (مائدہ/۳)

”انصاب“: انصاب جمع نصب مادہ نصب سے ہے یہ کسی کو پریشان کرنے، پریشان دیکھنے یا کھڑا کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

نصب کے معنی رنج و تعب کے ہیں:

﴿اتساع داءنا لقد لقينا من سفرنا هذا نصبا﴾ ”اب ہمارا کھانا لاؤ ہم نے اس سفر

میں بہت تھکان برداشت کی ہے“ (کہف/۶۲)

یعنی اس سفر سے ہمیں پریشانی اور تھکاوٹ ہوئی:

﴿انی مسمی الشیطن بنصب و عذاب﴾ ”شیطان نے مجھے بڑی تکلیف۔ رافیت

پہنچائی ہے“ (ص/۴۱)

نصب کے معنی کسی کو پریشان کرنا یا زحمت دینا ہے:

﴿وَجَوْهٌ مِّنْهُ عَاشِعَةٌ ط۔ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ﴾ ”اُس دن بہت سے چہرے ذلیل اور رسوا

ہوں گے۔ محنت کرنے والے تھکے ہوئے“ (عاشیہ ۲۰۳)

ناجاہز عمل، بجالانا آخرت کے رنج و غم کا موجب بنتا ہے:

یعنی وہ بت جنہیں کسی جگہ نصب کیا ہو۔ یا جو عبادت کے لئے کسی جگہ گاڑ دیئے ہوں اور لوگ ان کے سامنے قربانی دیں۔

نصب شئی سے مراد کسی چیز کو کسی جگہ قائم کرنا ہے جیسا بیان ہوا انصاب نصب سے ہے جس کے معنی کسی چیز کو کسی جگہ پر گاڑنا ہے تاکہ یہ علامت اور حد بندی سمجھا جائے جیسے سرزمین پاک مکہ مکرمہ کے چاروں طرف پتھر یا تختیاں نصب ہیں جنہیں حدود و حرم کی ابتداء و انتہا کا خط سمجھا جاتا ہے سورہ عاشیہ آیت ۱۹ میں آیا ہے:

﴿وَاللَّيْلِ الْجَبَالُ كَيْفَ نَصَبْتَ﴾ ”اور پہاڑ کو کس طرح نصب کیا گیا ہے“

اسی سے لفظ نصیب بنا ہے نصیب حصہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح زمان جاہلیت میں کعبہ کے نزدیک ایک پتھر نصب تھا جس کے پاس کعبہ کیلئے نذر کیے جانے والے جانوروں کو ذبح کیا جاتا تھا۔

ایک پتھر یا بت ہے جسکی جمع انصاب ہے۔ دور جاہلیت میں عرب اس کے سامنے حیوانات ذبح کرتے تھے۔ صاحب لسان العرب نے لکھا ہے نصب وہ پتھر تھا جسکی عرب پوجا کرتے تھے اور اپنے ذبیحوں کا خون اس کے پاس گراتے۔

مجاہد نے لکھا ہے، نصب ایک پتھر ہے جو کعبہ کے گرد نصب تھا دور جاہلیت میں عرب وہاں حیوانات ذبح کرتے اور انکے گوشت و خون کو کعبہ کی دیواروں پر مارتے۔ سورہ حج ۳۷ میں خداوند تعالیٰ نے فرمایا جو حیوان کو تم ان کے پاس ذبح کرتے ہو، ان کا گوشت اور خون ان تک نہیں پہنچتا۔

نصب ان پتھروں کا نام ہے جن کی پرستش کی جاتی تھی ابن کلبی نے انصاب کے بارے میں لکھا ہے جاہلیت میں جو شخص اپنے گھر میں بت نہیں بنا سکتا تھا وہ ایک پتھر حرم کے سامنے یا اپنے پاس رکھتا اور پھر اس کے گرد طواف کرتا ایسے پتھروں کو انصاب کہتے تھے انصاب وہ پتھر تھے جو کعبے کے گرد تھے ان پتھروں پر وہ تسبیح و تحلیل کرتے تھے اور یہاں پر گوسفند ذبح کرتے تھے۔
انصاب کا ذکر قرآن کریم میں تین جگہوں پر آیا ہے:

﴿وَمَا ذَبَحْ عَلَى النَّصَبِ﴾ ”اور جسے تھان پر ذبح کیا گیا ہو“ (مائدہ/۳) ﴿انْعَمِ الْحَمْرُ الْعَمِيسِرُ وَالْانْصَابُ وَالْاِزْلَامُ رَحْسٍ﴾ ”شراب اور جوار اور مقدس تھان اور پائے سب ناپاک شیطانی عمل ہیں“ (مائدہ/۹۰) ﴿كَانَهُمُ الْيَ نَصَبِ يَوْ فُضْنُونَ﴾ ”گو یاد وہ کسی نشانی کی طرف بھاگ رہے ہیں“ (معارف/۴۳)
جن بتوں کا ذکر قرآن میں آیا ہے ان میں منات بھی ہے:

منات:

منات کا شتیق منا اور منیہ سے ہے اس کے معنی موت و تقدیر کیے جاتے ہیں یہ بت مکہ کی ایک ایسی جگہ پر تھا جہاں بت پرست گوسفند کا خون بہاتے تھے۔ زمانہ باطلین میں منات کو منا تو کہتے تھے منات قبائل عرب میں زیادہ منتشر تھے ”عبد منات“ اس سے منسوب ہے سورہ نجم آیت ۲۰ میں لات کے بعد منات کا ذکر آیا ہے:

﴿وَمَنْشُوءَ السَّالِثَةِ الْاِخْرٰی﴾ ”اور تیسری ایک دیوی منات کی حقیقت پر کچھ غور بھی کیا ہے؟“

یہ بت قبیلہ ہرملو غزہ سے مخصوص تھا مکہ اور مدینہ کے درمیان دریا کے کنارے پر نصب تھا اسے کالے پتھر سے بنایا گیا تھا اوس و خزرج اس کی پوجا کرتے تھے۔ ارباب لغت نے منات کو مادہ منا سے لیا ہے منات وہ بت ہے جسے عمر بن لُحی شام سے حجاز لایا، اہل بابل اسے موت کا خدا سمجھتے تھے

اہل عرب اسکی طرف زیادہ متوجہ تھے اس لئے یہ اپنے بچوں کے نام بھی اس سے منسوب کرتے تھے جیسے زائد منات، عبدالمنات وغیرہ۔ فتح مکہ پر حضرت محمدؐ نے حضرت علیؑ کو بھیجنا کہ منات کو گرا دیں۔ بت پرستی و دشمن پرستی عرب میں اس حد تک سرایت کر گئی تھی کہ ہر قبیلے کے لئے ایک بت تھا کہا جاتا ہے سب سے پہلے عرب میں بت پرستی حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے شروع ہوئی جہاں انھوں نے اپنے اولادوں کے نام بتوں سے منسوب کیے جس نے بت پرستی کا آغاز کیا اس کا نام حذیل بن مدرکہ بن الیاس بن مضر تھا اس کا ذکر قرآن کریم کی سورہ نجم کی آیت ۲۰ میں آیا ہے:

﴿مَنْشُورَ الثَّالِثَةِ الْاٰخِرٰی﴾ ”اور تیسری ایک دیوی منات کی حقیقت پر کچھ غور بھی کیا

ہے؟“

لات:

لات قدیم زمانہ کی عربی ہے لات کے معنی مؤنث خدا کے کیے جاتے تھے لات ایک ایسا پتھر

ہے جو عورت کی شکل میں تھا قرآن کریم میں لات کا ذکر سورہ نجم کی آیت ۱۹ آیا ہے:

﴿اَلَمْ يَلْمِزْ يَلَّتْ وَالْعِزٰی﴾ ”بھلا تم لوگوں نے لات اور عزیٰ کو دیکھا ہے؟“

شہر طائف میں قریش اور دیگر قبائل عرب اس کی پوجا کرتے تھے اس بت کو لات کہنے کی توجیہ میں لکھتے ہیں پرانے زمانے میں ایک مرد اس پتھر پر بیٹھ کر حج و زیارات پر آنے والوں کیلئے روغن بچتا تھا۔ جب اس شخص کا انتقال ہوا تو عمرو بن لُحی نے کہا وہ مرا نہیں ہے بلکہ اسی پتھر کے اندر چلا گیا ہے۔ اس وقت سے لوگوں نے اس کی پوجا کرنا شروع کی اور اس وقت اس کا نام لات رکھا زمانہ گزرنے کے ساتھ ت گر گئی صرف لارہ گیا۔ یہ افسانہ درحقیقت اہل بابل کے مؤنث بتوں کا نام ہیں لات بعل کی بیٹی اور منات کی بہن ہے اب وہ بت کو رب النوع اور مظہر خورشید سمجھتے ہیں۔ عرب جاہلیت کے پاس اجنبی جیسی ہے۔

جنگ احد میں ابوسفیان اسے اپنے ساتھ لایا فتح مکہ کے موقع پر پیغمبر اکرمؐ نے مغیرہ ابن شعبہ اور
 رعباق بن مالک کو بھیجا تاکہ وہ لات کو گرا دیں۔

عزئی:

ان بتوں میں سے ایک بت عزئی ہے یہ اسم مونث تعزیر ہے مصدر عزت سے لیا ہے یہ بھی عورت
 کی شکل میں تھا سورہ نجم آیت نمبر ۱۹ میں اس کا ذکر آیا ہے:

عرب قریش اس کا بہت احترام کرتے چنانچہ بہت سے قریشوں کو اسی بت سے منسوب کیا ہے
 اہل لہب کو عبد العزئی کہتے قائم تھا۔ اس بت کا بت خانہ ذات ارد میں تھے جو شہر عراق سے مکہ آتے
 وقت راستے میں تھا۔ یہ بت لکڑی کا بنا اس کے تینوں اطراف پتھر کے بت رکھے ہوئے تھے بت
 پرست اسکے پاس جانور ذبح کرتے اپنی بیماریوں میں اس سے توسل کرتے۔ ابوسفیان جب جنگ
 کیلئے آیا تو اس کے جھنڈا پر عزئی کا نقشہ تھا اور اس کا نعرہ تھا عزئی تو ہمیں فتح دے۔

بت کے مصداق: قرآن میں مندرجہ ذیل بتوں کے نام آئے ہیں:

شعری: ماہرین علم نجوم کہتے ہیں دو ستارے شعری کے نام سے معروف تھے ایک دب اکبر
 اور دوسرا دب اصغر۔ پہلے کا نام شعر عبور یا اور دوسرے کو شعری شامی کہتے تھے قرآن میں شعری شامی
 کا ذکر آیا ہے قبیلہ حمیر اور حزامانہ جاہلیت میں اس ستارے کی پرستش کرتے تھے سب سے پہلے
 پرستش کرنے والے عربوں میں ابو قلشیہ تھا اس نے بت پرستی میں تبدیلی کی اس وجہ سے عرب اسکے
 مخالف تھے بعض عرب جاہلیت دین اسلام کو اپنی تقلید رسومات کے خلاف سمجھتے تھے وہ لوگ پیغمبر
 اکرمؐ کو ابو قلشیہ کی طرف نسبت دیتے تھے اس ستارے میں نورانیت تھی اس وجہ سے لوگوں نے اس
 کی پرستش شروع کی خصوصاً گرمیوں میں مصری ستارہ شعری کو برکت اور فروانی نعمت کی علامت سمجھتے
 تھے مصری ستارہ شعری سے روشن گونیاں کرتے، اہل بابل کے پاس شعر اشک سالی کی نشانی

تھالیہ ذرا عرب کی تقلید کرتے ہوئے اسکی مخالفت کرتے تھے۔ شعراء زمین کے نزدیک ترین ستاروں میں سے ہے بعض کے مطابق ۸۰۸ سال نوری زمین سے فاصلہ رکھتا ہے اس کا نور زمین پر یہ سورج سے ۵۰ برابر زیادہ ہے اور ۲۸ برابر نور دیتا ہے خورشید کے مقابلے میں۔ قرآن کریم سورہ نجم آیت ۳۹ میں آیا ہے شعری ایک ستارہ ہے:

﴿وانه هورب الشعری﴾ ”اور یہ کہ وہی (ستارہ) شعری کا مالک ہے“

بعل:

یہ کلمہ قرآن کریم میں ایک دفعہ سورہ ہود آیت نمبر ۷۲ میں حضرت سارہ کی زبان سے نکلا ہے ﴿هَذَا بعلی شیخا﴾ ”اور میرے میاں بھی بوڑھے ہیں“ جب ملائکہ نے انہیں حضرت اسحاق کی ولادت کی خبر سنائی یہاں بعل شوہر کے معانی میں آیا ہے اسی طرح سورہ بقرہ آیت ۲۲۸، سورہ نور آیت ۳۱ میں شوہر کے معانی میں آیا ہے:

﴿وبعولنھن احق بردهن فی ذلک ان ارادوا اصلاحا﴾ ”ان کے شوہر تعلقات

درست کر لینے پر آمادہ ہوں“ ﴿الابعولنھن﴾ ”اپنے شوہروں“

سورہ صافات آیت ۱۲۵ میں بعل کا جو کلمہ آیا ہے وہ بت کے معنوں میں آیا ہے:

﴿انصدعون بعلا﴾ ”کیا تم بعل کو پکارتے ہو“ جس کے بارے میں صاحب تفسیر طبری نے تین

توجیہ بیان کی ہیں:

۱۔ اس بت کا نام ہے جسکی قوم الیاس پرستش کرتی تھی۔

۲۔ بعل ایک عورت کا نام ہے جس کی قوم الیاس پوجا کرتی تھی۔

۳۔ بعل یعنی صاحب و مالک کے معانی میں آیا ہے۔ بعال کے بارے میں لکھتے ہیں یہ زبان

سریانی ہے یہ بابل میں کعبان کا بت تھا جسکی حضرت الیاس کے زمانے میں بنی اسرائیل پرستش

کرتے تھے لیکن صاحب کتاب راغب اصفہانی نے تمام معنی کی برگشت ایک معنی کی طرف دی ہے جس کا معنی بلندی پسند اور تسلط کے ہیں۔ پہلے زمانے میں بعل صرف خورشید کو کہتے تھے گزشتہ اختلاف زمان اور مکان کے لحاظ سے اس میں تبدیلی آئی ہے۔ پہلے زمانے میں یہ فی فیکو کے پاس تھا۔ جبکہ بعد میں انکے آباد کردہ شہروں بھی لے جایا گیا۔ شہر کلید کے رہنے والے ہر ستارے کے لیے ایک بت بناتے تھے، ہفتہ میں ایک دن اس کی پرستش کرتے تھے ستارہ زہرہ ان کے پاس عشق کا مظہر تھا مریخ خدا جنگ اور بہت اہمیت کا حامل تھا اہل بابل ستارہ شناسی کی غرض سے ایک ستارے سے دوسرے ستارے کے درمیان فاصلہ معلوم کرتے، انکا نظریہ تھا چاند عطار دُزہرہ خورشید مریخ، مشتری زہل یہ سات ستارے پوری کائنات کی تعبیر کرتے ہیں یہ انہی کے ذریعے حوادث زمانہ کو درک کرنے کا دعویٰ بھی کرتے تھے۔

(۱) ”نسر“: زمان حضرت نوحؑ میں بت پرست پانچ بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ ان کے نام سورہ نوح آیت نمبر ۲۳ میں آئے ہیں:

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَنُ وَلَدًا لَوْلَا اسْرَاعُ الْيُسُوفِ يُعْجَبُونَ

وَنَسْرًا﴾ ”اور کہنے لگے: اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور دُسمواس ”یعنوث“ یعنوث

اور نسر کو نہ چھوڑنا“

بت نسر پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں بھی تھا عرب میں قوم حمیر اور مملکت سبأ والے اس کی پرستش کرتے تھے۔ یہ بت پیغمبر اکرمؐ کے ہاتھوں منہدم اور نیست و نابود ہوا۔

(۲) بت بنام ”دو“: اس کی پرستش کرنے والوں کا خیال تھا کہ یہ بت انکے اور خدا کے درمیان دوستی اور رابطہ کا وسیلہ ہے۔ یہ بت دور جاہلیت میں دو متہ الجندل میں تھا۔ یہ وہی علاقہ ہے جہاں عمرو عاص اور ابو موسیٰ اشعری دونوں نے مسئلہ خلافت پر بحث و گفتگو کی۔ عمرو عاص نے علیؑ کو خلافت سے معذول کیا ان دونوں کی گفتگو حکمین کے فیصلے کے نام سے معروف و مشہور ہے اس زمانے میں

عرب اپنے بیٹوں کے نام اس بت کے نام سے منسوب کر کے رکھتے تھے جیسا کہ جنگ خندق میں امیر المومنین علیؑ کے مقابلے میں آنے والے پہلو ان کا نام عمرو بن عبدود تھا

(۳) تیسرا بت ”یعوق“: یہ بت یمن میں تھا اور قبیلہ ہمدان کے لوگ اس بت کی پرستش کرتے تھے (۴) یغوث: اس بت کی پرستش قبیلہ مذحج اور اس کے حلیف کرتے تھے۔

(۵) سواع: کتاب قاموس قرآن میں مادہ سواع میں علامہ قرشی لکھتے ہیں یہ پانچ بت آدم و نوح کے زمانے میں موجود نیک مردوں کے نام تھے گزشتہ زمان کے ساتھ لوگوں نے ان کے مجسمے بنا لئے اور ان کی پرستش شروع کر دی۔ قبیلہ عزیر بن مدر اور قبیلہ لبیان کے لوگ بت سواع کی پوجا کرتے تھے۔ غلبہ اسلام کے بعد پیغمبر اکرمؐ نے عمرو بن عاص کو اسے توڑنے کے لئے بھیجا یہ بت عورت کی شکل و صورت میں بنا تھا چنانچہ فرہنگ قصص قرآنی میں العصام کی جگہ پر اس کا ذکر ہے۔

بتوں کی شکل و صورت

بتوں کو کسی اعداد و شمار میں لانا ایک مشکل عمل ہے۔ قرآن کریم جو ہر قسم کی تحریف اور غلط بیانی سے پاک و منزہ کتاب ہے اور اقوام و ملل کے دیرینہ حقائق و مناظر کیلئے واحد مصدر ہے۔ اس میں اس حوالے سے ہمیں جو آیات ملتی ہیں ان میں ذکر ہے ہر دور کے نبی کو بت پرستوں کا سامنا و مقابلہ کرنا پڑا ہے۔

ان تمام اقسام و انواع معبودات باطل جنہیں ہم بت کہتے ہیں ہر ایک کے امتیازات اور خصوصیات ایک دوسرے سے ممتاز ہیں انہیں قرآن کریم نے دو الفاظ میں محصور کیا ہے۔

تاریخ بت پرستی میں جہاں بت پرستوں نے سونے چاندی پتھر لوہے اور لکڑی کے بت بنائے ہیں وہاں ہی بتوں کی شکل و صورت کا انتخاب بھی بت پرستوں کی سابق معتقدات اور تقدیس کی بنیاد پر کیا گیا تھا وہ اشکال مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ بُتِ انسان:

عرب بت پرستوں نے مختلف شکلوں میں بت بن رکھے تھے ان میں سے ایک شکل جس کی پوجا کی جاتی وہ عام ابن طفیل کا بت تھا جو اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر کے ارد گرد نصب کیا گیا اس کی لمبائی ایک میٹر تھی کوئی حیوان، کوئی سواری اور نہ ہی کوئی پیدل اسکی حدود سے گزر سکتا تھا اس لیے کہ یہ بت عام ابن طفیل کے احترام میں بنایا تھا اس طرح انھوں نے اپنی اشراف بزرگوں اور رؤسا کو بھی بتوں کا مقام دے رکھا تھا انکے سامنے خاضع و خاشع ہوتے، عمر ابن لُحیہ حج کے موقع پر حیوانات ذبح کر کے لوگوں کو کھلاتا اور ناداروں میں کپڑے تقسیم کرتا۔ اس کی یہ سیرت اسکی مقبولیت کی وجہ بنی، آخر میں لوگوں نے اسے ربوبیت کے مقام تک پہنچایا اور اسکی پوجا شروع کی۔

۲۔ حیوان کی شکل:

”بت وڈ“ شیر کی شکل میں، ”بت یعوق“ گھوڑے کی شکل میں ”بت نسر“ باز کی شکل میں اور ایک بت ”بت غزالہ“ ہرن کی شکل میں تھا۔ بعض بت کبوتر کی شکل میں ہوتے، ان بتوں کے سامنے دانے بھی رکھے جاتے تھے۔ اگر کوئی حیوان فرار کر کے ان بتوں کے پاس آ جاتا تو مالک اسے واپس نہیں لے جاسکتا تھا۔ جن حیوانات کو مشرکین نے تقدس و احترام دیا ہے ان کا ذکر سورہ انعام ۱۳۵ تا ۱۳۸، مائدہ ۱۰۳ میں آیا ہے:

﴿وَجَعَلُوا لِلَّهِ مَعَادِرَ مِنَ الْحَرِّثِ وَالْإِنْعَامِ نَصِيبًا فَقَالُوا هَذَا لِلَّهِ بِزَعْمِهِمْ
وَهَذَا لِلشُّرَكَائِ أَنْفَاعًا كَانَ لَشُرْكَائِهِمْ فَلَا يُصِلُ إِلَهُهُ وَمَا كَانَ لِلَّهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلَهُهُ
شُرْكَائِهِمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ۔ وَكَذَلِكَ زَيْنَ لَكُنْ مِنْ الْمُشْرِكِينَ قَتَلَ أَوْلَادَهُمْ
لِيَرُدَّوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ۔
وَقَالُوا هَذِهِ أَنْعَامٌ وَحَرِّثٌ حَجَرٌ لَا يَطْعَمُهَا إِلَّا مَنْ نَشَأَ بِزَعْمِهِمْ وَأَنْعَامٌ حُرِّمَتْ
ظُهُورُهَا وَأَنْعَامٌ لَا يَذْكُرُونَ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا افْتِرَاءٌ عَلَيْهِمْ سُبْحَنَهُمْ

بما كانوا يفترون ﴿﴾

”ان لوگوں نے اللہ کیلئے خود اُسی کی پیدا کی ہوئی کھیتوں اور موبیشیوں میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں یہ اللہ کیلئے ہے بزعم خود اور یہ ہمارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کے لیے۔ پھر جو حصہ ان کے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کیلئے ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا مگر جو اللہ کیلئے ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے کیسے بُرے فیصلے کرتے ہیں یہ لوگ! اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کیلئے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنا دیا ہے تاکہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کریں اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں اگر اللہ چاہتا تو یہ ایسا نہ کرتے لہذا انھیں چھوڑ دو کہ اپنی افترا پرداز یوں میں لگے رہیں۔ کہتے ہیں یہ جانور اور یہ کھیت محفوظ ہیں انھیں صرف وہی کھا سکتے ہیں جنھیں ہم کھلانا چاہتے ہیں حالانکہ یہ پابندی ان کی خود ساختہ ہے پھر کچھ جانور ہیں جن پر سواری اور بار برداری حرام کر دی گئی ہے اور کچھ جانور ہیں جن پر یہ اللہ کا نام نہیں لیتے اور یہ سب کچھ انھوں نے اللہ پر افترا کیا ہے عنقریب اللہ انھیں ان افترا پرداز یوں کا بدلہ دے گا“ (انعام/ ۱۳۵ تا ۱۳۸)

۳۔ نباتات:

جزیرۃ العرب میں پانی کی قلت تھی لہذا جو درخت یا پودے وہاں اُگتے یہ ایک خاص اہمیت کے حامل ہوتے تھے اور انکے نزدیک محترم شمار ہوتے، یہاں تک ان کے کاٹنے پر بھی پابندی ہوتی تھی۔ یہاں سے ہی انھوں نے ان درختوں کو مزارات قرار دیا اور اپنے بتوں کو انکی شکل میں نصب کیا۔ ان مقدس درختوں میں سے ایک کجور کا درخت ہے جو انسانی جسم کے لئے مقویم کی حیثیت رکھتا ہے عربوں نے اسے پہلے دن سے ہی اپنے سامنے پایا۔ اس سے انکی ضرورت پوری ہوتی تھی یعنی اس نے انکی بھوک کو دور کیا لہذا اسے محترم شمار کرنے لگے چنانچہ نصاریٰ نجران دین نصاریٰ قبول

کرنے سے پہلے اپنے علاقے میں ایک کھجور کے درخت کی پرستش کرتے تھے وہ عید کے موقع پر اسکے گرد جمع ہوتے اور اسے اچھا لباس پہناتے تھے۔ جنوب عرب میں درختوں کی پرستش کا بہت رواج تھا۔ وہ سرسبز درخت کے پاس آتے اور اپنا اسلحہ اس کے اوپر چھوڑتے، اسکے سامنے قربانی کرتے اور ایک دن اسکے پاس گزارتے تھے۔

جگ حدیبہ کے موقع پر پیغمبرؐ نے جس درخت کے نیچے اپنے اصحاب سے بیعت لی جس کا ذکر سورہ فتح آیت نمبر ۱۸ میں آتا ہے:

﴿اذيابعونك تحت شجرة﴾ ”جو درخت کے نیچے آپ کی بیعت کر رہے تھے“

بعد میں بعض لوگوں نے اس کی پوجا کرنی شروع کی اور اس کو لات و مالات کے برابر اٹھایا۔ لہذا حضرت عمرؓ نے اسکو کٹوا دیا۔ اسی طرح ابنِ نجران کے ہاں ایک کھجور کا بڑا درخت تھا وہ ہر سال یہاں پر عید مناتے اسے اچھے لباس پہناتے اور اس کے گرد طواف کرتے تھے۔

اسی طرح ستاروں کی پرستش کرتے کہ وہ ان کی زندگی کے نفع و نقصان میں کردار رکھتے ہیں یہی سے لوگوں نے اس دروازے سے دنیا بنانے کے لیے علم نجوم سیکھنا شروع کیا لہذا شریعت نے اس حوالے سے علم نجوم سیکھنے سے منع کیا ہے:

[ایہا الناس! یا کم وتعلم النجوم الامایہندی بہ فی برؤو بحر؁ فانہاتدعو الی الکہانۃ والمنحکم کالکاهن؁ یو الکاهن کالساحر؁ و الساحر کالکافر؁ و الکافر فی النار اسیر و اعلیٰ اسم اللہ] ”ایہا الناس! خبر وار علم نجوم مت حاصل کرو مگر اتنا ہی جس سے بر و بحر میں راستے دریافت کئے جا سکیں کہ یہ علم کہانت کی طرف لیجاتا ہے اور منجم بھی ایک طرح کا کاہن (علم غیب کی خبر دینے والا) ہو جاتا ہے جبکہ کاہن جادو گر جیسا ہے اور جادو گر کا فر جیسا ہوتا ہے اور کا فر کا انجام جہنم ہے۔ چلو نام خدا لے کر نکل پڑو“ (خطبہ ۹؁ ترجمہ؁ جوادوی؁ ص ۱۳۹)

ایک صاحب شعور کے تعجب میں اس وقت اضافہ ہوتا ہے کہ قرآن و روایات اور علماء کی طرف سے نجوم کا انسانی زندگی میں کردار کا عقیدہ باطل ہونے کے باوجود خدا پرستوں کی زندگی میں ستارہ پرستی کے آثار نظر آتے ہیں ہماری اپنی درس گاہوں میں اس نظریہ کی تائید میں جنتریوں کا نشر ہونا ایک بڑا ظلم ہے۔

۴۔ جن:

عرب بدو انسانی زندگی میں جنوں کے تصرف کے قائل تھے لہذا جو چیز انسان کیلئے محال نظر آتی اسے جن کی طرف نسبت دیتے تھے چنانچہ سورہ انعام آیت ۱۲۸، جن آیت ۶ میں اسکا ذکر آیا ہے:

﴿وَيَوْمَ يُحْشَرُهُمْ جَمِيعًا لِّمَعْشَرِ الْحَنِّ قَدْ اسْتَكْثَرْتُمْ مِنَ الْإِنْسِ وَقَالَ أُولِيؤْهُم مِنَ الْإِنْسِ رَبَّنَا اسْمَعْ بِعَضُنَا بَعْضٌ وَبَلِّغْنَا أَجَلَنَا الَّذِي أَجَلْتَ لَنَا﴾ ”جس روز اللہ ان لوگوں کو گھیر کر جمع کرے گا اس روز وہ جنوں (یعنی شیاطین جن) سے خطاب کر کے فرمائے گا اے گروہ جن، تم نے تو نوح انسانی پر خوب ہاتھ صاف کیا۔ انسانوں میں سے جو ان کے رفیق تھے وہ عرض کریں گے پروردگار ہم میں سے ہر ایک نے دوسرے کو خوب استعمال کیا ہے اور اب ہم اس وقت پر آپہنچے ہیں جو تو نے ہمارے لئے مقرر کر دیا تھا“ (انعام/ ۱۲۸) ﴿وَإِنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِنَ الْإِنْسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِنَ الْحَنِّ فَرَادَوْهُمُ رَهَقًا﴾ ”اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے اس طرح انھوں نے جنوں کا غرور اور زیادہ بڑھا دیا“ (جن/ ۶)

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمَنِ عَصِيًّا﴾ ”اے ابا شیطان کی پوجا نہ کریں کیونکہ شیطان تو خدائے رحمان کا نافرمان ہے“ (مریم/ ۴۳) ﴿يَسْأَلُ كَسَاوُوا يَعْبُدُونَ الْحَنِّ أَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُؤْمِنُونَ﴾ ”بلکہ وہ تو جنات کی پرستش کرتے تھے اور

ان کی اکثریت انہی کو مانتی ہے ﴿﴾ (سباء/۴۱)

﴿وإنه كان رجال من الانس يعوذون برجال من الجن فزادوهم رهقا﴾ ”اور یہ کہ بعض انسان بعض جنات سے پناہ طلب کیا کرتے تھے جس سے جنات کی سرکشی مزید بڑھ گئی“ (جن/۶)

کلدانیوں کے بت:

کلدانیوں نے سورج اور چاند اور ستاروں کی پرستش کی ہے انھوں نے ہر ستارے کے لیے ایک دن عبادت کے لیے مخصوص کیا۔ اتوار سورج کا دن ہے اس لیے اس کو Sunday کہتے ہیں پیر چاند کا دن ہے اس لیے اس کو Monday کہتے ہیں ہفتہ زحل کا دن ہے اس لیے اسے Saturday کہتے ہیں۔ کلدانیوں نے اپنے اسے پہلے والی قوم اشوریین سے بت پرست اور بت سازی کے طریقہ کو سیکھا۔ کلدانیوں نے اس نظریہ کو فروغ دیا کہ روئے زمین پر خوشحالی کے آثار بروج آسمانی سے وابستہ ہیں لہذا انسان کو اپنے برج سے آگاہ ہونا چاہیے۔

کلدانیوں نے بظاہر طبیعت کی پرستش کی ہے لہذا اپنے خداؤں کے حوالے سے درجات کے قائل ہیں۔ ان کے پاس سب سے بڑا بت آسمان ہے اس کا نام ایل ہے ان کے پاس یہ باپ کی جگہ ہے قدرت بھی رکھتا ہے رحم دل بھی ہے جس نے تمام مخلوقات کو خلق کیا ہے اس کا بت باوقار محترم اور بوڑھے کی شکل میں بنایا گیا دوسرا بت ”عشروت“ ہے یہ بت ماں ہے اس کے بعد بت بعل ہے جو راحت اور برکت اور بارش کا خدا ہے یہ ایک سرشار جوان کی طرح بنایا گیا اسی طرح انھوں نے سبزی اور نباتات کے لیے بت بنایا جسے ”عنات“ کہتے ہیں یہ بعل کی بہن ہے عیشرایہ بعل کی بیوی ہے کلدانیوں نے چشمے، کنویں اور درختوں کی پرستش کی ہے۔

انواع واقسام بت اور بت پرستی:

بت پرستی کب، کیسے اور کن بنیادوں پر شروع ہوئی، اس کا دقیق تعین کرنا نہایت مشکل ہے کیونکہ قدیم زمانے کی تمام قومیں بت پرستی کی اسیر تھیں لیکن بتوں کی شکل و صورت اور بت پرستی کا انداز مختلف تھا۔ جو بت ہندوستان کے بت پرستوں براہمہ، یوزی اور ہندوؤں کے بت کدوں میں تھے اور جو بت مملکت سہا، قوم عا دشمود اور قوم ہودو صالح میں تھے وہ ایک دوسرے سے مختلف تھے۔

بت پرستی

ہر وہ عمل جسے کوئی شخص نظام تنظیم یا پارٹی اور نام نہاد دینی سرگرمیاں جو انسان کو آگاہی اور تحقیق سے روکنے کا کردار ادا کریں وہ بت پرستی کہلائے گی۔ بت پرستی کے مصداق کو ہم خلاصہ کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔

۱۔ کسی مادی شکل کی یادگار کو فروغ دینا۔

۲۔ غیر صالح اور نا اہل افراد کی قیادت کا پرچار کرنا۔

۳۔ انتہا پسند اور رجعت پسند عقلموں کو بیک وقت ایک ملک اور ایک ہی جماعت میں وجود میں لانا تاکہ ملت جادہ مستقیم کو نہ پہچان سکے یا اپنے خلاف ہونے والے عزائم اور سازشوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔

۴۔ قومی ولسانی فکر کو فروغ دینا۔

۵۔ دین و مذہب سے ہٹ کر ترقی میں مجھ ہونے کے افکار کو فروغ دینا۔

۶۔ وہ علوم جو انسان کو دین و خدا سے روکتے ہیں انہیں فروغ دینا۔

۷۔ کاروبار و تجارت کو بنیادی مقام دینا۔

۸۔ آب و اجداد کی یادوں کو زیادہ اٹھانا اور عصر حاضر سے زیادہ ماضی میں مجھ ہونا۔

۹۔ وہ اولاد جو دین سے باغی ہے اسکی خوشی کو اپنی خوشی سمجھتا۔

۱۰۔ مال و دولت

۱۱۔ ملازمت

۱۲۔ قبیلہ و خاندان

۱۳۔ کہنہ پرستی۔

جن سے حاجت طلب کی جاتی ہے خود نیاز مند اور محتاج ہیں

خدا کو چھوڑ کر کسی سے اپنی حاجات کو وابستہ کرنا عقل و منطق سے عاری عمل ہے۔ قرآن نے ایسا کرنے والوں کو کافر اور مشرک قرار دیا ہے اسی کے ساتھ ان کے دلیل کا مطالبہ بھی کیا ہے۔ قرآن کریم میں خداوند متعال نے بت پرستی کے عمل کے غلط ہونے کے بارے میں چند دلیل سے استدلال کیا ہے یہ دلائل بعض پر تو پوری طرح صادق آتے ہیں اور بعض کے جذبات پر ان کا اطلاق ہوتا ہے۔ بتوں کی اقسام ہم پہلے بیان کر چکے ہیں لہذا یہاں تکرار نہیں کرتے قرآن کریم نے جن دلائل سے استدلال کیا وہ قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:

بت پرستی کی ممانعت کی وجوہات:

(۱) نفع و نقصان کا مالک ہونا 'جلب' منفعت اور دفع و ضرر تمام عقائد کا فلسفہ و حکمت کی برگشت اسی کی طرف ہے لہذا اللہ تعالیٰ نے بتوں سے وابستگی و لگاؤ اور ان کی پوجا و پرستش کو بہت سی آیات میں اس منطق کے تحت مسترد کیا ہے کہ بت نہ تو مالک نفع ہیں اور نہ ہی مالک نقصان۔

۲۔ یہ نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں لہذا تمہاری نذر دعا کو سنتے ہیں نہ حالت زار کو دیکھتے ہیں یہ استدلال ان تمام بتوں پر صادق آتا ہے جو جامد ہیں چاہے ساخت انسانی ہو یا موجود طبیعی جیسے درخت ستارے پانی دریا وغیرہ کے مانند ان کا ذکر مندرجہ آیات میں آیا ہے:

﴿ان تدعوهم لاسمعو دعائكم ولو سمعوا ما استجابوا لكم ويوم القيمة يكفرون بشركم﴾ ”انھیں پکارو تو وہ تمہاری دعائیں سن نہیں سکتے اور سن لیں تو ان کا تمہیں کوئی جواب نہیں دے سکتے اور قیامت کے روز وہ تمہارے شرک کا انکار کر دیں گے“
 فاطر (۱۴) ﴿كانهم خشب مسندة﴾ ”یہ گویا لکڑی کے کندے ہیں“ (مناقون/۴)

۳۔ وہ قاسد ظالم جابر انسان ہیں جنہوں نے عوام کی جاہلیت و نادانی سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی جبر و تشدد کے علاوہ خود کو حکام الوہیت پر پیش کر کے لوگوں کو اپنا عبد بنایا ہے ان کے بارے میں مندرجہ ذیل آیات میں ذکر ہے:

﴿قل ادعوا الذين زعمتم من دونه فلا يملكون كشف ضرعكم ولا تحويلاً﴾ ”ان سے کہو پکارو دیکھو ان معبودوں کو جن کو تم خدا کے سوا (اپنا کارساز) سمجھتے ہو وہ کسی تکلیف کو تم سے نہیں ہٹا سکتے ہیں نہ بدل سکتے ہیں“ (اسراء/۵۶) ﴿واتخذوا من دونه الهة لا يخلقون شيئاً وهم يخلقون ولا يملكون لانفسهم ضرراً ولا نفعاً ولا يملكون موتاً ولا حيوةً ولا نشوراً﴾ ”لوگوں نے اُسے چھوڑ کر ایسے معبود بنائے جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں جو خود اپنے لیے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتے جو نہ مار سکتے ہیں نہ چلا سکتے ہیں نہ مرے ہوئے کو پھر اٹھا سکتے ہیں“ (فرقان/۳) ﴿ملکوت ۱۷، اسراء ۲۴، فاطر ۱۳، زمر ۲۳، فصل ۷۵۔

☆۔ صاحبان مال و دولت: یہ لوگ گرچہ بقول بعض نہ ختم ہونے والے مال و دولت کے حامل ہیں لیکن اپنے اندر بغض رکھتے ہیں:

﴿قل لو انتم تملكون خزائن رحمة ربی اذالامسکم عسفة الانفاق﴾ ”اے نبی! ان سے کہو اگر کہیں میرے رب کی رحمت کے خزانے تمہارے قبضے میں ہوتے تو تم خرچ ہو جانے کے اندیشے سے ضرور ان کو روک رکھتے“ (اسراء/۱۰۰) د۔

☆۔ انبیاء و اولیاء سے حاجتیں وابستہ نہ کریں کیونکہ ایسا کرنا بعثت انبیاء کی حکمت کے خلاف ہے نہ یہ دین ہے اور نہ ہی حکم خدا ہے بلکہ ان کے بعثت کے خلاف ایک سازش ہے اس فکر کو فروغ دینے کی وجہ انبیاء کی پیروی کرنے سے روکنا ہے، ان سے حاجتیں مانگنا ان کی فضیلت نہیں بلکہ ان کی پیروی کرنا اور انھیں مقتدا بنانا ان کی فضیلت ہے انبیاء کو خداوند متعال نے تبلیغ و ترویج دین اور نفاذ و اجرا قانون الہی کے لیے منتخب کیا جبکہ ان لوگوں نے ظالم و جابر حکمرانوں کے لیے میدان خالی کرنے کے خاطر ان ذوات پاک کی قیادت و رہبری کے مسئلہ کو لوگوں کے اذہان سے محو اور فراموش کر کے ان سے حاجت طلبی دنیا کے مسئلہ کو معاشرے میں موضوع بحث و گفتگو بنا رکھا ہے یہ اس مشن کو سرگرم کر اور تقویت دینے کے لیے معاوضہ دے کر لوگوں کے ضمیر و وجدان کو خریدتے ہیں اور اس فکر سے اختلاف نظر رکھنے والوں کو طرح طرح کی توہمتیں و افتراء یا ضرورت پڑنے پر طاقت استعمال کرنے کی دھمکی دے کر بھی شہنشاہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

انبیاء و اولیاء کو مقام نبوت و رہبری سے اٹھا کر مقام الوہیت تک لے جانے کی مذموم روش یہودیوں اور مسیحیوں نے اپنائی ہے چنانچہ ان کے رد میں قرآن کریم میں یہ آیات آئی ہیں:

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ﴾ ”یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے

کہا کہ مسیح ابن مریم ہی خدا ہے“ (مائدہ/ ۱۷) ﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ عِزْيَرُ بْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ

النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ذَلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهَوْنَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ

قَبْلِ قَاتِلِهِمُ اللَّهُ اِنِّى يَوْفُكُونَ۔ اتَّخَذُوا أَحْيَارَهُمْ وَرَهَابَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ

وَالْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ وَمَا امْرُؤٌ إِلَّا عَبْدٌ فَاتَّخَذُوا آلَاءَهُمُ الْإِلَٰهَ اَلَا هُوَ سُبْحٰنَہٗ

عما یشْرکون﴾ ”اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ مسیح

اللہ کا بیٹا ہے یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں ان لوگوں کی باتوں کے مشابہ ہیں جو ان سے پہلے کافر ہو چکے ہیں اللہ انھیں غارت کرے یہ کدھر بیکتے پھرتے ہیں؟۔ انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور راہبوں کو اپنا رب بنا لیا ہے اور مسیح بن مریم کو بھی حالانکہ انھیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ خدائے واحد کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ذات ان کے شرک سے پاک ہے“ (توبہ/۳۰-۳۱) ص ۷۲۔

انھیں کی تقلید کرتے ہوئے غالیوں اسماعیلیوں نے دین و شریعت کو معطل کر کے آئمہ طاہرین کو مقام الوہیت اور ان سے حاجتیں اور نیازیں حاصل کرنے کے لیے پیش کیا ہے ان کا کہنا ہے خدا نے پہلے ان کو خلق کیا پھر تخلیق کائنات کو ان کے سپرد کیا ہے یا تدبیر کائنات کے سلسلہ میں یہودیوں اور مسیحیوں کے افکار کو لیا ہے آیات و روایات اور سیرت معصومینؑ کے علاوہ ان کے دعویٰ کے باطل ہونے پر عقل حاکم ہے عقل انسانی اس سلسلے میں ان گراہوں و منحرفین سے یہ پوچھتی ہے آیا خدا کی الوہیت ملکیت و قدرت ابھی اپنی جگہ باقی ہے یا نہیں اگر باقی ہے تو اہل بیتؑ کے نہ ماننے والی دیگر خلائق کی حاجتیں کیوں روا ہوتی ہیں۔

۲۔ اگر خدا نے اپنی الوہیت اور اس سے متعلق تمام مسائل کو اہل بیت کے حوالے کیا ہے اور اب اس کے پاس کچھ نہیں تو نعوذ باللہ خدا کی الوہیت ناقص ہو گئی ہے۔

بت اور بت پرستوں کے خلاف قرآن اور انبیاء کا رویہ

بعض افراد جو دین و مذہب کو ذریعہ معاش بنائے ہوئے ہیں کو یہ آیت بہت پسند ہے جہاں خداوند متعال نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خطاب کر کے فرمایا فرعون کے پاس جاؤ اور اس سے نرمی سے بات کرو۔ اور اسی طرح جہاں نبی اکرمؐ سے فرمایا گیا ان لوگوں کو سب و شتم مت کرو جو خدا کو چھوڑ کر بتوں کی پوجا کرتے ہیں وہ آیت جس میں ان لوگوں کو سب و شتم کرنے سے منع کیا ہے

جو غیر خدا کی پرستش کرتے ہیں اسی کو بزعم اپنے سند بنا کر فی زمانہ جابر و منحرف، مگر راہ اور دور جدید کے دیگر بتوں اور شعائر کے نام سے ہر روز دین میں خرافات داخل کرنے والوں کے خلاف آواز اٹھانے والوں پر مفسدین فی الارض کی تہمت لگاتے ہیں۔

ایسے لوگوں کیلئے ایک معقولہ جو اہل علم و دانش میں رائج ہے کہ تم نے ایک چیز کو یاد کیا اور باقی سب کو بھلا دیا صادق آتا ہے۔ انھوں نے نہیں دیکھا فرعون سے نرمی سے بات کرنے والے حضرت موسیٰ علیہ السلام سورہ مبارکہ طہ ۹۷ کے تحت سامری کے خلاف تندہ تیز اور انقلابی انداز میں اٹھتے ہیں:

﴿قَالَ فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيَوةِ أَنْ تَقُولَ لَا مِسَاسَ وَإِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَنْ تُخْلَفَهُ وَانْظُرْ إِلَى إِلَهِكَ الَّذِي ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا لَنُْحَرِّقَنَّهُ﴾ ”موسیٰ نے کہا: دور ہو جا (تیری سزا یہ ہے کہ) تجھے زندگی بھر یہ کہتے رہنا ہوگا: مجھے ہاتھ نہ لگنا اور تیرے لئے ایک وقت مقرر ہے جو تجھ سے ٹٹنے والا نہیں ہے اور تو اپنے معبود کو دیکھ کر جس (کی پوجا) میں تو منہمک ہے ہم اسے ضرور جلا ڈالیں گے اور پھر اس (کی راکھ) کو اڑا کر دریا میں ضرور نکھیر دیں گے“

اسی طرح جو موقف آپ نے بت خانے میں اٹھایا یا جو عمل پیغمبر اکرمؐ نے فتح مکہ کے موقع پر تمام مشرکین کی موجودگی میں انجام دیا یعنی اپنے عصا، مبارک سے سارے بتوں کو پاش پاش کیا یہ سب کچھ ان دین فروشوں کی نظروں سے اوجھل ہے اسی طرح ضرب کلیم کا ایک نمونہ جو بت پرستوں کے خلاف ہے اسکا نظارہ نہیں کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بت پرست سامری سے کہا اب تم یہاں سے نکل جاؤ نہ تم کسی سے بات کر سکتے ہو اور نہ ہی تم سے کوئی بات کر سکتا ہے تم معاشرے میں ذلالت اور تنہائی کی زندگی گزارو چاہے تمہیں موت لاحق ہو جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کے ساتھ جو رویہ اپنایا اسکی مثال تاریخ میں نہیں ملتی، اسکے بعد ضرب کلیم نے اس کو سالہ کو پاش

پاش کیا اور اسے جلایا اور پھر اسکی راکھ کو دریا میں پھینک دیا۔

☆ شرک و بت پرستی کو قرآن کریم نے ناقابل بخشش عمل قرار دیا ہے۔

☆ بت پرستی کرنے والوں کو قرآن کریم نے نجس قرار دیا ہے۔

☆ بت پرستی کو قرآن کریم نے ظلم عظیم قرار دیا ہے۔

☆ ابراہیم خلیل نے بتوں کو پاش پاش کیا۔

☆ موسیٰ کلیم نے بتوں کو جلا کر ہوا میں اڑایا۔

☆ بت پرستوں اور بت سازوں کو موسیٰ کلیم نے نجس اور منحوس قرار دے کر اجتماع سے دور کیا۔

بت پرستوں نے دین توحید میں کن جملوں اور ثقافت سے نفوذ کیا یہ عمل اپنی جگہ حیرت انگیز ہے اگر

ایسے کردار کے حامل افراد کو داد دینا جائز ہوتا تو ہم انہیں داد دیتے کہ وہ کیسے دین توحید کے

بیروکاروں کے درمیان داخل ہوئے۔ انہوں نے جس انداز اور کلمات و ثقافت سے بت پرستی کو

فروغ دیا وہ درج ذیل ہیں۔ قارئین کرام ملاحظہ فرمائیں۔

☆ شرک اتنا آسان نہیں کہ فورا ہی کوئی شرک اختیار کر لے۔

☆ برابر ایسا کرنا شرک ہے۔ یہ وہابیوں کا عقیدہ ہے۔

☆ واسطہ دینے میں تو کوئی حرج نہیں۔

☆ ہمیں بت پرستی اور احترام میں فرق رکھنے کی ضرورت ہے۔

☆ شرک و بت پرستی کی آیات کے بارے میں گفتگو کرنے والے دشمن اہل بیت ہیں اور اپنے اس

عمل سے اہل بیت کے فضائل کو روکنا چاہتے ہیں۔

☆ ہم تو اس عمل کو عین توحید سمجھتے ہیں۔

☆ شبیہ سازی میں کیا حرج ہے۔

☆ انکے خلاف بولنے سے ملت میں انتشار و اختلاف پیدا ہوتا ہے جبکہ ایسا کرنا ایک بڑا جرم ہے

ہم عبا و عمامہ پوشوں کے دست مبارک سے گھوڑے کی لجام پکڑا نا، فلک بوس علم کی سنگ بنیاد رکھنا، جعلی ضربیوں کے سامنے زیارت امام پڑھنا۔

ان دروازوں اور کلمات سے یہ انتہائی آسانی سے اس عمل میں وارد ہوئے بلکہ انکا استقبال کیا گیا۔ لیکن دین و ملت کے سرپرستوں نے باریک بینی اور عرق ریزی اور دوراندیشی سے انکے مقابل چشم پوشی، سکوت کو دین و ملت کی عظیم ترین مصلحت قرار دیا ہے۔

بت اور بت پرستی کا نتیجہ:

۱۔ اصل اور حقیقت کو چھوڑ کر پست اور نقلی چیزوں سے وابستگی۔

۲۔ صاحب حیات اور متحرک حقائق کو چھوڑ کر جامد اور ساکت چیزوں میں تبدیل کرنا۔

۳۔ پہلے مرحلہ میں یاد بانی اور یادگار کے واسطے کے طور پر اپنانا اور بعد میں استقلال کی حیثیت دینا، جس طرح سابق زمانے میں لوگ بتوں سے اظہار عقیدت کی خاطر اپنی اولادوں کو ان بتوں کے بندے قرار دیتے تھے جس طرح آج کل ہمارے لوگ اپنی اولادوں کو کلب فلاں امام قرار دیتے ہیں پہلے تو یہ لقب ہمارے سمجھ میں نہیں آیا لیکن جب اس پر غور کیا تو واضح ہوا کہ یہ مسمی کے کردار کی عکاسی کرتا ہے کیونکہ کلب دوسروں کو گھروں میں آنے سے روکتا ہے یہ لوگ بھی سب و شتم کر کے لوگوں کو آئینہ کی طرف آنے سے روکتے ہیں۔ اسی طرح پہلے زمانے میں علم امام حسین کے پرچم کی شبیہ تھا لیکن اب یہ قوم کی پہچان اور قبر میں پوچھے جانے والے سوالوں میں اسکا شمار ہونے لگا ہے پہلے لوگ اسے اپنے ہاتھوں میں بلند کرتے تھے لیکن اب یہ زمین میں گاڑا جاتا ہے اور اس کے نیچے صندوق رکھ کر دولت جمع کی جاتی ہے۔

جھنڈے کو عربی زبان میں ”رالیہ“ ”لوا“ کے علاوہ علم بھی کہتے ہیں علم مادہ علم سے ہے علم کسی چیز کی شکل و صورت ذہن میں آنے کو کہتے ہیں یہ اپنی جگہ دو قسم کا ہے ایک اس کی اصل شکل و صورت ذہن میں آنا ہے جیسے زید درخت پتھر وغیرہ دوسرا کسی چیز کے علم ہونے سے دوسرے کی طرف ذہن منتقل

ہوتا ہے یعنی یہ ایک نشانی ہے جس سے دوسرے کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے یہاں علم سے مراد دوسری صورت ہے۔ جنگوں میں بلند جھنڈے علامت تھے تاکہ اس جھنڈے سے وابستہ افراد اپنے واپسی کیلئے اسے نشان قرار دیں لہذا یہ صرف ایک نشانی ہے عزا داروں نے بھی جلوس میں عزا داروں کو جمع کرنے کیلئے یا کر بلا کی جنگی منظر دکھانے کیلئے بطور نشان اسے استعمال کیا۔ اس وقت یہ علم تھا لیکن اب تو اس نے استقلالیہ اختیار کر لی، جو کچھ امام حسینؑ سے نہیں مانگ سکتے تھے اس سے مانگنا شروع کیا، وہ تو اضع جو امام حسینؑ کے سامنے کرنا شرک تھا اس کے سامنے کی جاتی ہے۔ حسین اب بھی بندہ خدا ہیں لیکن یہ پرچم اب ان عزا داروں کا خدا بننا ہوا ہے

۴۔ پہلے مرحلے میں اجتماعی اور عمومی حیثیت دینا بعد میں فردی گروہی اور خاص حیثیت دینا۔ کسی چیز کی نقل کو اصل کا مقام دینے کو بت پرستی کہتے ہیں بت پرستی ایک سرسری اور سادہ سرگرمی نہیں بلکہ یہ خاص افکار و نظریات اور ثقافت کی حامل ہے بت پرستی کی ترویج کیلئے ایسے افکار و نظریات کو فروغ دیا جاتا ہے تاکہ بت پرستی کو دوام حاصل ہو بت پرستی کو معاشرے میں فروغ دینے والوں کی مثال اس عورت کی مانند ہے جو اپنے بچے کی پشت پر تھکی دیتے ہوئے ترنم کے ساتھ اسے سنانے کی کوشش کرتی ہے تاکہ اسکے بعد وہ آرام سے اپنا کام کر سکے۔ اسی طرح دنیائے استعمار نے اقوام و ملل کو خواب غفلت میں رکھنے کیلئے بہت سی بے ہودہ سیاسی و ثقافتی سرگرمیوں کو معاشرے میں رواج دیا ہے تاکہ وہ آرام سے انکا استحصال کر سکیں جیسے مختلف قسم کی بین الاقوامی کھیلیں، سیف گیسز، کرکٹ اور دیگر میچوں کی سرگرمیاں وغیرہ چنانچہ آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا حالیہ بغداد میں جب امریکی جہاز آسمان سے بمباری کر رہے تھے تو اسی وقت نیچے لوگوں کو فٹ بال کھیلتے ہوئے دکھایا گیا یہ لوگوں کو غفلت میں رکھنے کی ایک مثال ہے۔ اسی طرح افغانستان میں قبضہ کرتے وقت ہمارے ملک میں سیف گیسز کی تیاریوں اور انعامات کی قراردادوں میں لوگوں کی توجہ کو مصروف رکھا گیا یا ڈیم بنانے کا شوشہ چھوڑ دیا گیا لہذا اپوزیشن بھی بخوبی جانتی ہے لیکن مزاحمتی سرگرمیاں شروع کرتی

ہے کیونکہ ان دونوں کے اہداف ایک ہی ہیں

شبہ سازی:

اس وقت مسلمانوں میں خاص طور پر شبہوں میں شبہ سازی دین کا ایک رکن اور مذہبی نشان بنی ہوئی ہے۔ شبہ تشبیہ سے ماخوذ ہے جب دو مختلف چیزیں چند لحاظ سے آپس میں مشابہت رکھتی ہوں اس وقت صفت سے شبہت رکھنے پر بطور نمونہ پیش کرنے کو تشبیہ کہتے ہیں تشبیہ کا مقصد موجود چیز سے غائب چیز کی یاد دہانی کرنا ہوتا ہے یعنی کسی چیز کی اس جیسی چیز سے تعریف کرنے کو تشبیہ کہتے ہیں اور اس عمل کو شبہ سازی کہتے ہیں۔

تشبیہ کے چار ارکان ہیں:

۱۔ مشبہ یعنی تشبیہ دینے والی چیز۔ ۲۔ مشبہ بہ جس چیز سے تشبیہ دی جائے۔

۳۔ آلات تشبیہ جس کے ذریعے تشبیہ دی جائے۔ ۴۔ وجہ تشبیہ دونوں میں شبہت کے سبب کا بیان کرنا۔

جس موجود چیز کی کسی غائب چیز سے تعریف و ثنا سائی کرنا چاہتے ہیں اس موجود چیز کو مشبہ اور غائب کو مشبہ بہ کہتے ہیں۔

وہ کلمہ جو تشبیہ دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے اسے آداب تشبیہ کہتے ہیں اور جس صفت کی وجہ سے موجود و غائب دونوں کو ایک دوسرے کی مانند سمجھا جاتا ہے اسے وجہ شبہ کہتے ہیں۔

ارکان تشبیہ واضح ہونے کے بعد اگر مرحلہ اہداف تشبیہ یعنی شبہت دینے کا مقصد ہے شبہت دینے کا مقصد مخاطب کو مشبہ یا مشبہ بہ کے بارے میں آگاہ کرنا ہے یا اس سے مشبہ کے حکم کو ثابت کرنا ہے بطور مثال زید میدان جنگ میں دشمن پر ٹوٹ پڑنے میں شیر جیسا ہے۔ یہاں زید کو شجاع ثابت کرنے کے لیے شیر جیسا کہنے کا مطلب یہ ہے وہ میدان جنگ میں حملہ آور ہونے اور جرات

دکھانے میں شیر جیسا ہے یعنی وہ بھی اپنے مد مقابل پر اس طرح حملہ آور ہوتا ہے جس طرح شیر غصے اور غیظ و غضب سے شکار کرنے والے حیوانوں پر ٹوٹ پڑتا ہے اس شباهت کے بارے میں علماء کا کہنا ہے زید کا صرف اپنے مد مقابل پر ٹوٹ پڑنے میں شیر کی مانند دکھانا اس کی تعریف نہیں بلکہ اس کا نقص و عیب گنا جائے گا۔

ارکان شباهت واضح ہونے کے بعد اگلا مرحلہ تشبیہ کے اہداف و مقاصد آثار و نتائج اور احکام کا مرتب کرنا ہے۔

شبہ سازی جیسے عمل غیر منصفانہ طور پر اختیار کر کے کئی جہات اور زاویوں سے اس سے دین و مذہب کے روشن و تابناک چہرے کو مسخ کیا گیا ہے یہاں ہم اس سلسلہ میں چند زاویوں سے پردہ اٹھائیں گے۔

کسی چیز کو شعائرِ قراردینے کے لئے شبہ سازی:

قرآن و سنت کے مطابق شبہ سازی کلی طور پر ہمیشہ حق تک رسائی کا وسیلہ نہیں ہے بلکہ اکثر و بیشتر اس کا انجام ہلاکت و گمراہی اور جہنم ہے شباهت ہمیشہ غلط اور غیر حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے۔

﴿ان البقر تشبه علينا وان شاء الله لمهتدون﴾ ”ہمیں اس کی تعین میں اشتباہ ہو گیا ہے اللہ نے چاہا تو ہم اس کا پتہ پالیں گے“ (بقرہ/۷۰) ﴿تشابهت قلوبہم﴾ ”ان کے دل ایک جیسے ہو گئے ہیں“ (بقرہ/۱۱۸) ﴿وما قتلوه وما صلبوه ولكن شبه لهم﴾ ”انہوں نے نہ انہیں قتل کیا اور نہ سولی چڑھایا بلکہ دوسرے کو ان کے لئے شبہ بنا دیا گیا“ (نساء/۱۵۷) ﴿فاما الذين في قلوبهم زيغ فيتبعون ما تشابه منه ابتغاء الفتنة وابتغاساويله﴾ ”اب جن کے دلوں میں کجی ہے وہ انہیں تشابہات کے پیچھے لگ جاتے ہیں تاکہ فتنہ برپا کریں اور من مانی تاویلیں کریں“ (آل عمران/۷۷)

[بما شباه الرجال ولا الرجال! حلوم الاطفال، وعقول ربات الحجال] ”اے مردوں کی شکل و صورت والو اور واقفانہ مردو! تمہاری فکریں بچوں جیسی اور تمہاری عقلیں جلد نشین عورتوں جیسی ہیں“ [نسخ البلاغہ (خطبہ/۲۷)] وانما سميت الشبهة شبهة لانها تشبى الحق [”یقیناً شبہ کو شبہ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ حق سے مشابہ ہوتا ہے“ (خطبہ/۳۸)] تعالیٰ اللہ عما یقولہ المشبهون [”وہ مخلوقات سے تشبیہ دینے والے“ (خطبہ/۳۹)] اذ شبهوك باصنامهم [”انھوں نے تجھے اپنے اصنام سے تشبیہ دی ہے“ (خطبہ/۹۱)] ان الفتن اذا قبلت شبهت [”یاد رکھو فتنے جب آتے ہیں تو لوگوں کو شحات میں ڈال دیتے ہیں“ (خطبہ/۹۳)] واحذها من مصرحاتها ومشتبهاتها [”کبھی واضح راستوں سے حاصل کیا اور کبھی مشتبہ طریقوں سے“ (خطبہ/۱۰۹)] متشابهة (متسابقة) امورہ [”اس کے تمام معاملات ایک جیسے“ (خطبہ/۱۵۷)] فان شبهته بما نبتت الارض [”اور اگر انھیں زمین کے نباتات سے تشبیہ دینا چاہو گے“ (خطبہ/۱۶۵)]

[وان المتبدعات المشبهات هن المهلكات الاما حفظ (عصم) اللہ منها] ”اور نئی بدعتیں اور نئے نئے شبہات ہی ہلاک کرنے والے ہیں“ (خطبہ/۱۶۹) اقرب اشتباه الامثال [تالما والمرهم فی حال تشبتهم وتفرقهم، لیالی کانت الاکاسریة والقیاصریة اربا بالہم، یختارونہم عن ریف الافاق، وبحر العراق، ووحضرة الدنيا، لی منابت (مہات) الشیخ، ومہافى الریح.....] ”دیکھو ان کے انتشار و افتراق کے دور میں ان کا کیا عالم ہے کہ قیصر و کسریٰ ان کے ارباب بن گئے تھے اور انھیں اطراف عالم کے سبزہ زاروں، عراق کے دریاؤں اور شادابیوں سے نکال کر خاردار جھاڑیوں اور آندھیوں کی بے روک گذرگاہوں اور معیشت کی

دشوار گزار منزلوں تک پہنچا کر اس عالم میں چھوڑ دیا تھا کہ وہ فقیر و نادار، اونٹوں کی پشت پر چلنے والے اور بادلوں کے خیموں میں قیام کرنے والے ہو گئے تھے گھربار کے اعتبار سے تمام قوموں سے زیادہ ذلیل اور جگہ کے اعتبار سے سب سے زیادہ خشک سالیوں کا شکار تھے نہ انکی آواز تھی جن کی پناہ لے کر اپنا تحفظ کر سکیں اور نہ کوئی الفت کا سایہ تھا جس کی طاقت پر بھروسہ کر سکیں۔ حالات مضطرب، طاقتیں منتشر، کثرت میں انتشار پلا کیں سخت۔ جہالت تہ بہ تہ۔ زندہ در گور بینیاں۔ پتھر پر ستش کے قابل، رشتہ داریاں ٹوٹی ہوئی اور چاروں طرف سے حملوں کی یلغار۔“ (خطبہ/۱۹۲) [یقولون فی شبہون ویصفون فیموہون] ”جب بات کرتے ہیں تو مشتبہ قسم کی اور جب تعریف کرتے ہیں تو باطل کو حق کا رنگ دے کر“ (خطبہ/۱۹۳) [والمحکم والمتشابه، فوضع کل شیء موضعہ] ”خاص و عام اور محکم و متشابہ کو بھی پہچانتا ہے اور اس کے مطابق عمل بھی کرتا ہے“ (خطبہ/۲۱۰) [غیرانہ بک شبہ] ”تم بالکل یہی شخص نہیں ہو لیکن اسی کے جیسے ہو“ (کلام/۷۳) [واوقفہم فی الشبہات] ”شبہات میں توقف کرنے والے ہوں اور دلیلوں کو سب سے زیادہ اختیار کرنے والے ہوں“ (کلام/۵۳) [فان الحاحل المتعلم شبہہ بالعالم] ”جاہل بھی اگر سیکھنا چاہے تو وہ عالم جیسا ہے“ (ن/۳۲۰) [فانہ قل من تشبہ بقوم الا و شک ان یکون منہم] ”بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی کسی قوم کی شبہت اختیار کرے اور ان میں سے نہ ہو جائے“ (ن/۲۰۷) [فما اشبہ علیک علمہ فاللفظہ] ”اور اگر اس کی حقیقت مشتبہ ہو تو اسے پھینک دیا کرو“ (کتاب/۳۵) [ومحکمہ و متشابہہ] ”محکم و متشابہ سب کو واضح کر دیا ہے“ (خطبہ/۱)

شبہ سازی اپنی مادہ و صورت، غرض و غایت اور دلیل و برہان میں بت سازی سے چنداں فرق

نہیں رکھتی۔

۱۔ ہم ان بتوں اور شبیہوں کے ذریعے خدا سے قرب حاصل کرنا چاہتے ہیں جبکہ اگر حقائق کو مد نظر رکھا جائے تو واضح ہوگا یہ بت ہر قسم کی سماعت و بصارت سے محروم ہیں یہ نفع و نقصان دینے سے قاصر ہیں کیونکہ جو نفع و نقصان پہنچانے کا حامل ہوتا ہے جب تک محتاج مند کی فریاد کو نہ سن سکے اور اس کے حالات کو نہ جان سکے اس وقت تک اس کی فریاد رسی نہیں کر سکتا چہ جائیکہ وہ چیز جو اصلاً سماعت و بصارت سے محروم ہے وہ کسی کی مدد کرے۔

۲۔ بت سازی یا اس طرح کی کوئی بھی شکل و صورت بنانا یا کسی کو نمائندہ قرار دینا صرف اسی وقت معقول ہوتا ہے جب خداوند متعال کی طرف سے ایسا کرنے کی صریح الفاظ میں اجازت دی گئی ہو اللہ تبارک تعالیٰ نے قرآن کریم کی آیات میں واضح طور پر بیان فرمایا ہے کسی کو بھی اس طرح کی چیزیں بنانے کی اجازت نہیں۔ شبیہ سازی و مجسمہ سازی کی تمام اشکال و صورتیں بھی ایسی ہی ہیں۔

۳۔ بت سازی کی تمام اشکال و صورتیں انسان کو اپنے مالک حقیقی و مولائے حقیقی سے دور کرتی ہیں، بلکہ اسے نسیان کے مرتبہ تک پہنچا دیتی ہیں۔ شبیہ سازی سے بھی ایسے ہی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

۱۔ یہ چیزیں انسان کی فریاد و فغان اور اسکی حالت زار کو دیکھنے سننے اور سمجھنے سے محروم ہوتی ہیں۔ کیونکہ گھوڑا کبھی بھی آپ کی پریشانی اور حالت زار کو سمجھ نہیں سکتا۔

۲۔ ان کے پاس کسی قسم کے خزانہ یا مسائل کا حل موجود نہیں، یہ اپنے ماننے والوں کو کچھ عنایت کر سکیں انکی ضروریات کو پورا کر سکیں۔

۳۔ آئمہ طاہرین کی طرف سے اس قسم کے وسیلے بنانے کا کوئی حکم یا ہدایت صادر نہیں ہوا۔

۴۔ جس طرح بتوں نے بت پرستوں کو خدا سے جدا کیا اسی طرح ان چیزوں نے شیعوں کو آئمہ طاہرین اور انکے احکام و تعلیمات سے دور کیا ہے۔

۵۔ بت پرستی کرنے والے اپنے اس عمل کی سند میں اپنے آبا و اجداد کی سیرت و سنت کو پیش کرتے تھے۔ اسی طرح آج شبیہ ساز بھی اپنی اس ظالمانہ حرکت کا جواز اپنے سابق آبا و اجداد کی سیرت و سنت کو پیش کرتے ہیں درحقیقت وہ اس سند کو پیش کرنے میں بھی جھوٹے ہیں کیونکہ وہ اپنی دنیوی زندگی کو انکی سیرت پر چلانے کیلئے تیار نہیں ہیں بہت پیچھے آبا و اجداد تو چھوڑیں یہ تو اپنے زندہ باپ کو فرسودہ اور دیرینہ فکرا حامل کہتے ہیں۔ لیکن دین کو ان کے نظریات پر چلانا چاہتے ہیں۔

شبیہ سازی یا ظلم روائی یا ظلم کی ترویج

علماء و محققین نے ظلم کے معنی کسی صاحب حق کو اس کے حق سے محروم کرنے سے کئے ہیں شبیہ بھی جیسا کہ واضح ہے نقل کو اصل اور مفروضہ کو حقیقت کی جگہ پر پیش کرنے کا عمل ہے جس طرح خدا کی پرستش کی جگہ بتوں کی جگہ لینے پر عبادت خدا انہوں سے محو ہوئی۔ اسی طرح ان شبیہوں کی وجہ سے امام حسین اور انکے مقدس قیام کے حقیقی مفاہیم اور اسکے اہداف و مقاصد کو پس پشت ڈال کر گھوڑوں، ضربکوں اور جھنڈوں نے جگہ لے لی ہے۔ آج عزاداروں کے قول و فعل اور اذہان پر یہی چیزیں چھائی ہوئی ہیں۔ امام حسین علیہ سلام پر اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوگا۔ وقت کے یزید نے اس وقت امت کو وجود حسین سے محروم کیا اور عصر حاضر کے یزید نواز اور انکے ہم خیالوں نے امام کے اہداف و مقاصد کو ذہنوں سے مٹا کر ان چیزوں کو انکی جگہ پر رکھا ہے قیام امام حسین کے اہداف و مقاصد پر تحقیق کرنے والے اس پر قلم و بیان صرف کرنے والے دین حسین کی ترویج و اشاعت کرنے والے علماء و محققین، فرزدق و کیت جیسے شاعرین کر آہکی مظلومیت کو مرثیوں میں پیش کرنے والے مخلص سمجھدار شعراء فقر و فاقہ اور محرومیت کی زندگی گزار رہے ہیں اور ان شبیہوں کو اٹھانے والے کروڑ و پتی بن چکے ہیں۔

اس سلسلہ میں فتویٰ کی سند پیش کرنے والے مقلد و مرجع دونوں کو چاہیے وہ جائز و ناجائز پر مہر لگانے کی بجائے دس بیس صفحات پر مشتمل قرآن و سنت اور سیرت معصومین کی تحریر پیش کریں۔ تاہم مسلمانوں کی کثیر رقم کس کے پاس جاتی ہے اور کس مصرف پر خرچ ہوتی ہے معلوم نہیں ہے اسے صرف فعل جائز پر خرچ کرنے کا اصرار کرنا بذات خود ایک ناروا ظلم ہے۔

۱۔ گھوڑے کو صرف اس منظر کی یاد کے لیے تشبیہ دینا کہ امام حسینؑ اس سواری سے زمین پر گرے اور یہ سواری امام حسینؑ کے بغیر خیام کی طرف آئی تو اہل بیتؑ کے لیے یہ منظر انتہائی دردناک اور مصیبت آور تھا۔ اس درد انگیز منظر کو دکھانا چاہیں تو اتنا ہی دکھا سکتے ہیں لیکن مفاد پرستوں نے اتنی تشبیہ پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ اگلے مراحل میں انہوں نے دین و ملت کے بہت سے مقدمات و مقدرات کو بھی پامال کیا۔

جعلی ضریحیں:

عرصہ دس سال سے یہاں جعلی ضریحوں کا سلسلہ شروع ہے اور ان کے ارد گرد دن رات بے حجاب خواتین اور مرد حضرات مخلوط طریقے سے گردش کرتے رہتے ہیں، وہاں کھڑے ہو کر ضریحوں سے مخاطب ہو کر راز و نیاز پیش کرتے ہیں ان اسے اپنی حاجتیں مانگتے ہیں، دو لہا دلہن شادی کے موقع پر یہاں آ کر سربسجود ہوتے ہیں کیا آپ بتائیں گے ان کے اندر کون ہیں اور کیا یہاں کوئی مقدس ہستی ہے یا کوئی امام یہاں تشریف فرما ہیں یا یہ جعلی و خود ساختہ ہیں اور محض جھوٹ و فریب پر مبنی ہیں کیا صادقین کے ساتھ ہونے کی نشانی یہی ہے کہ انسان جعلی ضریحوں کے گرد گردش کرے اور ان کے سامنے اپنی حاجات و مشکلات پیش کرے ان ضریحوں کے اندر جمع ہونے والی رقوم کہاں اور کس مد میں خرچ ہوتی ہیں کیا یہ اعلیٰ و ارفع اہداف کے فروغ میں خرچ ہوتی ہیں یا مفاد پرستوں کی جیب میں جاتی ہیں یا نعوذ باللہ تخریب دین کی مد میں خرچ ہوتی ہیں جس دین میں یتیم و یتیم و دیوانہ لوگوں کے مال و دولت کے حفاظت کی ذمہ داری ہر مسلمان پر عائد ہوتی ہے اور جس دین نے اوقاف اور

مجبور المالك اموال کی حفظ و نگہداری کا ضامن مجتہدین اور ان کے خاص اجازت یافتہ افراد کو مسئول و ذمہ دار قرار دیا ہے کیا کسی وقت مجتہدین نے ان ضربوں میں جمع ہونے والی رقوم اور یہ کس مد میں خرچ ہوتی ہیں ان کے بارے میں کوئی تحقیق کی ہے یا ان کی تمام تحقیقات صرف مال خمس تک محدود ہیں۔

۲۔ ایک گھوڑے اور حیوان کے نام پر مسلمانوں سے نذر و نیاز جمع کرنا بذات خود ایک فعل غیر شرعی و حرام کا ارتکاب ہے۔

۳۔ ایک حیوان کے نام سے بے بہا مال و دولت جمع کرنا ملت کے ساتھ ایک بہت بڑا دھوکہ ہے۔
۴۔ یہ نذر و نیاز اور اس طرح حاصل ہونے والا مال و دولت کس مد میں خرچ ہوتا ہے یہ اب تک ملت سے پوشیدہ ہے۔

۵۔ اگر یہ وہی سواری ہوتی جس پر امام حسین سوار ہوئے تھے تب بھی یہ کسی عام انسان سے افضل و اشرف اور ہر انسان کے لیے قابل تکریم و احترام نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ یہ حیوان ہر حال میں حیوان ہی رہے گا کوئی نبی یا امام کسی انسان سے یہ نہیں کہہ سکتے تم سے میری سواری یا میرا یہ حیوان افضل و اشرف ہے جب تک کسی انسان نے صفت انسانیت سے گر کر صفت حیوانی کو نہ اپنا لیا ہو۔

۶۔ اس گھوڑے کو اُس گھوڑے کی شبیہ نہیں بنایا جاتا ہے پر امام حسین سوار ہوئے تھے بلکہ اسے مولا کہتے ہیں اس سے راز و نیاز اور حاجات مانگتے ہیں امام حسین کے دور میں کوئی بھی انسان امام حسین کی سواری سے حاجت نہیں مانگتا تھا چاہے وہ دیوانہ ہی کیوں نہ ہو وہ لوگ امام سے بات کرتے تھے نہ کہ حیوان سے۔

۷۔ لکڑی، پتھر اور پتیل وغیرہ کے گھوڑے بنا کر بت خانوں میں سجانے کا سلسلہ ملک کے گوشہ و کنار میں شروع ہو چکا ہے ہر ایک نے اپنے اپنے گھروں میں اس گھوڑے کے بت بنا

رکھے ہیں۔

۸۔ پوری قوم و ملت کا فرض ہے امام کی سواری کے نام سے گھوڑا پرستوں سے سوال کریں کہ وہ اس عمل سے حاصل ہونے والی رقوم کو کس مد میں خرچ کرتے ہیں۔

۹۔ اگر کوئی ہندو مسیحی یا یہودی وغیرہ اہل تشیع سے پوچھے سابق زمانے میں گاؤ پرستی اور گھوڑا پرستی کرنے والوں اور آپ کے مذہب کے پیروکاروں کو جو لگاؤ اس گھوڑے سے ہے ان دونوں میں کیا فرق ہے تو کیا وہ علماء اور وہ مجتہد جو اس عمل گھوڑا پرستی کو مستحسن قرار دیتے ہیں اپنے موقف کے ثبوت میں کسی آیت قرآن، روایت معصومین اور سیرت انبیاء پر مشتمل چند صفحات سے استدلال پیش کر سکیں گے یا اس گھوڑے کے بارے میں ان کی فکر خود ساختہ ہے اور یہ ان کی ذاتی تشخیص اور استحسان و قبح آرائی سے ماخوذ ہے۔

ستارہ پرستان:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات طیبہ میں دو بار آسمانی ستاروں کا ذکر آیا ہے جس سے بعض نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ابراہیم ابتداء میں ستارہ پرست تھے پہلی دفعہ جب آپ سے قوم نے میلے میں جانے کیلئے کہا تو آپ نے ستاروں کی طرف دیکھ کر فرمایا میں مریم ہوں۔

دوسری مرتبہ آپ نے رات کو ستاروں کو دیکھا تو فرمایا یہ میرا رب ہے۔ ہم اسی مناسبت سے حضرت ابراہیم خلیل قہرمان توحید سے دفاع کریں گے اسی طرح ہم مسلمان اس وقت ایک قسم کی ستارہ پرستی میں مبتلا ہیں حتیٰ کہ وہ افراد جو دین مبین اسلام کے خود کو داعی اور مروج کہتے ہیں وہ بھی لوگوں کو ستاروں کی گردش کے حساب سے سعادت اور نحوست زندگی کے بارے میں اپنی خام خیالی میں راہنمائی کرتے ہیں لہذا مناسب سمجھتے ہیں ستاروں کا ہماری زندگی میں کیا کردار ہے اور ایسا عقیدہ رکھنے والوں کے بارے میں قرآن و سنت اور سیرت معصومین کیا فرماتے ہیں اور فقہاء اسلام کیا فتویٰ دیتے ہیں۔

علماء ادیان و مذاہب نے ستاروں کی پرستش کرنے والوں کو صابئین کہا ہے:

صابئی مادہ صبا سے ہے ایک دن چھوڑ کر دوسرے دن میں داخل ہونے کو صبا کہتے ہیں۔ کتب قاموس ولغت میں صابئین ستارہ پرستوں کو کہا گیا ہے ان کی اصل برگشت کے بارے میں علمائے ادیان و مذاہب میں اختلاف ہے۔ بعض کا کہنا ہے یہ دین شیش و ادریس پر باقی ہیں۔ جبکہ بعض نے کہا ہے کہ صابغ فرزند موشلمہ بن ادریس سے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ صابغ بن ماری ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور میں گزرے ہیں۔ تاریخ بت و بت پرستی کے تسلسل اور اقسام میں سے ایک واضح اور نمایاں بت پرستی، ستارہ پرستی کے نام سے معروف ہے شہسوار بت شکن حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو بھی جہاں سامنا تھا ان آیات میں انھیں صابئی کہا گیا ہے۔

غرض صابئین سات بڑے ستاروں کے ساتھ بارہ برجوں کی تعظیم و تقدیس کرتے ہیں۔ انکی صورتیں بناتے ہیں اور انکے لئے قربانی دیتے ہیں۔ قرآن کریم میں سورہ بقرہ ۶۲، مائدہ ۶۹ میں ستارہ پرستوں کا ذکر موجود ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّابِئِينَ مِنْ آمِنٍ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ
الْآخِرِ﴾ ”بے شک مسلمان، یہودی، نصاریٰ اور صابئین میں سے جو کوئی اللہ
اور آخرت پر ایمان لے آئے“ (بقرہ/۶۲) ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ
وَالنَّصَارَى مِنْ آمِنٍ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلُوا صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ
يَحْزَنُونَ﴾

”جو لوگ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل انجام دیتے ہیں وہ خواہ
مسلمان، یہودی، صابی یا عیسائی انھیں (روزِ قیامت) نہ کوئی خوف ہوگا نہ ہی وہ محزون
ہو گئے“ (مائدہ/۶۹)

چنانچہ سورہ واقعہ آیت ۸۵ اور ۷ میں خداوند عالم نے انہی ستاروں کی قسم کھائی ہے:

﴿فَلَا اقْسَمْ بِمَوْقِعِ النُّجُومِ- وَاِنَّهُ لَقَسَمٌ لِّوَتَلْعَمُونَ عَظِيمٌ﴾ ”میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے مقامات کی اور اگر تم سمجھو تو یہ یقیناً بہت بڑی قسم ہے۔“

منطقہ حران شمال مغربی عراق میں واقع ہے جو آج کل تقیہ میں ہے، اسے صائبین کا مرکز گنا جاتا ہے یہاں پر انہوں نے مدرسہ فلکیات قائم کیا ہے یہیں سے علم ستارہ شناسی دیگر اقوام و ملل کی طرف منتقل ہوا ہے ستارہ پرستوں کا عقیدہ ہے کچھ روحانی طاقتیں ہیں جو ہمیں عظمت و بزرگی بخشی ہیں اور یہ ان مقامات سے نکلتی ہیں جہاں تاریکی نہ ہو اور یہ مقامات ستارے ہیں منطقہ حران میں بت اور رب ت خانے ہیں شہرستانی لکھتے ہیں صائبین نے جن ستاروں کے مجسمے بنائے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

زحل، مشتری، مریخ، سورج، چاند، زہرہ، عطارد کے متعلق صائبین کا خیال ہے یہ تقرب رب اور باب اور مسبب الاسباب سے قرب کا سبب بنتے ہیں شہرستانی لکھتے ہیں ستارہ پرست حضرت ابراہیمؑ کے دور میں یا ان سے پہلے موجود تھے چنانچہ انہوں نے سورہ انعام کی آیت نمبر ۷۷ سے استدلال کیا ہے ستارہ پرست مختلف مقامات پر منتشر تھے اور عربوں میں ستارہ پرستی انہیں صائبین اور کلدانیوں سے آئی ہے یہاں سے عربوں نے ہر ستارے کی ایک صفت بیان کی ہے مثلاً کہتے ہیں ثریا ثرا سے بنا ہے اور یہ ستارہ بارش ہے اور اسے اس لیے ثریا کہتے ہیں کہ اسکی بارش ہماری ثروت و دولت میں کثرت کا سبب بنتی ہے مذہب صاعی کے افراد جن ستاروں کی پرستش کرتے ہیں ان میں سے ایک ستارہ زہرہ ہے ان کے نزدیک اس کا بہت مقام ہے اس کے لئے انہوں نے بہت سے نام متعارف کروائے ہیں چنانچہ ہندوستان میں اس کا الگ نام ہے اور ایران میں الگ۔ فیونیکین، روم و یونان اور عربوں نے اسے زہرہ کا نام دیا ہے انکا کہنا ہے اسکی پرستش کرنے والے انسان تمام منکرات اور برائیوں کو مباح سمجھتے ہیں ستارہ پرست عربیہ حالت میں حسین و جمیل عورتوں کو اکٹھا کرتے ہیں اور اسے اس ستارے سے نسبت دیتے ہیں ان کا کہنا ہے مشتری کے بعد

سعادت اور خوشیوں کی برگشت اسی کی طرف ہوتی ہے۔

طبقات صابئی:

صابئین لفظ بقرہ آیت ۶۲، ماندہ ۶۹، حج ۱۷ میں آیا ہے۔ علماء کا کہنا ہے صابئین صابہ سے بنایا ہے صابہ کے معانی میل کے ہیں یعنی ایک دین کو چھوڑ کر دوسرے دین کو اپنانے والوں کو صابغ کہتے تھے صابغ اسم فعل صابہ ہے۔ بعض نے کہا ہے صابہ مادہ صحبت تیرنے سے لیا ہے یہ مذہب یہود و نصاریٰ سے نکلنے والی ایک شاخ ہیں انھیں صابئین کہتے تھے گزشتہ زمانہ کے ساتھ س ص سے بدل گیا ہے بعض کا کہنا ہے صابئین شہر سہا کے رہنے والوں کا دین ہے یہ مادہ سہا سے ہے اہل تحقیق کا کہنا ہے صابئین دو گروہوں میں تقسیم ہیں ایک صابئین موحّد جو یہودیت اور مسیحیت سے نکل کر ستارہ پرست بنے دوسرے صابئین شرک ان کا دین ستارہ پرستی پر مبنی ہے سورہ ماندہ میں جن صابئین کا ذکر آیا ہے وہ صابئین موحّد ہیں سورہ حج میں جن کا ذکر آیا ہے وہ صابئین شرک ہیں بعض کا کہنا ہے صابئین اہل توحید اور اہل شرک کے درمیان سے نکلنے والے مذہب کا نام ہے یہ لوگ تین گروہوں میں تقسیم ہیں:

۱۔ ضرورت وجود کو اکب کے قائل ہیں ان کی نظر میں سورج سب سے بڑا خدا ہے

۲۔ دوسرے گروہ کا کہنا ہے ستارے خدا کا مظہر ہیں۔

۳۔ تیسرے گروہ کا کہنا ہے ستارے حکم خدا سے کائنات میں تصرف کرتے ہیں۔

صابئین کا کہنا ہے ستارے اس کائنات میں ارواح کے ذریعے سفر کرتے ہیں شاعر ستانی لکھتے ہیں بعض صابئین ستاروں کی پرستش نہیں کرتے بلکہ یہ ستارے کا ایک بت بناتے ہیں اور اپنے بت خانے کی شکل و صورت اس ستارے کی شکل و صورت پر تیسری صدی تک صابئین کا مرکزِ حرا ان میں تھی۔

ان ستاروں میں سے بعض کی بشر نے پرستش کی ہے اور قرآن کریم میں ان کا نام لیا ہے وہ یہ ہیں:

شعری:

﴿وانه هورب الشعری﴾ ”اور یہ کہ وہی شعری کا رب ہے“ (نجم/۳۹)

یہ ایک روشن ستارہ ہے جو ثابت ستاروں میں سے ہے یہ گرمیوں میں جنوب میں دکھائی دیتا ہے۔ اس کا نجم زمین کے برابر اور وزن سورج کے برابر ہے کتاب مجمع البیان میں ہے قوم خزع ستارہ شعری کی پرستش کرتے تھے لہذا خداوند عالم نے اس کا ذکر کیا ہے، شعری کے نام سے دو ستارے ہیں ایک شعری یمانی اور دوسرا شعری شامی لیکن اس آیت میں مراد شعری یمانی ہے یہ کلمہ قرآن کریم میں صرف ایک ہی بار سورہ نجم کی آیت ۳۹ میں آیا ہے۔

طبری کہتے ہیں شعری ایک ستارہ ہے جسکی دور جاہلیت عرب میں قبیلہ خزع کے لوگ پرستش کرتے تھے چونکہ یہ ستارہ دیگر ستاروں کی نسبت زیادہ درخشاں اور نورانی تھا اس لیے قدیم زمانے میں بہت سے قبائل اسکی پرستش کرتے تھے۔ دو گروہوں نے مقتدا دکنیہ نظر کے تحت اس کی پرستش کی۔ اہل مصر اس ستارے کے طلوع ہونے کو باعث برکت اور فراوانی نعمت سمجھتے تھے اور اپنے مستقبل کیلئے پر امید تصور کرتے تھے لہذا وہ بطور شکرانہ اس کی پرستش کرتے تھے ان کے بالمقابل اہل بابل ستارہ شعری کے طلوع کو خشک سالی و قحط سالی کا سبب خیال کرتے تھے اور اس کے خوف اور ڈر سے اس کی پرستش کرتے تھے۔ اس ستارے کی نورانیت کی وجہ دیگر ستاروں کی نسبت سورج سے زیادہ نزدیک ہونا ہے یہ سورج سے سات آٹھ سال سنہ نوری (نوری سال) کے فاصلے پر واقع ہے جبکہ سورج اور زمین کا درمیانی فاصلہ ۸۰۸ سال سنہ نوری (نوری سال) کا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ اور علم نجوم:

جب اہل بابل اپنے سالانہ میلے میں شرکت کیلئے جا رہے تھے اس دن حضرت ابراہیمؑ نے ستاروں کی طرف دیکھ کر کہا میں مریض ہوں بعض علماء تاریخ اور مفسرین نے کہا ہے اس وقت

شہر بابل میں علم نجوم کو بہت فروغ حاصل تھا وہ اپنی سعادتوں کا حصول اور برائیوں سے بچاؤ کو علم نجوم کے ذریعے حاصل کرتے تھے۔

جب بابل سے ہجرت کر کے منطقہ ۷ ان پہنچے تو وہاں انھیں ستارہ پرستوں کا سامنا ہوا چنانچہ آپ نے ان سے ستارہ پرستی کی رد میں سوالیہ فقرے کے طور پر سوال کیا:

﴿فلمسا جن علیہ الیل را کو کبا﴾ ”جب رات اس پر طاری ہوئی تو اس نے ایک ستارا دیکھا“ (انعام/۷۶)

بحطرح آج کے بعض نام نہاد ماہرین نجوم کا دعویٰ ہے۔ اسی طرح دسترخوان دین و مذہب کے نمک خوار بھی لوگوں کو نیک دن اور شمس دنوں کی نشاندہی کر کے اپنی گزراوقات اسی علم نجوم سے کرتے ہیں یہیں سے ہم نے مناسب سمجھا کہ علم نجوم کی حقیقت اور اسکے بارے میں قرآن و سنت کے نقطہ نظر کو اسی مناسبت سے یہاں بیان کریں آئیے دیکھتے ہیں اسے ہم چند کلمات کے ضمن میں بیان کریں گے:

۱۔ نجوم: نجوم نجم کی جمع ہے کلمہ نجم قرآن کریم میں مفرود کی صورت میں تین بار اور جمع کی صورت میں نو بار تکرار ہوا ہے۔

نجم طلوع و ظہور کو کہتے ہیں یہیں سے کہتے ہیں ”نجم القرن“ یعنی سینگ نکلا ”نجم النبات“ سبزی اُگی۔ اسی مناسبت سے ان ستاروں کو نجوم کہتے ہیں جو لوگوں کے نظروں میں آتا ہے۔

نجم کی جمع نجوم ہے نجم جیسا کہ سورہ نحل میں آیا ہے علامات، ہدایت کیلئے استعمال ہوتا ہے سورہ رطمن / ۶ میں اس نباتات کو کہا گیا ہے جو شجر کے مقابلے میں آئی ہے:

﴿وانحم والشجر یسجدن﴾ ”ستارے یا درخت یا ساق دار و غیر ساق دار اسی کا سجدہ کر رہے ہیں“

کیونکہ وہ بھی زمین سے اُگتی ہے لہذا وہ سبزی جس کی کوئی جز نہ ہوا سے نجم کہتے ہیں اور جس کی جز ہوا سے

شجر کہتے ہیں خداوند عالم نے سورہ نجم سے قسم کھائی ہے:

﴿وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ﴾ ”قسم ہے ستارے کی جب وہ غروب کرے“

سورہ اعراف ۵۴ میں خداوند عالم نے سورج اور چاند ستارے سب اسی ذات کیلئے مسخر کہا ہے:

﴿وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنَّجُومُ مَسْعُورَاتٌ بِأَمْرِہِ﴾ ”اور سورج اور چاند اور ستارے

سب اس کے تابع فرمان ہیں“

کلمہ نجم جمع کی صورت میں نو (۹) بار قرآن میں تکرار ہوا ہے قرآن میں نجم اور نجوم سے مراد وہ ستارے مراد ہیں جو ثابت اور یکجا رہتے ہیں اور جو گردش میں ہیں انھیں کوکب کہتے ہیں۔

کوکب اس ستارے کو کہتے ہیں جو روشن و صاف نظر آتا ہے اسکا نور کسی اور سے ماخوذ نہیں ہے۔ کوکب مادہ کب سے لیا ہے کوکب جمع ہے کوکب کی، جس سے کوئی چیز باہر نہ ہو ریت کے ٹیلے کو کباب کہتے ہیں کوکب کسی ذخیرہ یا جماعت کو کہتے ہیں پانی کی جمع کو کلبہ، گھوڑوں کی جمع کو کبھی کوکب کہتے ہیں۔ لفظ کوکب عبری، سریانی اور آرامیہ سے ماخوذ ہیں کب بمعنی جمع کو کہتے ہیں بعض ستاروں کو ہم نہیں دیکھ سکتے کیونکہ یا تو وہ نور نہیں رکھتے یا انکا نور ہم تک نہیں پہنچتا۔ لیکن یہاں اس سے مراد وہ ستارے ہیں جنہیں خداوند متعال نے اس وسیع فضاء میں تخلیق کیا ہے۔ نجم اور کوکب میں فرق یہ ہے کہ کوکب اپنے نور اور دیگر حوالے سے بزرگ ہے جبکہ ستارہ صرف ظاہر کو کہتے ہیں۔

کوکب کے بارے میں آیات:

﴿كَانَها كوكب دري﴾ ”موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا“ (نور/۳۵) ﴿وَإِذَا لَكَ كَوَاكِبُ

انتشرت﴾ ”اور جب ستارے بکھر جائیں گے“ (الأنفطار/۲) ﴿إِنَّا نُنَزِّلُ السَّمَاءَ الذِّنْبَارِیْنَۃَ

الکواکِبِ﴾ ”ہم نے آسمان دنیا کو تاروں کی زینت سے آراستہ کیا“ (صافات/۶)

ستاروں کے مجموعے کو قرآن کریم میں بروج کہا ہے:

بروج ”برج کی جمع ہے جس کی جمع ابراج ہے اس کے دو مصدر ہے:

۱۔ البر وروا الظہور، عیان کے معنی میں آیا ہے یعنی عورت کا اپنی خویوں اور زینت کے اظہار کو بروج کہتے ہیں۔

۲۔ بروج یعنی پناہ گاہ۔ اس کا جمع بروج ساء۔ بروج کا معنی قلعے یہ محکم پناہ گاہوں کے لیے استعمال ہوتا ہے:

﴿این ماتکونوا یدرککم الموت ولو کنتم فی بروج مشیدۃ﴾ ”تمہیں موت کا خوف ہے“ تم جہاں کہیں بھی ہو خواہ تم مضبوط قلعوں میں بند رہو“ (نساء/۷۸)

تحقیق یہ ہے کہ دونوں کا معنی ایک ہے ظہور جذب کشش کے معنوں میں آیا ہے ہر وہ چیز جو ظاہر اور بلندی پر ہوا سے برج کہتے ہیں یہی سے بلند منزلوں، قصر و کسریٰ کی عمارتوں کو بروج کہتے ہیں۔ وہ شکل و صورت کی حامل زینتوں سے آراستہ عورتیں جو اپنی حسن و جمال کو دوسروں کے لیے ظاہر کرتی ہیں انکے اس عمل کو بروج کہتے ہیں ہر وہ عورت جو اپنی حرکت و سکون سے ناخبروں کی نظر و س کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور ان میں نفوذ و اثر رکھنے اور ان پر حاوی ہونے کا سبب بنتی ہے قرآن نے انکے اس عمل کی مخالفت کی ہے:

﴿وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الحاہلیۃ الاولیٰ﴾

”اور اپنے گھروں میں جم کر بیٹھی رہو اور قدیم جاہلیت کی طرح اپنے آپ کو نمایاں کرتی نہ پھرو“ (احزاب/۳۳)

یہی سے وہ ستارے جو آسمان میں اپنے نور اور روشنائی دیکھتے ہیں اسے بروج کہتے ہیں:

﴿والسماء ذات البروج﴾ ”قسم ہے برجوں والے آسمان کی“ (بروج/۱)

﴿ولقد جعلنا فی السماء بروجا وزیننا للنظرین﴾ ”اور تحقیق ہم نے آسمان میں نمایاں ستارے بنا دیے اور دیکھنے والوں کیلئے انھیں زیبائی بخشی“ (حجر/۱۶)

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے بروج ان ستاروں کو کہتے ہیں جو دیکھنے والوں کے نظر میں ہیں۔

صاحب قاموس قرآن نے ”برج“ کے معنی ظاہر، آشکار اور واضح ہونے کے لئے ہیں۔
یہ کلمہ قرآن میں تین بار استعمال ہوا ہے۔ قرآن میں جہاں بروج آیا ہے اس سے مراد ستارے ہیں
یہ مندرجہ ذیل جگہ پر آیا ہے:

﴿يُنِيرُكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُنِيرًا﴾ ”بابرکت

ہے وہ ذات جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور روشن

چاند بنایا“ (فرقان/ ۶۱) بروج/ ۱، حجر/ ۱۶،

ان آیات سے مراد بروج وہ ستارہ ہے جو آسمان میں ہیں اور اپنی نورانیت کی وجہ سے ان ستاروں
کو بروج کہا گیا ہے یا ان ستاروں کے ذریعے آسمان کو زینت ملی ہے جیسا سورہ حجر آیت ۱۶ سے
واضح ہے:

﴿وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزِينَةً لِلنَّاظِرِينَ﴾ ”اور تحقیق ہم نے آسمان میں

نمایاں ستارے بنادیئے اور دیکھنے والوں کے لئے انھیں زیبائی بخشی“

ستاروں کے مجموعے کو قرآن کریم میں بروج کہا ہے جدید علم فلکیات میں اسے مجرہ کہتے ہیں
، مجرہ اس کائنات کی اکائی ہے جس میں اربوں مجرات ہیں ان مجرات میں سے صرف ایک مجرہ
جو ہماری نظروں میں آتا ہے جسے مجرہ دربہ متانہ کہتے ہیں ہماری مجرے کی اکائی میں سے ایک ہمارا
منظومہ شمس ہے منظومہ شمس کی اکائی میں سے ایک ہماری زمین ہے۔ زمین کی اکائی اس کے
عناصر ہیں عناصر کی اکائی الیکٹران اور پروٹان بھی ان کی ہر ایک کی جائے وقوع ایک دوسرے سے
فاصلے اور آثار و نتائج کے بارے میں تحقیق کرنے کے علم کو قدیم زمانے میں علم نجوم اور جدید دور میں
علم فلکیات کہتے ہیں۔

۲۔ علم نجوم: ستاروں منازل مقامات اور اس سے مرتب ہونے والے آثار و نتائج میں
غور و خاص کرنے کو علم نجوم کہتے ہیں یعنی جو اجرام علوی کو خاص آلات اور وسائل سے کشف کرتے

ہیں، وہ زمین سے کتنے فاصلہ پر ہیں اس ستارے کا حجم کتنا ہے اس میں استعمال ہونے والے آلات کو اسطرلاب کہتے ہیں:

اسطرلاب: آگہ کشف نجوم کو ”اسطرلاب“ کہتے ہیں جس کے معنی ستاروں کا آئینہ ہے بعض نے کہا ہے ”اسطر“ کا معنی تصنیف ہے ”لاب“ حرس حکیم کے بیٹے کا نام ہے جس نے اس آلے کو بنایا ہے بعض نے کہا ہے جب لاب نے کاغذ پر ایک لکیر کھینچی تو حرس حکیم نے پوچھا کہ یہ لکیر کس نے کھینچی ہے جواب ملا کہ لاب نے یہیں سے اس کا نام ”اسطرلاب“ ہوا۔

ستاروں کے ہماری زندگی پر اثرات

۱۔ ستارے آسمان کی زینت ہیں۔ بہت سے ستارے اپنی نورانیت شکل و صورت کے حوالے سے آسمان کو حسین و جمیل بناتے ہیں جسے دیکھ کر انسانوں کے اندر خوشی و راحت محسوس ہوتی ہے اور رات کی وحشت و تاریکی ذہنوں سے نکل جاتی ہے:

﴿انما زيننا السماء الدنيا بزيانة الكواكب﴾ ”ہم نے آسمان کو ستاروں کی زینت سے مزین کیا“ (ملاقات/۷)

۲۔ ہدایت انسان۔ یعنی ان ستاروں سے انسان کو سمت، وقت مہینے اور حسابوں کے لیے ہدایت ملتی ہے چنانچہ سابق زمانے میں صحرا، میدانوں، دریاؤں میں کشتی میں سوار مسافر انہی ستاروں سے رہنمائی لیتے تھے جیسا کہ سورہ مبارکہ انعام آیت نمبر ۹۷ میں آیا ہے:

﴿والشمس والقمر حسب اناء﴾ ”سورج اور چاند کو حساب کا ذریعہ بنایا ہے“ اس سلسلے میں کچھ حقائق یہ ہے۔

ستاروں کے بارے میں خداوند متعال نے فرمایا ہم نے آسمان کو ستاروں سے مزین کیا ہے۔ ستاروں کی ایک تقسیم بندی ہے بعض ستارے ثابت و قائم ہیں یعنی اربوں سال گزر گئے لیکن یہ

دیکھنے والوں کو ایک جگہ پر ہی ملیں گے جیسے کوئی انسان ایک قدیم عمارت میں ایک عرصہ سے رہ رہا ہے اور اس کے چھت کو اپنی جگہ پر ہی دیکھتا ہے:

ستارے

ستاروں کے بارے میں تین حقیقتیں ملاحظہ فرمائیں۔ ایک ستارے ہیں جو صرف ایک جگہ پر ہی قائم رہتے ہیں اسے ہم مکان کے حوالے سے نشانی کے طور پر لیتے ہیں دوسرے وہ ستارے ہیں جو اپنے محور میں گردش کرتے ہیں اور چوبیس گھنٹوں میں اپنے مرکز کی طرف برگشت کرتے ہیں۔ تیسرے وہ دب اصغر ہیں جو ایک سوئی کی طرح آسمان پر نصب ہیں یہ کبھی غروب نہیں ہوتے۔ ان تین حقائق کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں آسمان پر ایک گھڑی جس کے مرکز میں ایک ستارہ ہے اور دوسوئیاں اسکے گرد گردش کر رہی ہیں یہاں سے ہی کہا جاتا ہے ستارے ہماری زمان و مکان دونوں حوالوں سے راہنمائی کرتے ہیں خداوند متعال نے سورہ واقعہ ۶۷ میں انکی قسم کھائی ہے یہ ستارے بشریت کے آغاز زندگی سے ابھی تک قائم ہیں اور بشر اپنے سفر و حضر دونوں میں ان سے استفادہ کر رہے ہیں حتیٰ موجودہ دور میں ایجادات اور ترقی کے باوجود زمان و مکان کے حوالے سے انھیں سے راہنمائی لی جاتی ہے۔

۱۔ نجم قطبی: یعنی نجم وہ ثابت ستارہ ہے جو پورا سال اپنی جگہ پر باقی رہتا ہے۔ یہ انسانوں کی راہنمائی کے لیے ہے۔

۲۔ وہ ستارہ ہے جو قطب میں اپنے دائرے میں گردش میں رہتا ہے ہر چوبیس گھنٹے کے بعد اپنی جگہ پر آتا ہے۔

۳۔ نجم دب اصغر: دب اصغر نامی ستارے آسمانی گھنٹی کے طور پر پہچانا جاتا ہے جو کبھی غروب نہیں ہوتا جس طرح نجم دب اکبر غروب نہیں ہوتا ہے یہاں سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ آسمان

کے اس سفید صفحے پر ایک گھنٹی منسوب ہے جس کا مرکز نجم قطبی ہے اس کی دوسو بیاں ہیں جو گردش میں رہتی ہیں اس طرح ستارے ہمیں بیابان، سمندروں میں اور فضائی سفر اور تاریک رات میں زمان و مکان دونوں کی راہنمائی کرتے ہیں سورہ مبارکہ واقعہ آیت ۷۵ میں ان کی طرف اشارہ کر کے خدا نے قسم کھائی ہے:

﴿فَلَا اقْصَمَ بِمَوْقِعِ النُّجُومِ﴾ ”میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے مقامات کی“

جبکہ بعض ستارے تیزی سے گردش میں ہیں۔ انسان زمان و مکان سے کبھی بھی جدا نہیں ہوا اور نہ ہی ہوگا لہذا انسان زمان و مکان دونوں کے بارے میں محتاج ہدایت و رہبری ہے اور رہے گا لہذا خداوند تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَسَحَّرَ لَكُمْ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مَسْحَرَتٌ بَامْرَأِهِ انْ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ

لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ﴾ ”اور تمہارے لئے رات اور دن، سورج اور چاند کو مسخر کیا ہے اور ستارے بھی

اس کے حکم سے مسخر ہیں عقل سے کام لینے والوں کیلئے ان چیزوں میں یقیناً نشانیاں ہیں“ (

نحل/۱۲) ﴿وَعَلَسَتْ وَبَانَحَمَ هُمْ يَهْتَدُونَ﴾ ”اور علامتیں بھی (بنائیں) اور ستاروں سے بھی

لوگ راستہ معلوم کر لیتے ہیں“ (نحل/۱۶) انعام ۲۷، اعراف ۵۳، ج ۱۸، صافات ۸۸، طور ۳۹، واقعہ

۷۵۔ ان آیات میں چاند سورج کے ساتھ ساتھ ستاروں کو بھی ہماری زندگی میں ہادی و راہنما

بتایا گیا ہے۔

سورہ نحل آیت ۱۲ میں اللہ تبارک تعالیٰ نے چاند سورج ستاروں کو اپنی مخلوق کیلئے مسخر کیا ہے:

﴿وَسَحَّرَ لَكُمْ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مَسْحَرَتٌ بَامْرَأِهِ﴾ ”اور اس نے

تمہارے لئے رات اور دن اور سورج اور چاند کو مسخر کیا ہے اور ستارے بھی اس کے حکم سے مسخر

ہیں، ان میں ہر ایک اپنے کام کی ادائیگی میں مصروف ہے۔ رات چاند سے مناسبت رکھتی ہے

اور دن سورج سے، سورہ قصص ۷۳ کے تحت رات استراحت کیلئے اور دن عمل اور تک و دو کیلئے

بنایا ہے:

﴿وَمِنْ رَحْمَتِهِ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ﴾ ”اور یہ اللہ کی رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لئے رات اور دن کو (یکے بعد دیگرے) بنایا تاکہ تم (رات میں) سکون حاصل کر سکو اور (دن میں) اللہ کا فضل (روزی) تلاش کرو“ دن رات دونوں متعارض و متضاد نہیں ہیں بلکہ مونث و مذکر کی طرح یہ دونوں بھی ایک دوسرے کی جہم کو مکمل تک پہنچاتے ہیں۔

خداوند متعال نے مندرجہ ذیل آیات میں چاند ستاروں کو اپنی مخلوق کہا ہے:

﴿وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ مَسْجُودٌ لِصَاحِبِهِ بِإِذْنِهِ خَلَقَ وَالْأَمْرُ﴾ ”اور سورج اور چاند اور ستارے سب اس کے تابع ہیں آگاہ رہو! آفرینش اسی کی اور امر بھی اسی کا ہے“ (اعراف/ ۵۴) (عدد/ ۱۰۲، ابراہیم/ ۳۳، نمل/ ۲۱، عنکبوت/ ۶۱، لقمان/ ۲۹، فاطر/ ۱۳، زمر/ ۵۴)

جدید علم افلاک میں اسے ”مجروحہ“ کہتے ہیں: ستاروں کے ڈھیر یا جھرمٹ کو علمائے فلکیات مجروحہ کہتے ہیں۔ ایک مجروحہ کی شکل دوسرے مجروحہ سے مختلف ہوتی ہے۔ ہر مجروحہ میں ارب نجوم پر مشتمل ہوتا ہے۔ اب تک کشف ہونے والے مجرات کی تعداد دس ارب مجروں تک پہنچ چکی ہے ہمارے سورج کی نسبت جس مجروحہ سے ہے اسے مجروحہ ”درب و متبانہ“ کہتے ہیں یہ ستارے آسمان پر غیر منظم طریقے سے منتشر نہیں بلکہ ایک دقیق اور باریک نظام کے تابع ہیں اور اللہ تبارک تعالیٰ نے انہیں انسانوں کے لیے مسخر کیا ہے۔

بروج مجموعہ ستاروں کا نام ہے ان کی تعداد بارہ ہے زمین سورج کے گرد گردش کرتی ہوئی ۳۶۵ دن ۶ گھنٹے ۹ منٹ ۱۰ سیکنڈ میں سورج کے گرد گردش کو پورا کرتی ہے اس حوالے سے سورج کے ظاہری طلوع و غروب ہونے کی جگہ ہر مہینے میں بدل جاتی ہے گویا ہر دوسرے مہینے میں نئی مشرق میں طلوع ہوتا ہے اور نئی مغرب میں غروب ہوتا ہے اور اسی حوالے سے مہینے کا حساب کرتے ہیں اس طرح ایک مہینے کا تصور بنتا ہے وہ بارہ برج میں تقسیم ہوتا ہے اور اس طرح بارہ مہینے بنتے ہیں علماء نے کہا

ہے اب تک کشف ہونے والے مجروں کی تعداد سو ۱۰۰ ہے اور ہر بحرے میں سو ۱۰۰ ستارے ہیں جس بحرے میں ہمارا ستارہ سورج آتا ہے اسے ”دربِ مہمانہ“ کہتے ہیں اتنے ستارے جو آسمان میں نظر آتے ہیں وہ بغیر ترتیب کے تقسیم نہیں ہے بلکہ ایک باریک حساب کے تحت تقسیم ہے جو انسان کے فائدے کے لیے چند لحاظ سے مسخر ہیں۔ مجمع البیان میں آیا ہے کہ سورہ مبارکہ نور آیت نمبر ۶۰ میں لکھا ہے جہاں عورت اپنی محاصل کو ظاہر کرتی ہے اسے بروج کہتے ہیں کیونکہ بروج مادہ بروج سے ہے بروج کا اصل معنی ظاہر و بروز کے ہیں بروج حمام یعنی کبوتر کا گوسالہ۔ بروج سماء یعنی جگہ، چاند بڑا ستارہ۔

نخس اور سعادت میں ستاروں کا کردار

نخواست کیا ہے؟

نخس شوم نامبارک بدشگون زحمت و زیان ہوا کے گرد و غبار سے آلود تیز و تند ہوا کو کہتے ہیں۔ راغب اصفہانی نخس کے معنی افق پر نمودار ہونے والے اس سرخ رنگ کو کہتے ہیں جو پیتل کے مانند ہو۔ بغیر دھویں کے آگ کے شعلے کو نخس کہتے ہیں، نخس تانبے کو کہتے ہیں مغرب میں نمودار ہونے والی وہ سرخی جو تانبے کی مانند سرخ ہے۔ نخس سعادت کے خلاف ہے اس کی ضد ہے۔

سورہ قمر آیت ۱۹ میں تند ہوا کو نخس کہا گیا ہے:

﴿انار ملنا علیہم ریحاً مرعفاً یوم نحس مستمر﴾ ”ہم نے ان کے اوپر تیز و تند

آندھی بھیج دی ایک مسلسل نخواست والے دن میں“

﴿یرسل علیکما شواظمن نارو نحاس فلاتنتصرا﴾ ”تمہارے اوپر آگ کا سبز شعلہ اور

دھواں چھوڑ دیا جائے گا تو تم دونوں کسی طرح نہیں روک سکتے ہو“ (طہ/۲۵) ﴿سحرھا

علیہم سبع لیل وثمانیۃ ایام حسوما فتری القوم فیہا صرعی کانہم اعجاز نعل

حسابیہ ﴿اور عا کو انتہائی تیز و تند اندھی سے برباد کر دیا گیا۔ جسے ان کے اوپر سات اور آٹھ دن کے لئے مسلسل مسلط کر دیا تو تم دیکھتے ہو کہ وہ قوم بالکل مردہ پڑی ہوئی تھی جیسے کھوکھلے کھجور کے درخت کے تنے﴾ (حادثہ ۷۶)

نحوست اور سعادت کلمات امیر المومنین کی روشنی میں

نحوست سعادت کی ضد ہے عرب حکماء عرفاء اور دانشمندوں کے ہاں چیزوں کی شناخت کا ایک طریقہ کسی چیز کو اس کی ضد سے پہچاننا ہے۔

سعادت انسان کو خیر تک پہنچاتی ہے سعادت شقاوت کی ضد ہے۔ سعادت اس عمل یا معاونت کو کہتے ہیں جو خیر تک پہنچائے اسی سے پرندے کے پر کو اور انسان کے بازو کو بھی ساعد کہتے ہیں کیونکہ پرانے میں مدد دیتے ہیں۔

سعادت کی شیرینی معلوم نہیں ہوتی جب تک نفس کی کڑواہٹ نہ چکھے (ق ۷۴۲۵)

نفوس آرزو ہیں عقل انکو نحوست سے بچاتی ہے (ق ۲۰۴۸)

جس نے اپنے نفس کا حساب کیا وہ سعادت مند ہو گیا (ق ۷۸۸۷)

جس نے اصلاح کی اپنے نفس کی اور امر کرنے کی کوشش کی وہ سعادت مند ہو گیا (ق ۸۲۴۶)

جس نے اپنے برادران کو مشقت میں ڈالا وہ سعادت مند نہیں ہو سکتا (ق ۹۴۸۵)

اطاعت خدا میں جلدی کرو سعادت مند ہو جاؤ گے (ق ۳۳۶۰)

کوئی شخص سعادت حاصل نہیں کر سکتا بغیر اقامہ حدود الہی کے اور کوئی شخص شقی نہیں ہو سکتا بغیر

حدود الہی کے ضیاع کے (ق ۱۰۸۵۳) علماء کے ساتھ رہو سعادت مند بن جاؤ گے (ق ۴۷۱۷)

اہل فضل کے ساتھ نشست و برخاست کرو سعادت مند بن جاؤ گے (ق ۶۳۱۲)

علم کیساتھ عمل کرو سعادت مند بن جاؤ گے (ق ۶۴۷۹)

دنیا کی سعادتیں نحوست سے قریب ہیں (ق ۹۶۲۳)

اس شخص سے ملو جو تمہارے اور خدا کے درمیان واسطہ ہے تو سعادت مند ہو جاؤ گے (ق ۵۸۳۶)

غور و فکر کرو اپنے اندر بصیرت پیدا کرو وعظ و نصیحت سے عبرت حاصل کرو اپنی آخرت کیلئے زاد حاصل کرو سعادت مند ہو جاؤ گے (ق ۶۵۸۹)

بہترین سعادت دین کی بالادستی ہے (ق ۲۸۶۹)

سعادت کی علامت عمل میں اخلاص ہے (ق ۱۲۳۱)

حق کے ساتھ رہو سعادت مند ہو جاؤ گے (ق ۶۲۸۹)

ایام سعادت اور نحوست

سعادت و نحوست دو ایسے مفہوم ہیں جن سے بشر اپنے ابتدائی دور سے لیکر دور حاضر تک خواہ عالم ہو یا جاہل اچھی طرح واقف و آشنا ہے سب ہی سعادت سے محبت کرتے ہیں اور اس کے حصول کیلئے کوشاں رہتے ہیں لیکن سعادت کیا ہے اور اس کے حصول کے راستے اور ذرائع کیا ہیں؟ نحوست و شقاوت کس چیز کا نام ہے اور اس سے فرار کی راہیں کیا ہیں؟ یہ بات ابھی تک واضح طور سے فیصلہ کن مرحلہ میں نہیں پہنچ سکی اسی طرح تمام مسائل سب کے لئے حل ہو جائیں یہ بات ممکن نظر نہیں آتی۔ بعض لوگ سعادت و شقاوت یا نحوست کو روح سے مربوط کرتے ہیں بعض کے نزدیک شقاوت (نحوست) کا سبب مادہ سے مربوط ہونا ہے بعض افراد سعادت کو صرف مادہ کے حصول اور کھانے پینے اور عیش و نوش کی فروانی کو سمجھتے ہیں بعض سعادت کو حیوانی آزادی میں گردانتے ہیں جبکہ بعض افراد سعادت کو ہزاروں انسانوں کی بدبختی، شقاوت اور محرومیت میں دیکھتے ہیں کہ اگر سب مرجائیں تو انکے لئے سعادت ہوگی۔

ایام میں نحوست و سعادت اور اسکی حقیقت

کائنات میں بالخصوص انسان کی ذہنی، فکری اور جسمانی صلاحیتوں میں تفاوت و اختلاف ناگزیر رہا ہے اکثر روایات اور آیات کثیرہ کے تحت دنیا میں حیات، امتحانی و آزمائشی ہونے کے سبب روزگار کبھی کسی کے حق میں ہے تو کبھی کسی کے، کسی کے یہاں ولادت تو کسی کے یہاں موت، کسی کے یہاں دولت کی فراوانی تو کسی کے یہاں فقر و فاقہ اور غربت۔

غیر خدا پرست لوگ یا ضیعت الایمان اور مادی جھکاؤ رکھنے والے اس اختلاف و دیگر گونی سے دھوکا کھاتے ہیں کیوں کہ اسکی تفسیر و توجیہ میں تواریخ اور جنسیوں میں یا بعض قدیم کتابوں میں موجود تواریخ شخص و سعد کو بعض دنوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے بعض مخلوقات کی آواز اور حرکتوں کو نحوست کا سبب قرار دیتے ہیں اگرچہ کسی کے پاس تاریخ اور انکے دنوں کے نام اور نحوست کے بارے میں تشفی طلب اور باعث اطمینان دلیل و سند موجود نہیں، پھر بھی اکثر بیشتر لوگ، مومنین و مومنین اور غیر مومنین، کبھی ان نحوستوں کے سامنے عاجز و ناتوان نظر آتے ہیں

آیات قرآن اور روایات کی روشنی میں دنوں میں نحوست نہیں ہے۔ نحوست گرداننے کے بارے میں جو فعل و قوع پذیر ہوتا ہے اس کے بارے میں تحقیق کرنی چاہئے اسے کس نے نحس بنایا ہے اس میں نحوست کہاں سے آئی ہے اس نحوست کو پیدا کرنے کے لئے جتنے بھی عوامل ممکن ہو سکتے ہیں ہر ایک کے بارے میں تجزیہ و تحلیل کرنا چاہیے۔

دہرین اور مجنمین ہی نہیں بعض مسلمان حتیٰ بعض لباس روحانی یا مربی دین و مذہب بھی شدت اور انتہائی اہتمام کے ساتھ ایام سنہ کو انسان کے لئے دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں یعنی بعض ایام کو نحس، شوم اور نامبارک گردانتے ہیں اور بعض مخصوص اعمال انجام دینے سے منع کرتے ہیں کہتے ہیں ان دنوں میں اعمال انجام دیں گے تو برے نتائج کا سامنا ہوگا یہ شوم ہوگا۔ بعض ایام کو مبارک اور سعید

گردانتے ہیں لیکن اس کے باوجود بعض مخصوص اعمال کے لئے نامبارک قرار دیتے ہیں آگے جا کر ہم یہ دیکھیں کہ مختلف نقطہ ہائے نظر کے تحت جو ایام محسوس گروانے جاتے ہیں انھیں نکال کر سال کے تین سو وینسٹھ ۳۶۵ دنوں میں سے کتنے دن خالص اور بابرکت باقی رہتے ہیں جہاں تک دہرین کا تعلق ہے قرآن کریم کی سورۃ جاثیہ آیت ۲۴ میں آیا ہے:

﴿وَقَالُوا مَاهِيَ الْآحْيَاتُ الدَّانِيَاتُ مَوْتَ وَنَحْيَا وَمَا يَهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ﴾ ”اور وہ کہتے ہیں: دنیاوی زندگی تو بس یہی ہے (جس میں) ہم مرتے ہیں اور جیتتے ہیں اور ہمیں صرف زمانہ ہی مارتا ہے“ ان کا عقیدہ ہے خدا کچھ نہیں جو بھی بد بختی، شقاوت، اچھائی یا برائی ہے وہ زمانہ کرتا ہے یعنی ان کی اس منطق کے تحت کوئی بھی دن فی ذاتہ اچھا نہیں ہے کیونکہ وہی دن بعض کیلئے اچھا ہوتا ہے اور بعض کے لئے مصیبت کا دن ہوتا ہے دوسرے منجمن علم نجوم کے ذریعہ طلوع اور غروب کے حساب سے بعض ایام کو سعد اور بعض کو خسر قرار دیتے ہیں وہ بھی بعض اوقات پورے دن کو خسر قرار دیتے ہیں اور بعض اوقات صرف کسی شخص کے حوالے سے اس دن کو خسر بتاتے ہیں چنانچہ حضرت امیرؓ سے نہروان کی جنگ کے لئے جاتے وقت ایک منجم نے کہا اس سفر میں ستاروں کے حساب سے آپ کو فتح نہیں ہوگی بلکہ شکست ہوگی لہذا اس وقت اسے ملتوی کر دیں آپؐ نے فرمایا اگر تمہاری بات مان لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا بندہ خدا سے مایوس ہو جائے اور تمہارا احسان مند ہو کہ تم انے اس کو بری گھڑی کا پتہ دیا پھر آپؐ نے فرمایا ”خبردار! اس کی بات نہ مانو۔ خدا کا نام لے کر نکل پڑو۔“

اس وقت ہمارا موضوع گفتگو دہرین کی منطق اور ان کے دعویٰ کی تردید کرنا یا منجمن کے دعویٰ کو رد کرنا نہیں بلکہ ہم یہاں ان وجوہات کو سمجھنے کی کوشش کریں گے جنکے تحت اہل اسلام قرآن و سنت کی پیروی کرنے والے اہل بیت اطہارؑ کی سیرت کو مشعل راہ اور نمونہ قرار دینے والوں نے سال کے دنوں کو محسوس و مبارک میں تقسیم کیا ہے اور ان سے پوچھیں گے کہ اس کی کیا منطق ہے ہو سکتا ہے اپنے اس عمل کی توجیہ میں یہ لوگ قرآن کریم کی درج ذیل آیات کو پیش کریں:

﴿فَارسلنا عليهم ايحا صر صرافى ايام نحسات﴾ ”آخر کار ہم نے ان پر ایک تیز و تند آندھی
 منحوس دنوں میں بھیج دی“ (نصرت/۱۶) ﴿انا ارسلنا عليهم ريحا صر صرافى نحس مستمر﴾ ”ہم
 نے سرد تیز اور وحشت ناک آندھی ایک ایسے منحوس دن ان کی طرف بھیجی جو بہت طویل تھا“ (نمر/۱۹)
 ﴿سحر ماعليهم سبع لبال وثمانية ايام حسوما﴾ ”بنیادوں کو اکھاڑنے والی اس تیز آندھی کو
 سات راتوں اور آٹھ دن مسلسل ان پر مسلط رکھا“ (حاقہ/۷) بظاہر ان آیات کو پیش کرتے ہوئے
 استدال کیا جاسکتا ہے خود قرآن فرماتا ہے سال میں کچھ ایام نحوست ہیں لیکن جب ان آیات کے
 شان نزول پر نظر کریں گے تو معلوم ہوگا یہ آیات قوم عاد پر گزرنے والے عذاب سے متعلق ہیں نہ
 کہ یہ عمومی ہیں۔ ہوا یوں جب قوم عاد نے تکبر و غرور کیا اور حضرت ہودؑ کی نافرمانی کرتے ہوئے
 عذاب خدا کو چیلنج کیا تو خداوند عالم نے ان پر عذاب نازل کیا سورہ حاقہ کی مذکورہ آیت سے پتہ
 چلتا ہے کہ وہ ایام جو قوم عاد کیلئے خمس تھے وہ پورا ہفتہ تھا دوسری بات یہ کہ جب عذاب نازل ہوا تو
 انہیں اس عذاب سے نجات نہیں ملی۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ ان کے لئے عذاب نازل ہونے کے وقت
 سے ایک نہ ختم ہونے والا خمس دن شروع ہوا۔

بعض کا کہنا ہے جو چیزیں زمان تشکیل دیتی ہیں وہ کبھی کبھی انسان کے لئے شقاوت و بدبختی پیدا
 کرتی ہیں چنانچہ بہت سی کتابوں اور جنتریوں میں ہر مہینہ کے کچھ مخصوص ایام اور بعض نے ہفتہ کے
 بعض دنوں کو تمام کام کیلئے یا بعض کام کے لئے باعث شقاوت و نحوست قرار دیا ہے۔

آئیے دیکھتے ہیں انسان کو یہ شقاوت و نحوست کہاں سے لاحق ہوتی ہے؟

عناصر ترکیبی زمان:

زمان کو وجود میں لانے والے عناصر یعنی سورج کی گردش چاند کی گردش یا زمین کی گردش ان سے
 شقاوت و نحوست پیدا ہوتی ہے؟

۱۔ سورج:

عناصر ترکیب زمان میں بنیادی کردار سورج کا ہے کیونکہ زمین پر سورج کی روشنی پڑنے اور نہ پڑنے سے دن رات پیدا ہوتی ہے اس دوران سورج کی دو حرکتیں ہیں ایک حرکت اپنے گرد ہے جو چھبیس دن میں پوری کرتا ہے دوسری حرکت اپنے تمام سیارات سمیت اپنے بھرے کے گرد گردش ہے دو سو میل ایک سیکنڈ کی رفتار سے ہے بعض کے نظر میں یہی شخص ہے۔ سورج کے گرد گھومنے والے سیاروں میں سے ایک سیارہ ہماری زمین ہے زمین کی اپنے محور کے گرد حرکت کے علاوہ اس کی ایک حرکت انتقالی بھی ہے اس حرکت انتقالی میں زمین اپنے مدار میں داخل ہوتے ہوئے بقول ماہرین فلکیات تین سو بیسٹھ ۳۶۵ دن میں سورج کے گرد ایک چکر مکمل کرتی ہے اس پوری ہونے والی گول مسافت میں کتنی ایسی جگہیں ہیں جہاں سے گزرتے ہوئے کسی وقت کسی جگہ کسی چیز سے تصادم مقابلہ یا ٹکراؤ ہوتا ہے یا اس سورج کا سایہ اہل زمین پر پڑتا ہے جسکی بنیاد پر اہل زمین کیلئے نحوست کا سبب بنتا ہو۔ ایسی کوئی بات نہ کسی آیت قرآنی میں ہے نہ کسی روایت میں اور نہ ہی کسی ماہر فلکیات نے بتائی ہے لہذا تمام اہل زمین کے لئے کوئی نحوست نہیں ہے صرف چند گروہ ہی اپنے لئے ایسا سمجھتے ہیں غرض بذات خود سورج میں نحوست نہیں ہے بلکہ آیت قرآنی میں خداوند عالم نے سورج کو ہمارے لئے نعمت کے طور پر بیان فرمایا ہے اللہ نے اسے ہمارے فائدہ کے لئے بنایا ہے نہ کہ نقصان کیلئے

۲۔ چاند:

ساڑھے انتیس ۲۹ دن میں زمین کے گرد چاند ایک چکر پورا کرتا ہے تاریخوں میں جو نحوست بتائی گئی ہے وہ ستاروں کے بروج کے اعتبار سے ہے۔ مثلاً چاند اس وقت اس برج کے دائرے سے گزرے گا تو یہ اچھا نہیں ہے شخص ہے بالخصوص برج عقرب سے گزرنے کو زیادہ خطرناک قرار دیا جاتا ہے حالانکہ چاند کی حرکت ہمارے حساب کے لئے ہے خداوند عالم نے اسے علامت و نشانی

کیلئے بنایا ہے اگرچہ اس کا اس خاص جگہ سے گزرنا طبعی طور پر اہل زمین کے لئے نحوست کا باعث ہوتا تو تمام اہل زمین کے لئے نحوست ہونا چاہیے تھی جبکہ ایک مخصوص گروہ کے علاوہ دنیا کے باقی لوگ اس طرح نہیں سوچتے۔

۳۔ زمین:

زمین اپنے محور پر گردش کرتے ہوئے چوبیس گھنٹوں میں ایک دور پورا کرتی ہے لہذا اگر اس کی اپنی گردش میں نحوست ہے تو اسے گھنٹوں میں ہونا چاہیے نہ کہ دنوں میں یعنی دنِ خمس ہو راتِ خمس نہ ہو یا راتِ خمس ہو دنِ خمس نہ ہو جبکہ کسی نے ایسا نہیں کہا۔

۴۔ خود خدا:

کہتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے خود نحوست پیدا کی ہے اکہیں چند مفروضے ہیں: ایک مفروضہ یہ ہے کہ مسرت اور نحوست کا الگ الگ خدا ہے جبکہ یہ مٹو یہ اور مجوسیوں کا عقیدہ ہے ان کے علاوہ مجبرہ بھی یہ عقیدہ رکھتے ہیں یہ دونوں عقائد کثیر دلائل و براہین سے بالخصوص اہل تشیع کے نزدیک باطل ثابت ہو چکے ہیں بعض روایات اور اہل بیتؑ سے وارد عاؤں کے مطابق خدا بجز خیر کچھ نہیں کرتا شر اس کی ذات سے دور ہے چنانچہ فلاسفہ کہتے ہیں جو منجانب اللہ صادر ہوتا ہے وہ وجود ہے اور جو خیر محض ہے۔

۵۔ انسان:

اگر کوئی انسان خود اپنے لئے یا دوسرے کیلئے باعث نحوست ہے یعنی یہاں اس کا قائل انسان ہے تو یہ نظریہ بھی متعدد وجوہات کی بناء پر باطل ہے مثلاً:

۱۔ کثیر آیات میں انسان کو خدا کا خلیفہ قرار دیا گیا ہے جسے خدا خود خلیفہ ہونے کا شرف بخشے اس میں نحوست کیوں پیدا کرے گا؟

۲۔ سورہ مبارکہ بنی اسرائیل آیت ۷۰ میں ہے کہ خداوند عالم نے انسان کو کرامت و فضیلت بخشی

ہے: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ﴾ ”اور تحقیق ہم نے اولاد آدم کو عزت و تکریم سے نوازا“

۳۔ سورہ عصر و سورہ قین آیت ۶ میں خداوند عالم نے انسان مومن اور عمل صالح کرنے والے کو برائی اور نحوست سے منجھتی کیا ہے:

﴿وَالْعَصْرِ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِي خَسْرٍ۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوٰصَوْا بِالْحَقِّ﴾ ”قسم ہے زمانے کی انسان یقیناً خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال بجالائے اور جو ایک دوسرے کو حق کی تلقین کرتے ہیں“

﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ﴾ ”سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے پس ان کے لئے نے انتہا اجر ہے“

۴۔ خداوند عالم نے فرمایا جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ گمراہ ہوگا نہ شقی ہوگا۔ انسان کی فطرت میں شقاوت نہیں ہے بلکہ اگر کوئی شخص شقی ہے تو اس نے اس شقاوت کو اپنے لئے خود انتخاب کیا ہے۔ نحوست و سعادت دونوں انسان کے فعل کا نام ہے فعل انسان جہاں اپنے لئے مفید و نقصان دہ ہے اسی طرح دوسروں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے جیسے بعض افعال انسان اپنے لئے سعادت سمجھتے ہیں وہی دوسروں کیلئے نحوست ہوتا ہے جیسے جھوٹ، چوری، ڈاکے، رشوت وغیرہ۔ اگر فعل اچھا ہو تو اسے اعمال صالحہ اور حسنہ کہتا ہے اور جو بُرا کام انجام دیتا ہے اسے اعمال سیئہ اور خبیثہ کہتا ہے۔

معاشرہ میں نحوست کو، کون فروغ دیتا ہے؟

معاشرہ میں حاکم جو نحوست پھیلاتے ہیں چنانچہ حضرت امام موسیٰ بن جعفر صادق نے فرمایا:

”تمام برائیوں کی جڑ امام جائز (ظالم) ہے۔“ (میزان القلت جلد اول ۶۰، اقل از کافی جلد اول ۳۷۴)

دعائے شریف ندبہ اور دعا شریف افتتاح کے آخری فقرات بھی اس بات کے گواہ ہیں۔

دین اسلام میں آیات قرآن کی روشنی میں سعادت و نحوست یا شقاوت و دونوں خود انسان سے منسوب

ہے سورہ ہود آیات ۱۰۵ تا ۱۰۸ کے مطابق شقی جہنمی ہے اور سعید جنتی:

﴿فَمَنْهُمْ شَقِيٌّ وَسَعِيدٌ فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا فَيُفْقَىٰ النَّارَ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ خُلَدِينَ فِيهَا مَادَّامَتِ السَّعُوتُ وَالْأَرْضُ الْأَمَاشَاءُ رَبُّكَ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ وَأَمَّا الَّذِينَ سَعِدُوا فَيُفْقَىٰ الْحَنَّةَ خُلَدِينَ فِيهَا مَادَّامَتِ السَّعُوتُ وَالْأَرْضُ الْأَمَاشَاءُ رَبُّكَ عَطَاءٌ غَيْرُ مَحْذُوزٍ﴾ ”پھر ان میں سے کچھ لوگ بد بخت اور کچھ نیک بخت ہوں گے۔ جو بد بخت ہونگے وہ جہنم میں جائیں گے جس میں انھیں چلانا اور دھاڑنا ہوگا۔ وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے جب تک آسمانوں اور زمین کا وجود ہے مگر یہ کہ آپ کا رب (نجات دینا) چاہے بے شک آپ کا رب جو ارادہ کرتا ہے اسے خوب بجالاتا ہے اور جو نیک بخت ہوں گے وہ جنت میں ہوں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمانوں اور زمین کا وجود ہے مگر جو آپ کا رب چاہے وہاں منقطع نہ ہونے والے بخشش ہوگی“ صاحب المیزان نے اس آیت کریمہ کی تفسیر میں سعادت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: ”سعادت وہ ہے جو انسان کو کمال لذت تک پہنچانے میں مدد کرے خواہ یہ روحانی ہو یا جسمانی یعنی خیرات تک پہنچائے“ سورہ طہ آیت ۱۲۳ میں فرمایا جو انبیاء کی ہدایت پر چلتے ہیں وہ شقاوت سے دور رہتے ہیں:

﴿فَمَنْ اتَّبَعَ هِدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْغَىٰ﴾ ”تو جو میری ہدایت کا اتباع کرے گا وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ شقی“ شقاوت دینیوی یہ ہے کہ کوئی زندگی کی سہولتوں سے محروم رہے البتہ شاید یہی محرومی سعادت اخروی کا سبب بنے شقاوت اخروی بندے کا جنت سے محروم ہونا ہے، شاید اس کا سبب یہ ہو کہ وہ دنیا میں غیر محدود سعادت سے لطف اندوز ہوا۔ جبکہ کچھ افراد ایسے ہیں جنکے لیے دنیا و آخرت میں سعادت ہے۔ جیسا کہ امیر المومنین علیؑ نے محمد ابن ابی بکر کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا وہ دنیا و آخرت دونوں میں سعادتوں سے مالا مال ہیں لیکن ایسی سعادت صرف انہیں انسانوں کو میسر آتی ہے جنہیں ایک نظام صالح اور رہبر صالح کے سائے میں زندگی گزارنی نصیب ہو۔

سب سے بڑی نحوست عمل انسان ہے

ان بیانات سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آئی کہ سب سے بڑی نحوست اور شقاوت یہ ہے کہ کوئی شخص اسلام کے بنائے ہوئے اصولوں پر عمل کرنے کے بجائے وہی دنوں کی نحوست سے گریز کرے اور سعید دنوں کے انتظار میں بیکار بیٹھا رہے، سب سے بڑی بدبختی اور شقاوت یہ ہے انسان دنیا و آخرت دونوں کیلئے بے عمل رہے۔

ایام خمس و سعادت

فہرست:

دنیا بھر میں ملحد مشرک مسلمان غرض ہر گروہ کے نزدیک کچھ دن ایام خمس کے نام سے اور کچھ دن سعادت کے نام سے معروف ہیں چنانچہ ہم یہاں آپ کی خدمت میں مہینہ اور ہفتہ میں موجود ایام خمس و سعادت کو قدیم فرسودہ کتابوں اور خمس فروش جنتریوں کی پیش کردہ ایام خمس کی فہرست پیش کرنے سے گریز کرتے ہوئے ایک خلاصہ و نچوڑ پیش کر کے باقی قارئین کی عقل و شعور پر چھوڑتے ہیں۔ ہر مہینے میں خمس مطلق، خمس اکبر، قمر دراقرب، اس کے علاوہ دنوں کے نام جو ایک کام کیلئے اچھا دوسرے کام کیلئے بُرا قرار پانے کے بعد سرکاری اور علاقائی اور دینی تہواروں کو نکالنے کے بعد زندگی کے مسائل کے حل کیلئے کون سا وقت اور کون سا دن باقی رہ جاتا ہے

دنوں میں نحوست نہیں ہے

تفسیر نور الثقلین جلد چہارم صفحہ ۳۸۲ پر سورہ یٰسین کی آیت ۱۸: ﴿قَالُوا اَنَا نَحْشُ وَنَا بَحْمٌ﴾ ”انہوں نے کہا ہم تو تمہیں اپنے لئے قال بد بگھتے ہیں“ کی تفسیر میں کتاب خصال سے حدیث نقل کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے کہ حضرت علیؑ نے اپنے اصحاب کو دین و دنیا سے مربوط چار سو ۴۰۰ مسائل سکھائے جس میں آپؑ نے ان کو تین چیزوں سے گریز کرنے کی خاص طور پر ہدایت فرمائی۔

۱۔ تکبر ۲۔ تطیر (فال بد) ۳۔ تمنا

آپ نے فرمایا: اگر کوئی شخص تم سے کسی کام کے بارے میں تطیر کرے یعنی فال بد ادا کرے تو تم اس کی بالکل پروا مت کرو بلکہ نام خدا لے کر اس کام کو انجام دو۔

اگر کبھی اپنے اندر تکبر محسوس کرو تو اپنے خادم کے ساتھ کھانا کھاؤ اور اپنے گوسفند کا دودھ خود دھو۔
اگر کسی چیز کے بارے میں دل میں تمنا پیدا ہو نفس گناہ پر آمادہ ہو تو سب کچھ چھوڑ کر خدا کی طرف راغب ہو جاؤ۔

کتاب روضہ کافی میں عمر بن حریز نے حضرت امام جعفر صادق سے نقل کیا ہے ”تطیر یعنی فال بد وہ چیز ہے اگر آپ نے اسے آسان اور معمولی سمجھا تو یہ آسان اور معمولی ہو جاتا ہے اگر آپ نے اسے بڑا سمجھا تو یہ بڑا ہوتا ہے اور اگر آپ نے اسے کچھ بھی نہیں سمجھا تو یہ کچھ نہیں ہوتا“ اسی طرح امام صادق سے ایک اور حدیث ہے آپ نے پیغمبرؐ سے نقل کیا کہ تطیر گناہ ہے اس کا کفارہ توکل ہے امام جعفر صادق نے پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے ”اسلام میں نہ دشمنی ہے نہ تطیر ہے اور نہ شوم ہے۔“

امالی سید مرتضیٰ صفحہ ۳۵ میں پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہے آپ نے فرمایا۔ ”زمانے (دھر) کو سب و شتم مت کرو برا بھلا مت کہو کیونکہ دھر خدا ہے“ اس کی تاویل میں علماء نے فرمایا کیونکہ جو برائی یا شقاوت انسان کے لئے پیش آتی ہے اس میں زمانے کا کوئی کردار نہیں ہوتا، اس کائنات میں تصرف خدا کی تدبیر سے ہے۔ ایک اور تفسیر کے تحت علم الہدیٰ فرماتے ہیں ملحدین عرب اپنے اوپر نازل ہونے والے حالات و واقعات مرض عافیت قحط سالی آرام و آسائش کی نسبت زمانے کی طرف دیتے تھے چنانچہ سورہ جاثیہ آیت ۲۲ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَقَالُوا إِنَّمَا هِيَ إِلا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلا الدَّهْرُ وَمَالَهُمْ بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلا يَظُنُّونَ﴾ ”اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ صرف زندگانی دنیا ہے اسی میں مرتے ہیں اور اسی میں جیتے ہیں اور زمانہ ہی ہم کو ہلاک کر دیتا ہے اور انہیں اس بات کا کوئی علم نہیں ہے کہ یہ صرف ان

کے خیالات ہیں اور بس“

چونکہ وہ لوگ خدا کو مانتے تھے اور اچھائی و برائی کو زمانے کی طرف نسبت دیتے تھے خدا انکی رد میں فرماتا ہے زمانہ کچھ نہیں کر سکتا یہ فعل خدا ہے۔

سید رضی علم الہدی مجازات قرآن ص ۲۲۳ میں کنزل اعمال صفحہ ۲۳۵ سے اس حدیث کو نقل کرتے ہیں۔ عربوں پر جب مصیبتیں نازل ہوتیں نعت، صحت، عافیت چھن جاتی، تو ایسے موقع پر وہ زمانے کی ملامت و ثنات کرتے ہوئے کہتے زمانے نے ہم سے انتقام لیا، بدلہ لیا۔

جاہلیت کے اس عقیدے اور منطق کے خلاف خداوند متعال نے فرمایا جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا وہ زمانے نے نہیں کیا دینے والا، کھینچنے والا، تغیر و تبدیل کرنے والا، روکنے والا اور کھولنے والا خدا ہے یہ باتیں جو تم کرتے ہو وہ جہالت پر مبنی ہیں۔

پیغمبرؐ سے مروی ہے: ﴿لَا تَعَادُوا الْيَوْمَ فِتْنَادُ لَكُمْ﴾ ”ذووں سے دشمنی مت کرو تمہارے ساتھ دشمنی ہوگی۔“

مجازات نبوی میں دن کے بارے میں ہے اسے برا بھلا نہ کہو۔ یہ نہ سمجھو یہ برائی اس دن سے مختص ہے کیونکہ دن تو زمین کی گردش سے وجود میں آتا ہے۔

کتاب معانی الاخبار تالیف شیخ صدوق ص ۱۲۳ میں عبد اللہ ابن احمد موصلی نے سقر ابن ابی دلب سے اور انہوں نے امام علی الہادیؑ سے نقل کیا: امامؑ سے دریافت کیا گیا پیغمبرؐ کی یہ حدیث کہ ذووں کے ساتھ دشمنی نہ کرو تمہارے ساتھ دشمنی ہوگی اس حدیث کا کیا مطلب ہے؟ امامؑ نے فرمایا کہ جب تک آسمان و زمین باقی ہیں ذووں سے مراد ہم ہیں، ہفتے سے مراد رسول اللہؐ ہیں۔ اتوار سے امیر المومنینؑ۔ پیر سے حسن و حسینؑ۔ منگل سے امام زین العابدینؑ۔ امام باقرؑ اور جعفر صادقؑ۔ بدھ سے موسیٰ بن جعفر علی ابن موسیٰؑ، محمد ابن علیؑ اور ہم مراد ہیں۔ جمعرات سے حسن و عسکریؑ اور جمعہ سے امام زمانہؑ مراد ہیں۔

لہذا اس حدیث کا مطلب یہ ہے اگر ان سے دنیا میں دشمنی کی تو تمہارے ساتھ آخرت میں دشمنی ہوگی۔

عالم بزرگوار شیخ عباس قمی نے مفتاح الجنان میں اس حدیث کے تحت علی ابن بابویہ سے معصومین سے منسوب ایام میں انکے لئے مخصوص زیارات نقل کی ہیں۔

تاریخ اور دنوں کی نحوست قرآن و سنت کے منافی ہے

۱۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۱، حدیث نمبر ۱۵۰۱۹ میں امام صادق نے پیغمبر سے نقل کیا ہے کہ فال بد مت نکالو۔

حدیث نمبر ۱۵۰۲۰ میں امام جعفر صادق نے فرمایا کہ فال بد یا تطیر ایسی چیز ہے کہ اگر آپ نے اسے بلکا سمجھا تو بلکا ہوگا لیکن اگر سخت سمجھا تو سخت ہوگا اور اگر کچھ نہیں سمجھا تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔

۲۔ حدیث نمبر ۱۵۰۲۱ میں امام جعفر صادق نے پیغمبر سے نقل کیا ہے کہ تطیر گناہ ہے اس کا علاج توکل ہے۔

۳۔ حدیث نمبر ۱۵۰۲۲ میں ہے کسی نے ابوالحسن سے پوچھا کیا بدھ کے دن سفر کرنے والے واپس نہیں آتے؟ امام نے جواب دیا جو یہ کہتے ہیں بدھ کے دن سفر کرنے والے واپس نہیں آتے ہیں ان کی اس رائے اور عقیدے کے برخلاف وہ شخص ہر آفت و بیماری سے محفوظ ہے اور اس کی ہر حاجت روا ہے۔

حدیث نمبر ۱۵۰۲۳ میں پیغمبر سے مروی ہے اگر تم نے فال بد کی تو اس کے برخلاف عمل کرو۔

۴۔ حدیث نمبر ۱۵۰۲۴ میں فرماتے ہیں کہ جب بھی دل میں وسوسہ پیدا ہو جائے فال بد پیدا ہو جائے تو کہو خداوند! جو کچھ میرے دل میں وسوسہ پیدا ہو رہا ہے اس سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

در اصل اس شخص کا زمان سے کوئی تعلق نہیں بلکہ نحوست خود انسان کے عمل میں ہے بعض انسان اپنے لئے ہمیشہ سعادت کو اپناتے ہیں اور بعض دن رات کی کوششوں اور جدوجہد سے شقاوت و بدبختی کو اپنی طرف کھینچتے ہیں ایسے افراد تنہا اپنے لئے شقی نہیں ہوتے بلکہ اکثر اوقات اپنے والدین اولاد اہل محلہ علاقے ملک بلکہ پوری دنیا کے لئے شقی و بدبختی کا سبب بنتے ہیں۔

﴿ما اصاب من مصيبة في الارض ولا في انفسكم الا في كتب من قبل ان نبراهان ذلك على الله يسير﴾ ”یہ کوئی مصیبت دنیا میں آتی ہے نہ تمہاری جانوں میں مگر اس سے پہلے کہ ہم اس کو پیدا کریں وہ اک خاص کتاب میں لکھی ہوئی ہے یہ اللہ تعالیٰ کے لئے آسان ہے“ (حدید ۲۲) محمدین برائیوں کو زمانے کی طرف نسبت دیتے تھے تو پیغمبرؐ نے انکی رد میں سورہ چاشیہ آیت ۲۳ تلاوت کی: ﴿وقالو اما هي الاحياتنا الدنيا نموت ونحيا وما يهلكنا الا الدهر وما لهم بذلك من علم ان هم الا بظنون﴾ ”اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ صرف زندگانی دنیا ہے اسی میں مرتے ہیں اور اسی میں جیتے ہیں اور زمانہ ہی ہم کو ہلاک کر دیتا ہے اور انہیں اس بات کو کوئی علم نہیں کہ یہ صرف انکے خیالات ہیں اور بس“

پیغمبرؐ نے فرمایا: زمانے کو سب و شتم مت کرو خدا خود زمانہ ہے۔

زمانہ کچھ نہیں کرتا جو کچھ اس کائنات میں کرتا ہے وہ یا خدا کرتا ہے یا بندے کا کسب ہے۔

امامی سید مرتضیٰ جلد ۲ صفحہ ۲۰۲ میں ایک حدیث ہے: ”زمانے کو برا نہ کہو خدا خود زمانہ ہے انسان پر پڑنے والی مصیبتیں (زمانہ کی وجہ سے نہیں) اس کی اپنی وجہ سے ہیں۔“

دنوں میں نحوست کہاں سے آئی

قدیم یونانی ستارہ شناسوں کے تحت سورج سال میں بارہ منزل سے گزرتے ہیں اور ہر ایک منزل طے کرنے میں ایک مہینہ لگتا ہے اس منزل میں موجود ستاروں کے اپنے اثرات ہیں جو ایک شخص یا ایک کام کیلئے اچھا ہے دوسرے کیلئے بُرا، اور ہر ایک منزل کیلئے ایک نام وضع کیا ہے جو اس وقت

کے بتوں کے نام سے منسوب ہیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ بروج سے مراد وہ بارہ منزلیں ہیں چنانچہ زیادہ بن منذر ابی الجاروت نے نقل کیا ہے جبکہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ان کے بارے میں کہا یہ جھوٹے کافر ہیں ان پر خدا کی لعنت ہو۔

اس فرسودہ مفروضہ اور نظریے کو بعض علماء اسلام نے بعض غیر معتبر احادیث اور بعض مفسرین نے آیات برج کی تفسیر سے جوڑ کر ان کی اس سعادت و خوش کی تائید کی ہے بعض علماء اور مؤمنین جو زندگی کے تمام شعبوں میں حسی دینی سرگرمیوں میں بھی انکا تعلق تاریخ میلادی سے ربط رکھتے ہیں صرف شادی اور گھر بنانے کیلئے تاریخ قمری میں خمس و قدر اقرب کی ضرورت کیوں پڑتی جبکہ بعض علماء اس عمل کو اپنی دینی فرائض و ذمہ داریوں میں شمار کرتے ہوئے جنتری یا اس سے وابستہ کتابوں کو دیکھ کر خمس و سعادت کی تاریخ مقرر کرتے ہیں۔ سورج کا ان برجوں سے گزرنے میں ایک خطے سے نزدیک اور دوسرے سے دور ہونا ہے۔ اسی تناسب سے موسم، زراعت بھی متاثر ہوتے ہیں۔ یہ ایک سلسلہ محسوس حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں۔ تاہم ان ستاروں سے کسی انسان کیلئے سعادت اور کسی کیلئے نحوست قرار دینے کی کسی بھی حوالے سے کوئی منطق نہیں، جس طرح سردی گرمی اور فصل سب کیلئے ہیں تو پھر یہ ستارے کیسے ایک کے لئے سعادت اور دوسرے کیلئے نحوست بن سکتے ہیں:

۱۔ برج حمل: (۲۱ مارچ تا ۲۱ اپریل) سورج برج حمل میں ۹ مارچ کو داخل ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے ہوا گرم ہو جاتی ہے اس میں حرارت آتی ہے اسکے ساتھ باتات سرسبز ہو جاتے ہیں۔ ۲۱ مارچ فصل ربیع میں داخل ہوتا ہے۔ ۲۳ مارچ سے دن بڑھنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ۴ مارچ کو لیائی عجز کہا جاتا ہے جو تین فروری سے ۴ مارچ تک ہے۔ اس میں ہوائیں تیز چلتی ہیں بارش برسی ہے ان ایام کو حوسم کہتے ہیں۔

۲۔ برج ثور: (۲۲ اپریل تا ۲۰ مئی) سورج برج ثور میں ۸ اپریل کو داخل ہوتا ہے۔ اپریل میں

پھلوں کے تخم پیدا ہوتے ہیں سبزیاں اور نباتات قوی ہوتی ہیں ہوائیں چلتی ہیں چشمے جاری ہوتے ہیں اس مہینے میں بارش پھلوں کیلئے نقصان دہ ہوتی ہے لیکن اسکے برعکس نباتات کیلئے مفید ہوتی ہے۔

۳۔ برج جوزہ: (۲۱ مئی تا ۲۱ جون) سورج برج جوزہ میں ۹ مئی میں داخل ہوتا ہے اس مہینے میں ہوا خوشگوار ہوتی ہے پھلوں میں زردی آنا شروع ہو جاتی ہے اس موسم میں کھانا کم کھانا چاہیے۔

۴۔ برج سرطان: (۲۲ جون تا ۲۳ جولائی) سورج ۹ جون کو اس برج میں داخل ہوتا ہے۔ اس موسم میں پھل پکنا شروع ہوتے ہیں اور اس ماہ کی ۲۱ تاریخ سے گرمی کا موسم شروع ہو جاتا ہے۔ گرمی میں شدت آتی ہے۔ ۳۰ جون سب سے بڑا دن اور سب سے چھوٹی رات ہوتی ہے۔ اس ماہ میں گرم چیزیں کھانے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

۵۔ برج اسد: (۲۴ جولائی تا ۲۳ اگست) سورج ۱۰ جولائی کو اس برج میں داخل ہوتا ہے۔ اس ماہ میں پھل پک جاتے ہیں۔ خون میں حرارت بڑھ جاتی ہے آنکھوں کی بیماریاں پھیلتی ہیں۔

۶۔ برج سنبلہ: (۲۴ اگست تا ۲۳ ستمبر) سورج ۱۱ اگست کو اس برج میں داخل ہوتا ہے۔ اس ماہ میں دن رات برابر ہوتے ہیں۔ اس ماہ میں جسم کے مسام کھل جاتے ہیں ہوائیں چلتی ہیں اور نزلہ زکام کی بیماری عام ہوتی ہے۔

۷۔ برج میزان: (۲۴ ستمبر تا ۲۳ اکتوبر) سورج ۱۰ ستمبر کو اس برج میں داخل ہوتا ہے۔ اس ماہ میں دن رات موسم متعادل ہوتا ہے۔ ۲۱ ستمبر سے موسم خزاں کا آغاز ہوتا ہے۔ درختوں کے پتے زرد ہو کر گرنے لگتے ہیں۔

۸۔ برج عقرب: (۲۴ اکتوبر تا ۲۳ نومبر) سورج ۱۱ اکتوبر کو اس برج میں داخل ہوتا ہے۔ اس ماہ میں حرارت کم ہو جاتی ہے۔ گندم اور جو کی کاشت شروع ہو جاتی ہے۔

۹۔ برج قوس: (۲۴ نومبر تا ۲۳ دسمبر) سورج ۱۱ نومبر کو اس برج میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس ماہ میں

دریاؤں کی موجوں میں حرکت آتی ہے حشرات اور پرندے چھپ جاتے ہیں۔

۱۰۔ برج جدی: (۲۳ دسمبر تا ۲۰ جنوری) سورج ۱۰ دسمبر کو اس برج میں داخل ہوتا ہے۔ اس ماہ میں درختوں کے پتے گر جاتے ہیں اور ۲۱ دسمبر سے شدید سردی کا آغاز ہوتا ہے۔ زلہ وزکام کی بیماری عام ہوتی ہے۔ ۱۰ دسمبر کو سب سے بڑی رات اور سب سے چھوٹا دن ہے۔

۱۱۔ برج دلو: (۲۱ جنوری تا ۱۹ فروری) سورج ۹ جنوری کو اس برج میں داخل ہوتا ہے۔ مختلف قسم کی ہوائیں چلتی ہیں۔

۱۲۔ برج حوت: (۲۰ فروری تا ۲۰ مارچ) سورج سات فروری کو اس برج میں داخل ہوتا ہے دریائی موجوں میں بیجانی آتی ہے اسکے علاوہ پہاڑوں سے برف پگھلنا شروع ہو جاتی ہے۔

عبادتِ نیرین

رب علیم و قدیرِ حئی و ابدی سے خلعتِ خلافت، اعزازِ کرامت حاصل کرنے والے اس انسان نے اپنے معبودِ برحق کو چھوڑ کر اپنے سے پست یا اپنی جیسی مخلوقات کی پرستش شروع کی۔ جن مخلوقات کی انسان نے پرستش کی ان میں سے ایک سورج اور چاند ہے۔ ان دونوں سے وابستہ سیارات کو قدیم و جدید علم نجوم نے منظومہ شمسی کے نام سے یاد کیا ہے اس منظومہ شمسی کے بارے میں قدیم فیزکس میں ارسطو اور بطلمیوس کے نظریات کے تحت منظومہ شمسی سورج کے علاوہ چھ اور ستاروں کو کہا جاتا تھا جو زمین کے گرد گردش کرتے ہیں یہ چاند (Moon)، زہرہ (Venus)، عطارد (Mercury)، مریخ (Mars)، مشتری (Jupiter)، زحل (Saturn) ہیں لیکن اٹھارویں، انیسویں اور بیسویں صدی میں تین اور ستارے کشف ہوئے ہیں ان میں سے ایک اورانوس (Uranus) ہے جو ۱۷۸۱ء میلادی کو بطلمیوس ہرشل (William Herschel) دوسرا ستارہ نتون (Neptune) ہے اس سے پردہ ۱۸۴۶ء کو فرانس کے فلکدان لفریر (Le Verrier) نے اٹھایا۔ تیسرا ستارہ پلوٹو (Pluto) ہے جسے تو مباد

(C. Tombaugh) نے ۱۹۳۰ میں کشف کیا۔ اب ان ستاروں کی تعداد نو ہو گئی ہے یہ سورج کے گرد مختلف انداز میں گھومتے ہیں۔ اس وقت ہمیں ان دو سیارے سورج اور چاند کو معبود بنانے اور اسکی پرستش کرنے کے بارے میں گفتگو کرنی ہے:

قدیم زمانے سے انسانوں نے سورج و چاند کے پرستش شروع کی اور ان کو اپنا معبود قرار دیا وہ اس بات کو بھول گئے کہ خدا ان کا معبود برحق ہے۔ سورہ فصلت آیت ۳۷ میں خداوند عالم نے فرمایا ہے کہ یہ دن رات اور سورج و چاند خدا کی نشانیاں ہیں ان کو سجدہ نہ کرو بلکہ سجدہ خدا کے لئے ہے جس نے سورج و چاند کو خلق کیا وہی سجدہ کا مستحق ہے:

﴿لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ﴾ ”اور سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ اس خدا کو سجدہ کرو جس نے انھیں پیدا کیا ہے“

آئیے پہلے سورج کو دیکھتے ہیں جسے عربی میں ”شمس“ کہتے ہیں:

کلمہ شمس قرآن کریم میں تینیس (۳۳) بار آیا ہے یہ مادہ اشمسہ اور شمسہ سے لیا گیا ہے اس کی جمع شمسوں ہے شمسوں اس حیوان کو کہتے ہیں جو کہیں رکنا نہ ہو یعنی دائم الحركت ہے اس کی جمع الشمس بھی ہے رجل شمسوں جس کی خصلت پائیدار نہ ہو غرض وہ مختلف تغیر و تبدل میں رہے اسے استقرار نہ ہو۔ نافع الشمس بھی اس حیوان کو کہتے ہیں جو اپنے سوار ہونے والے کے تابع نہیں رہتا۔

۱۔ چونکہ سورج بلندی اور حرارت کا حامل ہے لہذا اپنے کے اندر شدت تیزی، بلندی اور غلبہ کی وجہ سے بھی شمس کہلاتا ہے۔

﴿وَسَحَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَانِیْنِ﴾ ”جس نے سورج اور چاند کو تمہارے لئے مسخر کیا کہ لگا تار چلے جا رہے ہیں“ (ابراہیم/۳۳)

خداوند عالم نے قرآن کریم میں سورج کو ضیاء اور چاند کو نور کہا ہے دونوں کے معنی میں فرق ہے سورج کو سراج دوہاج کہا ہے جبکہ چاند کو سراج منیر کہا ہے، سورج کو سراج دوہاج کہنے کا مطلب یہ ہے کہ

یہ نور کے ساتھ اپنے اندر سے حرارت بھی دیتا ہے جبکہ چاند میں یہ صفت نہیں ہے۔

سورج ان ستاروں میں سے ہے جو متوسط ہیں دیگر ستارے جو اپنے آپ روشنی دیتے ہیں وہ اپنے اندر ذرات کی وجہ سے روشنی دیتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ سورج کی روشنی نکل کر ان ستاروں پر پڑتی ہے چاند ایک ایسی روشنائی دیتا ہے جو اپنی سطح پر ہے دوسرے کیلئے نہیں ہے۔

سورج اپنے پورے منظوم شمسی کے اندر موجود تمام سیارات کے ساتھ اپنے مگرے کے گرد حرکت میں ہے وہ اپنے گرد موجود تمام سیاروں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

﴿وَسَحَرَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ كُلٌّ بِحَرِّی لَّا حِلَّی مَسْمُومٌ﴾ ”اور اس نے آفتاب و ماہتاب کو ایک

قانون کا پابند بنایا اس سارے نظام کو ہر چیز ایک وقت مقرر تک کیلئے چل رہی ہے“ (عدہ/۲)

لقمان/۲۹، روم/۸، اہقاف/۳، زمر/۵، فاطر/۱۳

ہمارا مجرہ جو ایک لاکھ ملین ستاروں کا مجموعہ ہے سورج ان کا ایک گھرانہ ہے جس کی مساحت ہماری زمین سے ۱۰۹ گنا زیادہ ہے اور ۲۵۰ برابر حجم زیادہ ہے ۳۳۰ ہزار زمین کے برابر وزن ہے سورج کی دو حرکتیں ہیں ایک حرکت اپنے گرد ہے جو چھبیس دن میں پوری کرتا ہے دوسری حرکت اپنے تمام سیارات سمیت اپنے مگرے کے گرد گردش کرتا ہے جو دو سو میل ایک سیکنڈ کی رفتار میں ہے۔

سورج کی فضا آگ سے بھری ہوئی ہے سورج کے اوپر گرم گیس اور ذرات پائے جاتے ہیں وہاں متوسط درجہ حرارت ۵۰۰۰ ڈگری ہوتا ہے۔

سورج ایک ایسا جرم (جسم) ہے جو فضا میں ہے اور اپنی قدرت ناری کے ساتھ چمک بھی رکھتا ہے یہ روئے زمین کو دن میں اپنے نور سے روشنائی دیتا ہے اور رات کو چاند کے ذریعہ سورج کے نور کو ضیاء اور چاند کے نور میں چونکہ حرارت نہیں ہے اس لئے اسے سراج کہا گیا ہے۔

علماء فلکیات نے سورج کے حجم کو تیرہ کھرب مکعب فٹ زمین سے بڑا بتایا ہے سورج کی اپنے مرکز کے گردش کرنے کے بارے میں سورہ یسین/۳۸ میں آیا ہے:

﴿وَالشَّمْسُ تَحْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَهَا﴾ ”اور سورج اپنے مقررہ ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے“ اس کی حرارت خط استواء پر بہت شدید ہوتی ہے اور وہاں سے فاصلہ کم ہوتے ہوئے یہاں تک کہ قطب شمالی اور جنوبی تک پہنچتے ہوئے نکتہ انجماد ہو جاتا ہے جہاں سے برفانی علاقہ شروع ہوتا ہے۔
 ﴿سُورَةُ يُونُسُ آيَةُ ۵﴾

﴿هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسُ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا﴾ ”وہی ہے جس نے سورج کو روشن کیا اور چاند کو چمک دی“

سورج ہر چیز کو نور اور توانائی فراہم کرتا ہے۔ پانی کو بخارات میں تبدیل کرتا ہے تاکہ بارش برساے جس سے تمام حیوانات اور نباتات سیراب ہو سکیں۔ سورج اپنے گرد گردش کرنے والے ستاروں کی ماں ہے زمین کا اپنے محور کے گرد گردش کرنے سے دن بنتا ہے۔

مندرجہ بالا آیت کے تحت سورج اور چاند دونوں ہمیں نور دیتے ہیں۔ لیکن ان دونوں میں ایک فرق ہے سورج جو نور دیتا ہے اسے ضیاء کہتے ہیں اور چاند کے نور کو روشنائی کہتے ہیں۔ چاند کا نور اس کا ذاتی نہیں ہے بلکہ یہ سورج کا مرہون منت ہے:

﴿هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسُ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا﴾

”اسی خدا نے آفتاب کو روشنی اور چاند کو نور بنایا ہے“ (یونس/ ۵)

سورج اور اسکی حرارت

جہاں پوری کائنات اس عظیم مخلوق کے نور سے استفادہ کر رہی ہے۔ وہاں اس کے اور بھی فوائد و ثمرات ہیں جس نے عقول کو مبہوت کیا ہے۔ اس مخلوق کی ایک نعمت اسکی تپش و حرارت ہے۔ سورج ہمیں ہر لمحہ جو توانائی اور حرارت فراہم کر رہا ہے اسے اعداد و شمار کے حساب میں لانا ناممکن ہے لہذا علماء فلکیات اسے ایک مثال سے ہمارے سمجھنے کے لئے بیان کرتے ہیں کہ اگر پوری زمین کے برابر کوئلہ کا ایک ذخیرہ موجود ہو اور اسے ہم زمین کو حرارت فراہم کرنے کیلئے جلا لیں تو وہ ۳۶ گھنٹے سے

زیادہ حرارت نہیں دے سکتے جبکہ سورج ہر سیکنڈ میں زمین کے ایک مربع سینٹی میٹر کو ۲۲ ارب انرجی دے رہا ہے ماہرین فلکیات کے مطابق سورج کے اوپر حرارت ۶ ہزار سینٹی گریڈ ہے۔ سورج سے جو حرارت انسان حاصل کر رہے ہیں اگر اسے رائج بجلی کی لاگت سے موازنہ کیا جائے تو ہر گھنٹہ کی قیمت ۷۱ ہزار ملین ڈالر بنے گی۔ اسی طرح اگر ہم سورج کی روشنی سے مستغنی ہونا چاہیں اور اسے مصنوعی طریقے سے پورا کرنا چاہیں تو ہمیں زمین پر بسنے والے انسانوں کیلئے دس ملین ۱۰۰ اوٹ کے لیپ روشن کریں تو یہ سورج کی روشنی کے برابر ہوگا۔

خداوند متعال نے سورج کی افادیت میں نور اور حرارت دونوں کو قرار دیا ہے۔ فرمایا ہم نے اسے سراج اور وضاح قرار دیا یعنی ایسا چراغ ہے جس میں نور اور حرارت دونوں موجود ہیں۔ اگر خدا کا یہ آسمانی چراغ اپنا کام چھوڑ دے تو کرہ زمین کو ایک خوفناک تاریکی اور سردی اپنی لپیٹ میں لے گی اگر سورج نہ ہوتا تو کرہ زمین پر زندگی کا وجود نہ ہوتا۔ لہذا خداوند متعال نے اسے اپنی واضح و آشکار نشانی کے طور پر متعارف کروایا ہے۔

۱۔ حرکت: اللہ تبارک و تعالیٰ نے منظومہ شمس میں موجود تمام ستاروں کو مستقل یا کسی دوسرے ستارے سے مربوط حرکت میں رکھا ہے ہر ستارے کی حرکت سے جونتاج اور فوائد برآمد ہوتے ہیں ان میں سورج کا اپنا حصہ ہے۔

۲۔ سورج کے زمین سے قُرب و بُعد کی وجہ سے چار فصلیں پیدا ہوتی ہیں اور تمام سبزی جات اور پھلوں کی پکائی کا دار و مدار بھی اسی پر ہوتا ہے۔

۳۔ جب سورج ہمارے سر کے اوپر سے دور ہو جاتا ہے تو ہوا میں برودت آ جاتی ہے، زمین پر سردی چھا جاتی ہے اس وقت زمین کے اندر حرارت قوی ہو جاتی ہے اس میں ہلکا سا بخار پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے زمین میں موجود دانے شکافتہ ہو جاتے ہیں اور جب سورج پلٹ کر ہمارے سروں کے اوپر آ جاتا ہے تو سردی ختم ہو جاتی ہے اور ہوا معتدل ہو جاتی ہے تو وہ چیزیں زمین سے

باہر نکل آتی ہیں جب ہوا گرم ہوگی تو یہ سورج کے اثر سے ہوگی اور اس سے فصلیں پک جائیں گی اس طریقے سے زراعت اپنے کمال تک پہنچتی ہے اور پھل دینے کا دور آ جاتا ہے زمین کی روزانہ حرکت کی وجہ سے نباتات پر سورج کا اثر محسوس ہوتا ہے زراعت وہیں ہوتی ہے اور نباتات وہیں پراگتی ہیں جہاں سورج کی روشنی یا اُس کی حرارت پہنچتی ہو۔

۴۔ بعض سبزی جات اور پھل ایک ملک میں پیدا ہوتے ہیں لیکن دوسرے بہت سے ملکوں میں پیدا نہیں ہوتے۔ اس کا سبب گرمی اور سردی میں فرق ہے اور گرمی اور سردی کا فرق سورج کی حرکت سے مربوط ہے مثلاً کھجور گرم علاقوں میں پیدا ہوتی ہے لیکن سرد علاقوں میں نہیں ہوتی اسی طرح لیموں اور کیلا بھی سرد علاقوں میں نہیں ہوتا بالکل اسی طرح بعض حیوانات ایک علاقے یا ایک ملک میں ہوتے ہیں لیکن دوسرے علاقوں میں نہیں ہوتے جیسے ہاتھی اور شیر ہندوستان میں پیدا ہوتے ہیں لیکن جن ملکوں میں ہندوستان کی نسبت کم حرارت ہو وہاں یہ ناپید ہیں۔

سورج کے دیگر فوائد

سورج کے روشنی اور حرارت کے علاوہ اور بھی فوائد ہیں جنکا شمار زندگی کی اولین ضروریات میں ہوتا ہے جبکہ بغیر ہم چند منٹ تک زندہ نہیں رہ سکتے۔ وہ پانی اور آکسیجن ہے سورج کی گرمی سے دریاؤں اور سمندروں سے بخارات اوپر اٹھتے ہیں اور بارش کا باعث بنتے ہیں اور ان سے چشمے اور نہریں جاری ہوتی ہیں زمین سرسبز و شاداب ہوتی ہے:

﴿وَالْقَمَرَ قَدَرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ﴾

”اور چاند، اس کیلئے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ اُن سے گزرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کے مانند رہ جاتا ہے“ (نہین/ ۳۹)

۶۔ سورج کی رفتار چاند سے زیادہ ہے:

﴿لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ﴾ ”نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو جا

پکڑے“ (یسین/۴۰)

سورج زمانے کی ماں ہے

سورج، زمین اور چاند تینوں مل کر زمانہ پیدا کرتے ہیں، ان میں سے ہر ایک زمان کی تخلیق میں جداگانہ کردار رکھتا ہے لیکن زمین اور اس کا فرزند دونوں سورج کے تابع ہیں اس سے یہ دونوں زندہ ہیں ان دونوں کے ثمرات کی برگشت اسی کی طرف ہے اس حوالے سے اسے زمانے کی ماں کہنے میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی ہے۔ زمین کے اپنے مدار کے گرد گردش کرنے سے دن رات پیدا ہوتے ہیں اور چاند کے زمین کے گرد گردش سے مہینے پیدا ہوتے ہیں ان دونوں کے ملکر سورج کے گرد گردش سے سال بنتا ہے لہذا ہمیں ان تینوں کے بارے میں جداگانہ بحث کرنے کی ضرورت ہے۔

زمین

زمین جسے قرآن میں ”ارض“ کہا ہے یہ کچھ چار سو اسی (۴۶۱) بار مفرد کی صورت میں آیا ہے لیکن کلمہ ”ارض“ ہمیشہ ہر چیز کے نیچے کیلئے استعمال ہو ہے یہ ہمیشہ قرآن کریم میں آسمان کے مقابل میں بیان ہوا ہے اس کیلئے دو اور الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں:

۱۔ ثری: ثریٰ نم دار مٹی کو کہتے ہیں چونکہ زمین میں یہی قابل کاشت زراعت ہوتی ہے:

﴿لَهُ مَافِ السَّمٰوٰتِ وَمَافِ الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَافِ الثَّرٰى﴾

”جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ ان کے درمیان اور جو کچھ زمین کی تہہ میں ہے سب کا وہی مالک ہے“ (ط/۶) اسی مناسبت سے مال کو ثروت کہتے ہیں۔

۲۔ غمری: غمری اٹھتے اور بیٹھتے وقت اڑنے والی دھول یعنی غبار کے معنوں میں آتا ہے اور غبار کو گرد اس لئے کہتے ہیں کہ زمین کو ذرات کی صورت میں منتشر کرتا ہے:

﴿وَوَجَّهَ يَوْمَئِذٍ وَجْهَهَا غَمَرًا﴾ ”اور کچھ چہرے اس روز خاک آلود ہوں گے“ (عبس/۴۰) اسی

مناسبت سے بچنے والے یا پیچھے رہ جانے والوں کو غابر کہتے ہیں:

﴿فَاتَّخِذْنِي وَاَهْلِي الْاِمْرَاةَ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ﴾ ”چنانچہ ہم نے لوط اور ان کے گھر والوں کو نجات

دی سوائے ان کی بیوی کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی“ (اعراف/۸۳)

زمین کی بہت سی خصوصیات ہیں ان میں سے ایک خصوصیت اسکا بے شمار خزان کا حامل ہونا ہے، اسی طرح زمین ہمارے اعمال کو ریکارڈ بھی کرتی ہے:

﴿يَوْمَ يُعْذِرُ حُثُثُ اَعْيَارِهِمْ﴾ ”اس دن وہ اپنے حالات بیان کرے گی“ (زلزلہ/۴)

ہم فرزند ان زمین کیلئے سورج اور چاند کی کیا کیا خدمات ہیں اور ہماری زندگی پر ان دونوں کی

کیا اثرات ہیں:

علمِ حقیقت قدیم میں زمین کو ثابت و جامد اور سورج و چاند کو زمین کے گرد گردش کرنے کا تصور تھا جبکہ

دو ہر جدید میں زمین کو سورج کے گرد گردش کرنے والے قرار دیا ہے لیکن قرآن کریم نے پندرہ سو

(۱۵۰۰) سال پہلے سورج اور زمین دونوں کی گردش کی طرف خبر دی ہے جیسا کہ سورہ یٰسین ۳۸ تا

۴۰ میں فرمایا ہے کہ یہ دونوں گردش میں ہیں:

﴿وَالشَّمْسُ تَحْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَهَا، وَالْقَمَرُ قَدَرُهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ۔ لَا الشَّمْسُ

يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ﴾ ”اور سورج اپنے مقررہ ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے، اور چاند، اس

کیلئے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ اُن سے گزرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کے

ماندرہ جاتا ہے، نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے“

زمین اپنے مدار میں چوبیس گھنٹے میں ایک چکر پورا کرتی ہے اس سے شب و روز وجود میں آتے ہیں

زمین کی گردش کے وقت اس کا ایک حصہ سورج کی طرف ہوتا ہے۔ جہاں دن ہوتا ہے اور دوسرا رخ

سورج کے مخالف میں ہوتا ہے جہاں رات ہوتی ہے۔

زمین نظامِ شمسی میں سورج کے گرد گردش کرنے والا وہ سیارہ ہے جسے تمام سیارات پر فخر و امتیاز

حاصل ہے کیونکہ یہ اشرف المخلوقات یعنی انسان کی ماں ہے۔ زمین کبھی تو انسان کو اپنے دامن میں پالتی ہے اور کبھی اسے اپنے پیٹ میں تحفظ دیتی ہے۔ یہ وہ صفت ہے جس سے دوسرے تمام سیارے اس سے محروم ہیں یہ زمین ہی ہے جسے سورج جیسا چراغ حاصل ہے۔ کہنے کو تو بہت سے لوگ اس زمین کے مالک اور بادشاہ بنے ہوئے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے تمام انسان زمین کی اولاد ہیں ان میں سے بعض تو اولاد صالح ہیں اور بعض ناخلف۔ لیکن زمین کا مالک کہلانے والوں کو جلد ہی زمین نے اپنے اندر ہضم کر لیا یہ زمین وہ سیارہ ہے جس کی فضا زندگی سے بھرپور اور فرصت بخش و خوشگوار ہوا سے پر ہے، اس کے اندر قیمتی مال و دولت اور بے بہا خزانے پوشیدہ ہیں یہ زمین سورج سے ایک سو انچاس بلین پانچ لاکھ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

زمین پر ہر جگہ سورج کی حرارت ایک جیسی نہیں ہوتی۔ خط استواء پر اسکی حرارت اپنی انتہا پر ہوتی ہے جبکہ اس وقت قطب شمالی و جنوبی میں اسکی حرارت گر جاتی ہے برف جم جاتی ہے۔ زمین کے محیط پر سورج کا نور جھکا ہوتا ہے۔ جب وہ خط استواء پر ہوتا ہے تو اس کا نور عمودی و مستوی شکل میں نیچے آتا ہے وہاں اسکی حرارت انتہائی عروج پر ہوتی ہے۔ اس وقت قطب شمالی و جنوبی اور خط استواء کے درمیان حرارت مختلف ہوتی ہے۔ اس حرارت میں کمی پیشی کا دار و مدار خط استواء یا قطب سے قربت کی مناسبت پر ہوتا ہے۔ اس حوالے سے حیات انسانی و حیوانی اور نباتاتی تینوں کے لیے مناسب ہوا ہر جگہ مختلف ہوتی ہے۔ ہر فصل حرارت کی مناسبت سے مناسب پھل دیتی ہے۔ یہاں دن رات کے لمبا اور کوتاہ ہونے کو بھی مد نظر رکھا جاتا ہے۔

زمین کی شکل کروی ہے:

اس دور میں زمین کی شکل کا کروی ہونا بدیحات میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے لئے دلیل و برہان قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ زمین کی حرکت دو قسم کی ہے۔

۱۔ زمین کی اپنے گرد حرکت

۲۔ زمین کی سورج کے گرد حرکت

زمین چوبیس گھنٹوں میں اپنے گرد حرکت کا ایک دورانیہ مکمل کرتی ہے۔ اسے یوم ارضی کہتے ہیں۔ اس حرکت میں زمین ایک ہزار چھ سو چوبیس کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے خط استواء پر چلتی ہے۔ زمین کی اپنے گرد چوبیس گھنٹوں کی حرکت سے دن رات پیدا ہوتے ہیں جیسے: نباء ۱۰، ۱۱، یونس ۶۷ اور فرقان ۴۷۔ زمین کی اپنے گرد گردش سے دن رات کا پیدا ہونا اس بات کی دلیل ہے زمین کی شکل گروی ہے۔ سورہ زمر ۵، اعراف ۵۴، فرقان ۴۵ میں زمین کے گروی (گول) ہونے کا ذکر ہے:

﴿خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ يَكُونُ اللَّيْلُ عَلَى النَّهَارِ وَيَكُونُ النَّهَارُ عَلَى اللَّيْلِ﴾ ”اسی نے

آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے وہی رات دن پر لپیٹتا ہے اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے“ معرفت وقت: روائے زمین پر وقت معلوم کرنے کی خاطر طولی خط کو تین سو ساٹھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ خط ایک قطب سے دوسرے قطب تک کھینچا گیا ہے۔

زمین کی سورج کے گرد گردش

اس حرکت کو حرکت انتقالی کہتے ہیں۔ اس حرکت میں زمین نو سو چالیس ملین کلومیٹر کا فاصلہ 365.14 دن میں مکمل کرتی ہے۔ اس حرکت میں زمین جس مدار میں حرکت کرتی ہے وہ انڈے کی شکل میں ہوتا ہے۔ سورج کے گرد گردش کرتے وقت زمین کی رفتار متغیر ہوتی ہے یہ گہرائیوں میں تیز اور اونچائیوں پر آہستہ چلتی ہے۔ زمین اپنے مدار میں مغرب سے مشرق کی طرف چلتی ہے۔

زمین کی دوسری حرکت زمین کا سورج کے گرد ایک چکر پورا کرنا جس میں بارہ مہینے لگتے ہیں اسی طرح زمین بارہ مہینوں کی گردش اپنی جگہ چار حصوں (موسموں) میں تقسیم ہوتی ہے خریف، شتا، رجب، سیف۔ ہر فصل کیلئے آسمان میں اپنا ایک ستارہ ہوتا ہے اور ہر ایک نقطے پر ایک برج فلکی ہوتا ہے۔

قمر:

کسی چیز میں موجود سفیدی کو قمر کہتے ہیں چاند میں موجود سفیدی کی وجہ سے ہی اسے قمر کہا جاتا ہے جیسے حمار القمر یعنی سفید گدھ یا قمر تہ چاند رات کو آیا۔ لفظ قمار بھی اسی مادے سے ہی ماخوذ ہے قمار یعنی جو اکیلے والا۔ یہاں ایک لطیف بات ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بھی جو اکیلے ایک قبیح عمل سمجھا جاتا تھا اسی لئے وہ چاند رات میں جو اکیلے تھے۔

چاند ہم سے ۳ لاکھ چوراسی ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر ہے:

چاند کے فوائد:

۱۔ مدوجزر: اس سے کبھی تو دریاؤں میں رجحان آتا ہے اور کبھی دریاؤں کا پانی گر جاتا ہے دریا کبھی ایک حالت پر نہیں رہتا یہ سب چاند کی روشنائی میں کمی بیشی سے ہی ہوتا ہے۔

۲۔ حیوانات کے جسم: حیوانات کے جسموں کا چاند کی روشنائی میں کمی بیشی سے گہرا ربط ہوتا ہے جب چاند کی روشنائی بڑھ جاتی ہے تو حیوانات کے بدن قوی اور گرم ہو جاتے ہیں اور روشنائی کم ہونے سے اُن کے بدن ٹھنڈے اور ضعیف و ناتواں ہو جاتے ہیں جب چاند کی روشنائی بڑھتی ہے تو انکے بدن کی ظاہری رطوبت بڑھ جاتی ہے، اُس کا حُسن زیادہ ہو جاتا ہے اور جب چاند کی روشنائی کم ہو جاتی ہے تو رطوبت بدن کے اندر چلے جانے سے حُسن ماند پڑ جاتا ہے۔

چاند کی روشنائی بڑھنے سے زیادہ بال اُگتے ہیں اور تیزی سے بڑھنے لگتے ہیں اور چاند کی روشنائی کم ہونے سے بال اُگنے میں کمی آ جاتی ہے۔

مینے کی اول سے آخر تک جب چاند کا نور اور روشنائی بڑھ رہی ہوتی ہے تو حیوان زیادہ دودھ دیتے ہیں اسی طرح جب چاند کی روشنائی کم ہو رہی ہو تو اُن کے دودھ میں کمی آنے کے ساتھ انکے بند بھی ست پڑ جاتے ہیں۔

۳۔ چاند سورج کا تابع ہے:

﴿وَالشَّمْسُ وَضُحَاهَا وَالْقَمَرُ إِذَا تَلَّهَا﴾ ”سورج اور اس کی دھوپ کی قسم، اور چاند کی قسم جب وہ اس کے پیچھے آتا ہے“ (ش/۲۱)

مہینوں کا تعین چاند کی گردش سے ہوتا ہے

﴿إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ﴾ ”کتاب خدا میں مہینوں کی تعداد اللہ کے نزدیک یقیناً بارہ مہینے ہے“ (توبہ/۳۶)

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْهَلَقَةِ الَّتِي هِيَ مُوَاقِفَتُ النَّاسِ وَالْحَجِّ﴾

”لوگ آپ سے چاند کے (گھٹنے بڑھتے کے) بارے میں پوچھتے ہیں کہہ دیجئے: یہ لوگوں کے لئے اور حج کے اوقات کے تعین کا ذریعہ ہیں“ (بقرہ/۱۸۹) ہمیں معلوم ہے اس کائنات میں زمین ہے، چاند، سورج اور ستارے ہیں۔ چونکہ یہ چیزیں ہمارے مشاہدے میں آتی ہیں اس لئے ہم کہتے ہیں یہ سب کائنات کا حصہ ہیں لیکن ان کے علاوہ بے شمار بحرے اور ستارے اور بھی موجود ہیں، لہذا کائنات میں تنہا یہ ہی ایک سورج نہیں جو ہمیں دکھائی دیتا ہے بلکہ کئی سورج ہیں جو دور ہونے کی وجہ سے ہمیں دکھائی نہیں دیتے۔ غرض اگر ہم اسی سورج کا مشاہدہ کریں جو ہمیں دکھائی دے رہا ہے تو حیران کن صورت حال سامنے آتی ہے۔ بجلی کے ایک بلب کو روشن کرنے کیلئے جزیئر یا بجلی گھر اور تاروں اور کئی قسم کے اسباب و درکار ہوتے ہیں اور اس مشینری کو چلانے اسے نصب کرنے کیلئے ہزاروں لوگ حرکت میں ہوتے ہیں تب جا کر کہیں یہ چھوٹا سا قلمہ روشن ہوتا ہے لیکن سورج کے اس نور کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے ضیاء کہا ہے ضیاء اس نور کو کہتے ہیں جس میں نور کے ساتھ حرارت بھی ہو کیونکہ چاند میں نور تو ہے لیکن حرارت نہیں یہی وجہ ہے آپ چاند کی روشنی میں بیٹھتے ہیں تو سائے کے محتاج نہیں لیکن سورج کی روشنی میں سائے کے محتاج ہوتے ہیں چاند و سورج وہ ستارے ہیں جو ہمارے لئے وقت کے ناپ تول کا ذریعہ ہیں زمانے کے مختلف حالات اور مختلف شکلیں ہیں لہذا اس

کی پیمائش کیلئے مختلف موازین درکار ہیں ہمارے پاس ایک زمانہ دن رات ہے، صبح صادق و صبح کاذب ہے ظہر و عصر ہے اور اسی طرح عشاء و مغرب ہے یہ تمام اوقات سورج سے متعلق ہیں۔

مہینوں کے حساب کیلئے سورج کو اگر معیار قرار دیا جائے تو یہ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ یہ مہینے کی ابتداء ہے یا وسط و انتہا ہے جبکہ اگر چاند کو معیار بنائیں تو یہ اشکال نہیں آتا اگر چاند ہلال کی صورت میں ہو تو اس کا مطلب ہے مہینہ کی ابتداء ہے اگر بدر کی صورت میں ہو تو مہینہ کا وسط ہے اور اسکے غروب ہونے سے پتہ چلتا ہے یہ مہینہ کا آخری حصہ ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلق کرنے سے پہلے اس کائنات کو آراستہ کیا ہے دنیا میں زمانے کے حساب کیلئے دقیق ترین ذریعہ قمری ہے دریا و خشکی دونوں کی مخلوق چاند سے مربوط ہے سورج کی نسبت چاند کے حساب سے جو سال بنتا ہے وہ گیارہ دن آٹھ گھنٹے کم ہوتا ہے اور ہر سال اس فرق کے نتیجے میں ہر ۳۳ سال بعد رمضان المبارک اپنی پہلی گردش پر آ جاتا ہے۔ قمری طریقہ سے روئے زمین پر بسنے والے مسلمانوں کیلئے حج کا مناسب موسم پیدا ہوتا ہے اسی طرح سورج روزانہ طلوع ہوتا ہے تو خداوند عالم نے نماز کو سورج سے مربوط کیا ہے اور اس وجہ سے ہم چوبیس گھنٹوں میں نماز کے اوقات کا تعین کر سکتے ہیں جبکہ چاند سے نماز کے اوقات کا تعین نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ایام حاق میں چاند کو نہیں دیکھ سکتے۔ اس لئے اگر نماز کو چاند سے مربوط کیا جاتا تو بہت سی نمازیں چھوٹ جاتیں کیونکہ پورے ماہ میں چاند پر فرق پڑتا ہے جبکہ سورج کے طلوع ہونے سے دن کا آغاز ہوتا ہے اور اسے دیکھنے کیلئے کسی مشقت و باریک بینی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ نماز ارکان دین میں سے ہے جو کبھی ساقط نہیں ہو سکتی۔ اس لئے خداوند متعال نے اسے سورج سے مربوط کیا ہے اس طرح پوری کائنات میں ہر لمحہ خدا کی عبادت کی جاتی ہے۔

چاند کے مہینوں میں فرق:

چاند زمین کے گرد گردش میں سورج کے مقابل میں انتیس (۲۹) دن بارہ (۱۲) گھنٹے چوتالیس

(۴۴) منٹ لیتا ہے چونکہ یہ حساب اتنی دقیق صورت میں ہے کہ ہر شخص کیلئے میسر نہیں کہ وہ مہینے کی ابتداء اور انتہا کو معلوم کریں تو اہل تقویم نے ایک مہینہ انتیس (۲۹) دن اور ایک مہینہ تیس (۳۰) دن کا قرار دیا ہے۔

چاند کے مہینے کبھی ۲۹ اور کبھی ۳۰ دن کے ہوتے ہیں تین مہینے متصل ۲۹ دن کے بھی ہوتے ہیں چاند جب نکلتا ہے تو دھاگے کی مانند ہوتا ہے پھر بڑھ کر افق پر نمودار ہوتا ہے ہر دن چالیس سے پچاس منٹ دیر سے نکلتا ہے یہاں تک کہ ۱۵ تاریخ کو مکمل ہوتا ہے شرق سے نکلتا ہے اور یہ سورج کے غروب ہونے کے موقع پر پیدا ہوتا ہے پھر ہر دن دیر سے طلوع ہوتا ہے اور کم ہوتا جاتا ہے مہینے کی آخر میں پھر دھاگے کی مانند ہو جاتا ہے۔

پھر ایک یا دو دن نظروں سے غائب ہو جاتا ہے اس کے ظہور میں کم یا زیادہ ہونے اور غائب ہونے سے چاند کے مہینے کے اول و آخر دنوں کا پتہ چلتا ہے۔ اسی پر شریعت میں اعمال و عبادات مرتب ہوتے ہیں:

اور سورہ رومن میں فرماتے ہیں کہ سورج اور چاند دونوں سے زمانہ پیدا ہوتا ہے زمین کی گردش کے بارے میں مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ فرمائیں:

﴿الشمس والقمر بحسبان﴾ ”سورج اور چاند (مقررہ) حساب کے تحت ہیں“ (رومن/۵)

جبکہ سورہ بقرہ آیت ۱۸۹ میں آیا ہے:

﴿فل هي مواقيت للناس والحج﴾

”کہہ دیجئے: یہ لوگوں کیلئے اور حج کے اوقات کے تعین کا ذریعہ ہیں“

﴿فمن شهد منكم الشهر فليصمه﴾ ”لہذا جو شخص اس مہینہ (رمضان) میں حاضر رہے اس کا فرض

ہے کہ وہ روزہ رکھے“ (بقرہ/۱۸۵) بقرہ/۱۸۹

﴿ان ربكم الله الذي خلق السموات والارض في ستة ايام﴾ ”یقیناً تمہارا رب وہ اللہ ہے جس

نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا“ (یونس/۳)

منازل قمر

چاند زمین کے گرد گردش کرتے ہوئے بہت سی منازل سے گذرتا ہے۔ سورہ یسین ۳۹:

﴿وَالْقَمَرَ قَدْرَهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ﴾ ”اور چاند، اس کیلئے ہم نے منزلیں

مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ اُن سے گزرتا ہو اوہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کے مانند رہ جاتا ہے“

﴿وَالْقَمَرَ نَوْرًا وَقَدْرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عِدْدَ السَّنِينَ وَالْحِسَابَ﴾ ”اور چاند کو چمک دی اور اس کی

منزلیں بتائیں تاکہ تم برسوں کی تعداد اور حساب معلوم کر سکو“ (یونس/۵)

۱۔ منزل : برج حمل منطقہ نجم سرطان

۲۔ منزل : برج حمل منطقہ بطین

۳۔ منزل : برج ثور منطقہ نجم ثریا

۴۔ منزل : برج ثور منطقہ نجم دبران

۵۔ منزل : کولہ الجبار منطقہ حقیقہ

۶۔ منزل : برج قواہن منطقہ نجم حصۃ

۷۔ منزل : برج قواہن منطقہ نجم مرزم ذراع مقبوضہ

۸۔ منزل : برج سرطان منطقہ نجم نثر

۹۔ منزل : برج سرطان منطقہ نجم اسد

۱۰۔ منزل : برج اسد منطقہ نجم رقبہ

۱۱۔ منزل : برج اسد منطقہ نجم زبرہ

۱۲۔ منزل : برج اسد منطقہ نجم صرفہ

- ۱۳۔ منزل: برج عذراء.....منطقه نجم العوا
 ۱۴۔ منزل: عذراء.....منطقه نجم اعزل
 ۱۵۔ منزل: برج عذراء.....منطقه نجم خفر
 ۱۶۔ منزل: برج میزان.....منطقه نجم عقرب
 ۱۷۔ منزل: برج عقرب.....منطقه نجم کلبل
 ۱۸۔ منزل: برج عقرب.....منطقه نجم قلب
 ۱۹۔ منزل: برج عقرب.....منطقه نجم شوله
 ۲۰۔ منزل: برج قوس.....منطقه نجم نحاسین
 ۲۱۔ منزل: برج قوس.....منطقه نجم قلاده
 ۲۲۔ منزل: برج قوس.....منطقه نجم سعدان
 ۲۳۔ منزل: برج قوس.....منطقه نجم سعدیلع
 ۲۴۔ منزل: برج قوس.....منطقه نجم سعود
 ۲۵۔ منزل: برج قوس.....منطقه نجم اخفیه
 ۲۶۔ منزل: برج قوس.....منطقه نجم فرغ
 ۲۷۔ منزل: برج قوس.....منطقه نجم منکب فرس
 ۲۸۔ منزل: برج قوس.....منطقه نجم حوت

چاند مذکورہ بالا اشائیکس (۲۸) منزل سے گزرتا ہے اگر مہینہ تیس دن کا ہے تو دو دن محاق میں رہتا ہے اگر انتیس (۲۹) دن کا ہے تو ایک دین محاق میں رہتا ہے اس وقت انتہائی باریک زرد اور قوس کی شکل میں کھجور کی سوکھی شاخ کی مانند نظروں میں آتا ہے۔

﴿و جمع الشمس والقمر﴾ ”اور سورج چاند ملا کر ایک گردیے جائیں گے“ (قیامت/۹)

﴿الشمس والقمر بحسبان﴾ ”سورج اور چاند (مقررہ) حساب کے تحت ہیں“ (رحمن/۵) یونس/۵۔ انعام ۹۶۔ ان تین آیات میں خداوند متعال نے سورج اور چاند کو ہماری زندگی کے اوقات اور زمانے کی کم و کیفیت کی طرف نسبت دی ہے۔ علماء فلکیات کے مطابق چاند اپنے محور کے ساتھ ساتھ زمین کے گرد بھی گردش کرتا ہے اور ایک ماہ میں اپنا چکر پورا کرتا ہے۔ اس وقت سورج کی شعائیں اس کے نصف حصہ پر پڑتی ہیں جبکہ باقی حصہ تاریک رہتا ہے۔ جو حصہ سورج کے سامنے ہے وہ مہینہ کے آخر میں محاق میں جاتا ہے اس وقت ہم چاند کو نہیں دیکھ سکتے۔ یہ وہ وقت ہے جب چاند زمین اور سورج کے درمیان ہوتا ہے۔ پھر یہ آہستہ آہستہ اوپر کی طرف ٹھکنا شروع ہوتا ہے اور ہمیں اس کا کچھ حصہ دکھائی دینے لگتا ہے اس وقت یہ حلال کی صورت میں ہوتا ہے۔ پھر یہ اور بڑھتا ہے اور اسے ہم بدر کی صورت میں دیکھتے ہیں اس وقت زمین سورج اور چاند کے درمیان میں ہوتی ہے اس وقت اس کا روشن چہرہ ہماری طرف ہوتا ہے۔

زمان: دن رات کی حرکت کا نام زمانہ ہے زمین اپنے گرد ایک رات اور ایک دن میں گردش پوری کرتی ہے اس طرح سورج کے گرد حرکت پوری کرنے سے سال بنتا ہے۔ دن اور رات خداوند عالم کی دو نشانیاں ہیں رات کے ذریعہ دن کی روشنی کو مٹایا اور دن کو دیکھنے کے قابل بنایا تاکہ انسان اپنے کسب و معاش میں ٹکلیں۔ دن رات کے اختلاف سے سالوں مہینوں اور دنوں کا حساب سمجھ سکتے ہیں۔ زمانے کی اکائی زمین کی اپنے اور سورج کے گرد حرکت سے بنتی ہے۔ شمسی سال کا تعین زمین کا سورج کے گرد ایک پورا چکر لگانے سے ہوتا ہے جو کہ تین سو پینسٹھ (۳۶۵) دن میں مکمل ہوتا ہے جبکہ عطارد سیارہ جو کہ سب سے نزدیک ہے اٹھاسی (۸۸) دن میں اپنا ایک چکر پورا کرتا ہے اور پلوٹو جو سب سے دور کا سیارہ ہے جس کی رفتار سب سے کم ہے اس کی گردش سورج کے گرد دو سو پچاس (۲۵۰) سال میں پوری ہوتی ہے۔

سورج اپنے نور اور روشنی سے ہماری معاونت کرتا ہے جس کی وجہ سے ہم دن میں اپنے کسب معیشت کا بندوبست کرتے ہیں، اس میں حرارت و مفید قسم کی شعائیں ہیں جو ہماری زراعت کو نمو بخشی ہیں اور پھلوں کو پکانے میں معاون ہیں۔

چاند جس کی خداوند عالم نے منازل معین کی ہیں یہ ہر دن ایک منزل طے کرتے ہوئے زمین کے گرد گردش کرتا ہے جس کا مدار سورج و زمین کے درمیان ہے، ایک مہینے میں اس کی مختلف شکلیں تبدیل ہوتی ہیں جس سے مہینے اور دن کا پتہ لگاتے ہیں اور اس سے روزے حج اور عبادات وغیرہ کے اوقات معلوم کرتے ہیں سورج و چاند میں زمین پر زندگی گزارنے والوں کیلئے کثیر منافع ہیں جو کہ خدا کی نشانی نعمت اور فضل و کرم ہے۔ سورج اور چاند مستقل حرکت میں ہیں اور یہ ایک خاص مدار سے نکلتے نہ گذشتہ زمان میں اس میں کوئی تغیر آیا ہے اور نہ حال میں کوئی تبدیلی دیکھنے میں آتی ہے یہ ہمیشہ اسباب زندگی کو فراہم کرتے ہیں، درحقیقت خدا نے انھیں مسخر کیا ہے۔ سورہ ابراہیم کی آیت ۳۳ میں آیا ہے کہ وہ ہمیشہ بدستور دقیق اندازے میں طلوع و غروب کرتے ہیں:

﴿وَسَجَّعَ لَكُمُ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ آيَاتٍ﴾ ”سورج اور چاند کو تمہارے لئے مسخر کیا کہ لگاتار چلے جا رہے ہیں“

خداوند متعال نے زمان کو عام انسانوں کی ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے ہر عام و خاص کیلئے ایک سادہ محسوس شناخت کے ذریعے وضع کیا ہے۔

۱۔ دن و رات: دن و رات گرچہ زمین کے گردش سے پیدا ہوتے ہیں لیکن ان کا حساب سورج کے طلوع و غروب سے وابستہ ہے پانچ وقت کی نماز بھی سورج کی طلوع و غروب سے مربوط ہے۔

۲۔ مہینے: اجتماعی سیاسی اور بعض دینی عبادات چاند سے وابستہ ہیں چاند ہی وہ واحد پہچان ہے جسے ہر خاص و عام ان پڑھ پڑھے لکھے درک کر سکتے ہیں کہ مہینے کا آغاز اور اختتام کب ہوتا ہے لہذا شریعت نے مہینے کو چاند سے مربوط کیا ہے۔

۳۔ موسم: گرمی سردی زمین سے وابستہ ہے زمین اپنی حرکت وضعی اور انتقالی کے ساتھ (۲۳/۵) اپنی گردش میں جھکاؤ رکھتا ہے جس سے وہ قطب شمالی جنوبی اور خط استوا سے قرب و بعد پیدا ہوتا ہے اس سے زمین پر سورج کی حرارت پر فرق پڑتا ہے یہاں سے اہل زمین کیلئے سال بھر میں موسم بدلتے رہتے ہیں اسکی چار فصل بنتی ہیں چنانچہ اسی کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے پیداوار کیلئے تقسیم بندی کی جاتی ہے۔

غرض زمان کی تینوں صورتیں منظومہ شمس کی تینوں سیاروں سے وابستہ ہیں جو ایک دوسرے سے بے نیاز نہیں ہیں۔

اگر ہم اصحاب کھف کی مدت قیام کو چاند کے حساب سے معلوم کرنا چاہیں تو یہ مدت تین سو نو سال بنتی ہے چنانچہ یہود نے ختمی مرتبت سے سوال کیا یہ تین سو سال سمجھ میں آگئے لیکن یہ تین سو نو سال کیسے بنتے ہیں تو پیغمبر اکرمؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا شمس حساب سے تین سو سال اور قمری حساب سے تین سو نو سال ہی بنتے ہیں۔ دین اسلام میں حکمت قرآن کے تحت مہینوں کو چاند سے مربوط کیا گیا ہے اگرچہ کے مہینے کو سورج سے مربوط کیا جاتا تو یہ ایک ہی موسم میں آتا، اگر گرمی میں ہوتا تو سرد علاقوں کے لوگوں کیلئے مشکلات پیدا ہوتی اور اگر سردیوں میں ہوتا تو گرم علاقوں کیلئے مشکلات ہوتی۔ لیکن چاند سے مربوط ہونے کی وجہ سے حج ہر موسم میں آتا ہے اور یوں ہر علاقے کے رہنے والے اسے برداشت کر لیتے ہیں۔ اسی طرح اگر شعائر اسلام نماز، روزہ و حج کو اگر شمس و قمری دونوں سے مربوط کیا جاتا تو عجیب تضاد پیدا ہوتا مثلاً اذان کو ہی لے لیں۔

﴿وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ حَسْبَانِ﴾

”اسی نے چاند اور سورج کے طلوع و غروب کا حساب مقرر کیا“ (انعام/۹۴)

﴿وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ حَسْبَانِ﴾ ”سورج اور چاند ایک حساب کے پابند ہیں“ (رحمن/۵)

۴۔ سورج اور چاند دونوں ہمارے حساب کیلئے ہیں:

﴿يَسْتَلُونَكَ عَنِ الْاهْلَةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾

”لوگ آپ سے چاند کے (گھٹنے اور بڑھنے کے) بارے میں پوچھتے ہیں کہہ دیجئے: یہ لوگوں کیلئے

اور حج کے اوقات کے تعین کا ذریعہ ہیں“ (بقرہ/۱۸۹) نساء/۱۵۳، توبہ/۳۶، اسراء/۷۸

۵۔ سورج تعین اوقات نماز ہے:

﴿اقِمِ الصَّلَاةَ لَدُلُوكَ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ﴾ ”آپ زوال آفتاب سے رات کی

تاریکی تک نماز قائم کریں اور نماز صبح بھی کہ نماز صبح کیلئے گواہی کا انتظام کیا گیا ہے“ (اسراء/۷۸)

منظومہ شمسی: ہماری منظومہ شمسی مجرح تہانہ کا ایک حصہ ہے یہ اپنی جگہ نو سیاروں اور ۵۳

چاندوں سمیت سورج کے گردش کرتے ہیں ذیل میں ہم ہر ایک سیارے اور اس کے سورج کے

ساتھ فاصلہ کا ذکر کریں گے۔

۱۔ عطارد: یہ سورج سے متوسط فاصلے پر واقع ہے یہ ۳۶ ملین میل کے فاصلے پر ہے یہ ۸۸ دن

میں سورج کے گردش پورا کرتا ہے اس کا کوئی چاند نہیں ہے یہ چاند سے بھی چھوٹا سیارہ ہے اس کی

اپنے گردی گردش اور سورج کے گردش ایک ہی ہے۔

۲۔ زہرہ: اس کا بھی چاند نہیں ہے اور سورج سے متوسط فاصلے پر واقع ہے۔ سورج سے ۶۷.۲

ملین فاصلے پر ہے یہ ۲۲۵ دن میں اپنا دورہ مکمل کرتا ہے یہ جہم اور کثافت کے حوالے سے زمین کے

برابر ہے

۳۔ مریخ: یہ بھی سورج سے متوسط فاصلے ۱۴۱ ملین میل دور ہے وہ ۶۸۷ دن میں سورج کے گرد

اپنا دورہ مکمل کرتا ہے مریخ کے دو چاند ہے۔

۴۔ مشتری: مشتری بھی سورج سے ۴۹۳ ملین میل کے فاصلے پر ہے وہ اپنا دورہ ۱۱ سال ۹ مہینے

میں مکمل کرتا ہے مشتری منظومہ شمسی میں سب سے بڑا سیارہ ہے اس کے لیے ۱۶ چاند کشف کیے ہیں۔

۵۔ زحل: یہ بھی سورج سے ۸۸۶ میل کے فاصلے پر ہے یہ اپنا دورہ ۲۹.۵ سال میں پورا کرتا ہے

یہ حجم کے لحاظ سے مشتری کے بعد بڑا سیارہ ہے اس کے لئے علماء نے ۲۰ چاند کشف کیے ہیں
۶۔ اورانس: اورانس بھی سورج سے ۱۷۸۳ ملین میل کے فاصلے پر ہے وہ ۸۴ سال میں سورج
کے گرد اپنا دورہ پورا کرتا ہے اس کے ۱۵ چاند ہیں۔

۷۔ پلوٹون: تقریباً ۱۳۴ سال قبل کشف ہوا ہے یہ سب سے جمیل و حسین زرد رنگ کا سیارہ
ہے۔ یہ سورج سے ۲۵۰۰ ملین میل کے فاصلے پر ہے زمین کے ۳۰ برابر گنا ہے یہ ۱۶۵ سال میں
ایک دورہ مکمل کرتا ہے اس کے ۱۸ چاند ہیں سب سے بڑے چاند کو ترائٹون کہتے ہیں۔

۸۔ پلوٹو: یہ سورج سے ۳۶۶۶ ملین میل کے فاصلے پر واقع ہے یہ اپنا دورہ ۲۴۸ سال میں مکمل
کرتا ہے یہ سب سے چھوٹا سیارہ ہے ابھی تک یہ ایک معہ ہے یہ سورج کے گرد سب سے طویل
مدارات پر چلنے والا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور جھوٹ:

جس نبی کی شان میں قرآن کریم نے فرمایا ابراہیم صدیق تھے اس کے بارے میں تورات میں لکھا
ہے جب حضرت ابراہیم مصر میں داخل ہوئے تو چونکہ سارہ ایک حسن جمال کی مالک تھی لہذا حاکم
مصر کی نظر سے بچانے کیلئے اپنی بیوی سے یہ کہا اگر تم سے میرے بارے میں پوچھے تو کہنا یہ میرا
بھائی ہے اور میں کہوں گا یہ میری بہن ہے حضرت ابراہیمؑ نے خود جھوٹ بولا اور بیوی کو بھی جھوٹ
بولنے کی دعوت دی ہے۔

پیغمبر اسلامؐ سے ایک روایت منسوب کی جاتی ہے کہ آپؐ نے فرمایا حضرت ابراہیمؑ نے اپنے
دور نبوت میں تین جھوٹ بولے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ جب ابراہیمؑ خلیل نے بت خانے میں جا کر تمام بتوں کو توڑا اور کھانڈی کو بڑے بت کے گلے

میں ڈال کر بت خانے سے نکل آئے تو لوگوں نے انھیں بلا کر پوچھا آپ نے ہمارے بتوں کو توڑا ہے تو آپ نے فرمایا میں نے یہ کام نہیں کیا بلکہ ان کے بڑے نے ایسا کیا ہوگا جبکہ بتوں کو تو آپ ہی نے توڑا تھا اس طرح آپ کا یہ کہنا ”اس بڑے بت نے دوسرے بتوں کو توڑا ہوگا“ یہ جھوٹ ہے۔

۲۔ جب قوم میلے میں جا رہی تھی تو انھوں نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے کہا آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں تو حضرت ابراہیمؑ نے ستاروں کی طرف دیکھ کر فرمایا میں مریض ہوں جبکہ وہ مریض نہ تھے۔

۳۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام بابل سے نکل کر ارض کنعان اور وہاں سے آپ مصر کی طرف گئے تو آپؑ نے اپنی زوجہ سارہ سے کہا اگر یہ لوگ آپ سے پوچھیں آپ کون ہیں تو آپ جواب دیں میں ان کی بہن ہوں اور خود حضرت ابراہیمؑ نے بھی کہا کہ یہ میری بہن ہیں اسی طرح ایک اور موقع پر ارض ”جرار“ کے مالک سے بھی ایسا ہی کہا۔

اس طرح حضرت ابراہیمؑ نے تین جھوٹ بولے ہیں ہمارے ہاں ایک گروہ دین میں ”دیدہ دجالی“ کا حامل ہے یعنی وہ دین کو صرف ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں جیسے ان کی دوسری آنکھ بالکل اندھی ہو، شاید یہ لوگ اپنے کانوں کے سلسلہ میں بھی ایسے ہی ہوں یعنی ایک کان سے سنتے ہوں اور دوسرے سے بہرے ہوں ان لوگوں کی نظروں اور ان کے صفحہ ذہن سے پیغمبر اسلامؐ کی وہ مشہور و معروف حدیث غائب ہو جاتی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا میں تمہارے درمیان ”دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں اور تم صرف اسی وقت گمراہی سے محفوظ رہ سکتے ہو جب تم ان دونوں سے تمسک رکھو ان میں سے ایک وہ کتاب خدا ہے جسے خود خداوند عالم نے لاریب کہا ہے اور دوسری سنت قطعیہ ہے“ لیکن یہ لوگ نہ تو استدلال کیلئے اور نہ ہی روایات کی صحت و سقم کو جانچنے کے لئے قرآن سے تمسک کرتے ہیں گویا وہ صرف حدیث ہی کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں جیسے ان

کے نزدیک حق و باطل میں تمیز کی یہی واحد اور قابل اعتماد کسوٹی ہے اس گروہ کے افراد جب یہ سنتے ہیں حدیث کے ضعیف اور جعلی ہونے کا خدشہ و احتمال رہتا ہے تو وہ فوراً بے قابو ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں اگر ایسا ہی ہے تو پھر آپ تمام حدیثوں کو پھینک دیں یعنی جب ان کے مطلب اور پسند کی حدیث ضعیف یا جعلی ہونے کی بنا پر مسترد ہو جائے تو حقائق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی بجائے غصہ و ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

حدیث پیغمبر اکرمؐ کی ہے اور پیغمبر محصمت کے مالک ہیں تو پھر کیوں وہ نبی جنہیں خدا نے اولیٰ العزم پیغمبر کہا انہیں ’صدیق‘ ہے کیسے ممکن ہے وہ جھوٹ بولیں، چنانچہ جو لوگ حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے تین جھوٹ بولے، اُن کی اس غلط سوچ و فکر اور غلط بیانی کی اصل وجہ انکا اسلام شناسی اور پیغمبر شناسی کے سلسلہ میں قرآن کریم کو بالکل اہمیت نہ دینا ہے بلکہ انہوں نے قرآن کو یکسر نظر انداز کیا ہے۔ انہوں نے جو دو آیات پیش کی ہیں ان میں پہلی آیت میں کسی بھی حوالے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جھوٹ بولنے کے بارے میں شائبہ تک نہیں ہوتا کیونکہ حضرت ابراہیمؑ نے فوراً قوم سے کہا ”بڑے بت نے کیا ہے اگر وہ بات کرے تو پوچھ لیں“ یعنی تم جس بت کی پوجا کرتے ہو اور اسے سب کچھ جانتے ہو اور مشکلات میں اسی کی طرف رجوع کرتے ہو اب جبکہ یہ مشکل بھی خود انہیں بتوں سے متعلق ہے تو تمہیں چاہیے کہ جب ان کا بڑا موجود ہے تو اسی سے پوچھو ان کے ساتھ یہ زیادتی کس نے کی ہے یہ ایک قسم کا طنز تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بت پرستوں سے کیا تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ نہیں کہا کہ میں نے یہ کام نہیں کیا ہے۔

جہاں تک دوسرے موقع کا تعلق ہے جب حضرت ابراہیمؑ نے میلے میں جانے سے انکار کے موقع پر ستاروں کی دیکھتے ہوئے فرمایا کہ میں مریض ہوں۔ (اس سلسلہ میں بعض کا کہنا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اس وقت ایک طرح کے زکام اور کھانسی میں مبتلا تھے) یہاں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس

زمانے کے لوگ جہاں ایک طرف بت پرستی میں غرق تھے وہاں وہ ستاروں کو بھی نفع و نقصان کا مالک سمجھتے تھے چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے انھیں انکے بتوں کی طرف متوجہ کرتے ہوئے ان کی بیوقوفی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ میں روحانی طور پر بیمار ہوں میری روح مریض ہے۔

ابراہیمؑ سرزمین ملکِ جزا میں:

یہ علاقہ قارس اور شور میں واقع ہے شہر مصر سے عراق جا کر توراتے میں ملکِ جزا نامی ایک آبادی ہے حضرت ابراہیمؑ جب یہاں پہنچے تو خوفزدہ ہو گئے یہاں کا بادشاہ ان کی زوجہ کی خاطر انہیں قتل کر دے گا چنانچہ قتل سے بچنے کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے کہا یہ میری بہن ہے حضرت سارہ کی خوبصورتی کی وجہ سے بادشاہ نے انہیں جبری اٹھوا لیا اور جب رات کو ان کے قریب جانا چاہا تو ایک بہت ہی خوفناک اور ڈرنا خواب دیکھا جس میں اسے کہا گیا تو اس عورت کی وجہ سے مر جائے گا۔ یہ قصہ تورات کا خود ساختہ ہے جس کا قرآن کریم میں کوئی اشارہ تک نہیں ملتا اس قصہ کے خود ساختہ ہونے کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ جب سارہ مصر میں تھیں تو ان کی عمر ستر سال تھی اور جس دور میں وہ سرزمینِ ابلی مالک میں پہنچیں اس وقت ان کی عمر نوے سال تھی یہ ممکن نہیں وہ بادشاہ جو عیش و نوش میں مستغرق ہو وہ کسی ایسی عورت سے عشق کرنے لگے جس کی عمر اسی نوے سال ہو گویا یہ قصہ انبیاء کے بارے میں تورات کے خود ساختہ قصص میں سے ہے جو انہوں نے نکاح محارم کو جائز قرار دینے کے لیے بنایا ہے اس قصہ کے جھوٹے دامن گھڑت ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے بادشاہ کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے، کوئی عورت کسی کی بہن ہو یا بیوی، تیسری دلیل ابراہیمؑ کہ جبکہ بارے میں اللہ تبارک نے فرمایا ہے ہم نے ان کو رشد و ہدایت اور عقل عطا کی ہے وہ ایسے ظالم و جابر حکمران کے شہر میں کیوں داخل ہوں جہاں ان کی عزت و ناموس کو خطرات سے دوچار ہونے اور ان کے قتل کا قوی امکان ہو۔

اس قصے کے خود ساختہ ہونے کی چوتھی دلیل وہ بت ممکن، نذر و پیاگ ابراہیمؑ جنہوں نے بت پرستی کو نیست و نابود کرنے کے لیے تاریخی مزاحمت و مقابلہ کی راہ اپنائی اور اس مزاحمت و مخالفت پر ناز و مد میں جانا گوارہ کر لیا۔ ان کے لیے یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے وہ بغیر مزاحمت کے اپنی ناموس کو بادشاہ کے کارندوں کے ہاتھوں میں جانے دیں ان سوالوں کا جواب تکلفات اور مخدوش دلائل ہی سے دیا جاسکتا ہے گویا تمام دشمنان اسلام کے لیے ان سوالوں کا حقیقی سچا اور قابل قبول جواب دینا ممکن نہیں۔

قصہ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام

علماء ماہرین انساب کے تحت ابراہیمؑ کا نسب ابراہیم بن تارخ یا تسارخ بن باحور بن ساروخ بن راعو بن فالغ بن عابر بن شالح بن ارفخشذ بن سام بن نوح ہے۔

ماہرین علماء لغت عرب کے مطابق ابراہیمؑ کلمہ عجمی ہے علماء انساب کی تحقیق کے مطابق آپ کے والد گرامی کا نام تسارخ ہے شیخ جامعہ الازہر سید محمد ططاوی اپنی کتاب القصہ فی القرآن کے صفحہ ۱۱ پر آپ کے سلسلہ نسب کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں ابراہیم بن تارخ یا تسارخ بن باحور بن ساروخ بن راعو بن فالغ بن عابر بن سام بن نوح علیہ السلام۔ تسارخ کے ہاں تین بیٹے پیدا ہوئے ابراہیمؑ، ناحور اور حاران سے لوط علیہ السلام پیدا ہوئے۔ حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان تقریباً تین ہزار سال کا عرصہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے اس سلسلہ نسب کو اہل تاریخ نے اپنی کتب میں بیان کیا ہے اس طرح ان کے ذکر میں ہے حضرت ابراہیمؑ کے باپ تسارخ کی عمر جب ۷۵ سال ہوئی تو ان کے ہاں تین بیٹے پیدا ہوئے جنکے نام ابراہیمؑ، ناحور اور حاران تھے پھر حاران کے ہاں حضرت لوطؑ پیدا ہوئے ابراہیمؑ ناحور اور حاران کے درمیان پیدا ہوئے۔ آپ تینوں کلدانیوں کی سر زمین بابل میں پیدا ہوئے حاران نے وہیں وفات پائی ان کے حالات کا ذکر تاریخ سیر و اخبار میں موجود ہے۔ حافظ ابن عساکر لکھتے ہیں کہ تسارخ

اپنے بیٹے ابراہیمؑ اور اس کی زوجہ سارا اور ابراہیمؑ کے بھتیجے لوط بن حاران کے ساتھ سرزمین بابل سے سرزمین کنعان کی طرف آگئے اور کنعان کے علاقہ حاران میں قیام پزیر ہو گئے وہیں ابراہیمؑ کے والد کا ۲۵۰ سال کی عمر میں انتقال ہوا حاران سے یہ لوگ بیت المقدس کی طرف منتقل ہوئے جو شام کا علاقہ تھا اہل شام بھی شمال کی طرف توجہ کر کے سات ستاروں کی پوجا کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ دمشق کے دروازوں پر ایک ستارے کا ہیکل نصب ہے جس کیلئے ستارہ پرست عید مناتے اور اپنی مذورات پیش کرتے تھے۔

اس وقت ابراہیمؑ، ان کی زوجہ اور حضرت لوطؑ کے علاوہ روئے زمین پر جو لوگ آباد تھے وہ سب کافر تھے علماء اور ماہرین کے نزدیک حقیقی باپ کے نام کے تعین میں اختلاف ہونا ایک عادی اور متعارف سیرت ہے خاص طور پر جہاں زمانہ تاریخ نویسی ضبط احوال وغیرہ سے پہلے زمانہ سے متعلق ہو۔ اس حوالے سے بعض تاریخ و سیرت کے لکھنے والوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام ”آزر“ بتایا ہے جو اس زمانہ کے مشہور و معروف بت ساز تھے۔ ابراہیم علیہ السلام کی تمام کوششیں انھیں بت پرستی سے دور کرنے میں ناکام رہیں۔ اس لئے آخر میں انھوں نے اس سے برات کا اظہار کیا جبکہ بعض دیگر محققین اور ماہرین نے آپ کے باپ کا نام ”تارخ“ بتایا ہے قرآن سے نام کا تعین کرنے میں محققین کو مشکل پیش آئی اور یہ اختلاف نظر اسی وجہ سے ہے اگر ہم خود آیات کو ایک دوسرے سے ملائیں تو شاید ہمیں اس سلسلہ میں قرآن کا نقطہ نظر معلوم ہو جائے۔

۱۔ بابل گہوارہ بت شکن:

آپؐ کی جائے ولادت بابل جس کا ذکر سورہ بقرہ آیت ۱۰۲ میں آیا ہے وہاں ایک علاقہ جس کا نام ”اور“ تھا آپؐ پیدا ہوئے یہ جگہ عراق میں دجلہ و فرات اور کر بلا و ہاشمیہ کے درمیان واقع ہے۔ حضرت نوحؑ کی کشتی یہاں رکی اور آپؐ نے یہاں قیام کیا یہاں سے ہی آپؐ کی نسل پھیلی، بابل کا شمار اس وقت سرسبز و شاداب اور نعمتوں سے پُر سرزمین میں ہوتا تھا زندگی کے وسائل کی فراوانی اور

کثرت مال و دولت کی وجہ سے اس وقت کے انسان بھی اخلاقی حوالے سے پست اور بری عادات میں غرق تھے اخلاق فضیلہ ان میں ناپید اور اعلیٰ اقدار کا فقدان تھا قرآن کریم نے جس طرح دیگر اقوام و مل کی نابودی کی علت عیش و عشرت، خدا سے غفلت، بت پرستی اور طاغوتوں کے سامنے خضوع کو قرار دیا ہے اسی طرح یہ قوم بھی مادی عیش و عشرت میں ٹھوٹھی ان پر ایک ظالم و جابر بادشاہ حاکم تھا جس کا نام نمرود بن کنان تھا، قصص قرآن و انبیاء کے تحت حضرت ابراہیم علیہ السلام جس طاغوت کے زمانے میں مبعوث ہوئے اور جس سے انھوں نے مقابلہ و مبارزہ کیا اسے نمرود کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یہ کلمہ عبرانی ہے جس کا معانی بڑا طاقت اور قدرت مند کے ہیں یہ قوش بن حام بن نوح کا بیٹا تھا وہ شکار میں بڑا ماہر تھا ایک قول کے تحت اس نے باہل کو بنایا ہے چنانچہ اس کو ایک عرصے تک زمین نمرود کہا جاتا تھا سورہ بقرہ آیت ۲۵۸ میں اس کا نام لیے بغیر اس کی طرف یوں اشارہ کیا ہے کہ وہ شخص جس نے حضرت ابراہیمؑ سے اس کے رب کے بارے میں مناظرہ کیا:

﴿الہم ترالی الذی حآج ابرہیم فی ربہ﴾ ”کیا آپ نے اس شخص کا حال نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے ان کے رب کے بارے میں جھگڑا کیا“، لیکن قصص انبیاء اور دیگر قصے کہانیوں میں نمرود کو بہت اونچا کر کے پیش کیا ہے لیکن سورہ بقرہ آیت ۲۵۸ سے پتہ چلتا ہے جتنا اس کے قدرت و توانائی اور سلطنت کے بارے میں بتایا جاتا ہے اسکی کیفیت و نوعیت وہ نہیں ہے لہذا قرآن کریم نے اس کے نام لینے سے گریز کیا اسی طرح جب حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکنے کا فیصلہ کیا تو وہ فیصلہ بھی قرآن میں نقل ہے ”قوم نے کہا ہے“ اور یہ بھی ثابت نہیں ہے نمرود نے خود کو ”الہ“ کی جگہ پر پیش کیا جس طرح فرعون موسیٰ نے اپنے قوم سے کہا تھا:

﴿ما علمت من الہ غیرک﴾ ﴿انارکم الاعلیٰ﴾

طاغوت مجہول: قرآن حکیم نے اس سرکش و طافی انسان کا نام بتانے سے گریز کیا ہے۔ تاکہ آنے والی نسلوں پر یہ بات واضح و روشن ہو جائے کہ نمرود اپنی سلطنت و حکومت اور تمام تر طاقت و

قدرت کے باوجود ارادہ و مشیت الہی کے مقابلے میں ابراہیم خلیل کے قاطعانہ دلائل و براہین کے سامنے ایک مجہول الحال انسان ہے اور جو بھی جب بھی دین حقیقی کے مقابلے میں آئے گا اور اس پر عمل سے گریز کے بہانے تراشے گا، وہ نمرود کی طرح بے نام و نشان ہو جائے گا اور قدر و منزلت کی بجائے تاریخ اسے ایک قابل نفرت اور ناقابل ذکر انسان کے طور پر متعارف کروائے گی۔

قرآن کریم کی سورہ بقرہ آیت ۲۵۸ میں اس بادشاہ کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے: ”اے محمد! آپ نہیں جانتے اس شخص کو جو ابراہیمؑ کے ساتھ اپنے ہی خالق اور وجود باری تعالیٰ کے بارے میں مناظرہ پر اتر آیا۔“ قرآن نے ایک اشارے کے ساتھ اس کی ایک صفت بیان کی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے دور کا بادشاہ تھا۔ قرآن نے فرمایا اللہ رب العزت نے اسے ملک و سلطنت اور دولت عطا کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جو سوال کیا، وہ انتہائی سادہ اور واضح تھا ایک بادشاہ کا ابراہیم علیہ السلام جیسی عقل و منطق و برہان سے بات کرنے والی ہستی سے ایسا سوال کرنا جس کا جواب ایک عام اور سادہ انسان یہاں تک کہ طفل مکتب سے بھی پوشیدہ نہیں، اس کی جہالت و سفاحت اور غرور و تکبر کی علامت ہے چنانچہ اللہ نے اپنے کلام میں اس کے سوالیہ فقرے کا ذکر کرنا بھی مناسب نہ سمجھا، ابراہیم علیہ السلام کے جواب سے معلوم ہوتا ہے اس نے ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا تمہارا رب کون ہے تو ابراہیمؑ نے جواب دیا وہ جو تمام موجودات کو موت اور حیات دیتا ہے وہی میرا رب ہے۔ دیگر موجودات الہی کے برعکس موت و حیات دو ایسی پیچیدہ مخلوقات ہیں، جدید علمی دور کے محققین بھی علمی انکشافات کے بلند بانگ دعوے کرنے کے باوجود اس حقیقت سے آشنا نہ ہو سکے۔ ہر چیز کی برگشت مٹی ہے اور مٹی میں حیات نباتاتی کیسے آئی، پھر حیات نباتاتی کے اندر حیات حیوانی کیسے پیدا ہو گئی، حیات حیوانی میں حیات انسانی کیسے اور کس طرح پیدا ہوئی، علمائے جراثیم اور مائیکرو وشناس ان انتہائی چھوٹی اور آنکھ سے نظر نہ آنے والی چیزوں کو کشف کرتے ہیں لیکن مائیکرو سکوپ سے نظر آنے والی یہ مخلوق کیسے پیدا ہوئی اور اس میں یہ حیات کہاں سے آئی،

ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ اسی طرح جب ایک ہنستا کھیلتا چلتا پھرتا انسان دیکھتے دیکھتے موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے تو یہاں سوال پیدا ہوتا ہے اسے موت کیسے آئی اور کس طرح انسانی جسم سے حیات کا خاتمہ ہوتا ہے اسکی گہرائیوں میں جانے والے بھی اس سے نااہل ہیں انسانی جسم سے روح نکلنے کے بعد جب اس کا جسم بے حس و حرکت ہو جاتا ہے تب دوسرے انسانوں کو پتہ چلتا ہے اسے موت لاحق ہوگئی ہے لیکن موت اسے کہاں سے آئی، کیسے آئی اور اسکی روح جسم سے کیسے جدا ہوگئی یہ بات ابھی تک معما ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقابل کھڑے ہونے والے طاغوت نے خود کو موت و حیات پر قادر و قابض ثابت کرنے کیلئے ایک انسان سرایافتہ جسے سزائے موت سنائی گئی تھی کو آزاد کر کے یہ دعویٰ کیا وہی ہے کہ جو دوسروں کو زندگی دیتا ہے اور پھر ایک آزاد اور غیر قصور وار انسان کو تلوار کی کاٹ سے قتل کرنے کے بعد یہ دعویٰ کرنے لگا اس کے مرنے سے یہ ثابت ہو گیا کہ میں جسے چاہتا ہوں موت دیتا ہوں اور جسے چاہتا ہوں زندگی و حیات بخشا ہوں وہ بے وقوف بادشاہ تو تھا مگر اس پر یہ آسان سی بات بھی واضح نہیں موت اور قتل میں لامتناہی فرق ہے اس نے تو ایک شخص کو قتل کیا جس کے نتیجے میں اسے موت لاحق ہوئی۔ اگر کوئی قاتل یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ موت دینے پر قدرت رکھتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ یہ ثابت کرے کہ وہ کسی کو قتل کرنے یا قتل کروانے کے بغیر جب کہتا ہے کہ فلاں کو موت آجائے تو اسے موت آجاتی ہے جو موت دینے پر قادر ہو وہ تو تعدی و تجاوز اور جسمانی اذیت کے بغیر جسم سے روح کو جدا کر لیتا ہے جب نمرود نے چشم بندی اور زبان بندی سے قتل کو موت دکھانے کی کوشش کی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے احتجاج کا رخ موڑتے ہوئے اس سے کہا میرا رب سورج کو مشرق سے نکالتا ہے اگر تو اپنے دعوے میں سچا ہے تو اسے مغرب سے طلوع کر کے دکھا۔

اسکی نظر میں انسان ایسے تھے جیسے ایک چوپان کی نظر میں اس کے مال مویشی۔ یعنی ہر انسان اس

کے نزدیک ایک حیوان کی حیثیت رکھتا تھا لہذا یہ جب چاہتا اپنے استفادہ کی خاطر اسے ختم کر دیتا۔ ابراہیمؑ وہیں مبعوث ہوئے اس کی تائید آیات قرآنی سے ملتی ہے کیونکہ آپ کی جائے بعثت بت و بت پرستی کے انتہائی عروج کی جگہ تھے لہذا آپ نے دعوت کا آغاز بتوں کے مخالفت سے کیا اس کے بعد آپ وہاں سے ہجرت کر کے بیت المقدس کی طرف گئے اور بیت المقدس سے آپ نے سرزمین مقدس مکہ مکرمہ کی طرف ہجرت کی اور وہاں آپؐ نے کعبہ بیت اللہ کی تعمیر فرمائی۔

افرادِ عناصر یعنی آپ کی آغازِ بعثت سے لے کر اختتام تک جن افراد سے تعلق ہوا انکو دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

پہلا گروہ: جو آپ کی نبوت کے حامی یا مدافع تھے جن کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے:

(۱) لوطؑ، (۲) سارا، (۳) اسماعیلؑ، (۴) اسحاقؑ، (۵) ملائکہ

دوسرا گروہ: کہ جنہوں نے آپ کی رسالت کی بھرپور مزاحمت کی جیسے ۱۔ آزرؑ، ۲۔ نمرود

ابراہیم علیہ السلام کی بتوں کے خلاف سرد جنگ سے بت شکنی تک:

حضرت ابراہیمؑ فطرتِ سلیم کے مظہر جلی تھے جب ان کی نظریں فطرتِ سلیم کے خلاف چہروں پر پڑی آپؑ نے توحید پرستی کی جگہ بت پرستی کو دیکھ کر سب سے پہلا خطاب جس سے کیا وہ آپؑ کے چچا تھے آپؑ نے اپنے چچا سے کہا آپ ایسی چیزوں کی کیوں پرستش کرتے ہیں جو نہ سن سکتی ہیں نہ دیکھ سکتی ہیں جو کام آپؑ کر رہے ہیں یہ درحقیقت شیطان کی پرستش اور رحمن کی نافرمانی ہے، مجھے خوف ہے کہ خدا اپنے عذاب کی پلیٹ میں آپؑ کو نہ لے لے۔ جیسا کہ سورہٴ مریم کی آیت ۴۲:

﴿إِذْ قَالَ لَٰبِئْهٖ بِمَا بَتَ لِمَ تَعْبُدُنَا مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْءٌ﴾ ”جب انہوں

نے اپنے باپ سے کہا اے ابا آپؑ اسے کیوں پوجتے ہیں جو نہ سننے کی اہلیت رکھتا ہے اور نہ دیکھنے کی اور نہ ہی آپؑ کو کسی چیز سے بے نیاز کرتا ہے۔“

ترجمہ: ”اور تحقیق ہم نے ابراہیم کو پہلے ہی سے عقل کامل عطا کی تھی اور ہم اس کے حال سے واقف و باخبر تھے۔ جب انہوں نے اپنے باپ (بچپا) اور اپنی قوم سے کہا: یہ مورتیاں کیا ہیں جن کے گرد تم جمع رہتے ہو؟۔ کہنے لگے ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی پوجا کرتے پایا ہے۔ ابراہیم نے کہا: یقیناً تم خود اور تمہارے باپ دادا بھی واضح گمراہی میں مبتلا ہیں۔ وہ کہنے لگے: کیا آپ ہمارے پاس حق لے کر آئے ہیں یا یہودہ گوئی کر رہے ہیں؟۔ ابراہیم نے کہا: بلکہ تمہارا رب آسمانوں اور زمین کا رب ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا اور میں تم سب پر اس بات کا گواہ ہوں اور اللہ کی قسم! جب تم یہاں سے پیٹھ پھیر کر چلے جاؤ گے تو میں تمہارے ان بتوں کی خبر لینے کی تدبیر ضرور سوچوں گا۔ چنانچہ ابراہیم نے ان بتوں کو ریزہ ریزہ کر دیا سوائے ان کے بڑے (بت) کے تاکہ اس کی طرف رجوع کریں۔ وہ کہنے لگے: جس نے ہمارے معبودوں کا یہ حال کیا ہے یقیناً وہ ظالموں میں سے ہے۔ کچھ نے کہا: ہم نے ایک جوان کو ان بتوں کا (برے الفاظ میں) ذکر کرتے ہوئے سنا ہے جسے ابراہیم کہتے ہیں۔ کہنے لگے: اے سب کے سامنے پیش کرو تاکہ لوگ اسے دیکھ لیں۔ کہا: اے ابراہیم! کیا ہمارے معبودوں کا یہ حال تم نے کیا ہے؟ ابراہیم نے کہا: بلکہ ان کے اس بڑے (بت) نے ایسا کیا ہے سو اس سے پوچھ لو اگر یہ بولتا ہو۔ یہ سن کر وہ اپنے ضمیر کی طرف پلٹے اور کہنے لگے: ہیتنا تم خود ہی ظالم ہو۔ پھر انہوں نے اپنے سروں کو نیچے کر لیا (اور ابراہیم سے کہا: تم جانتے ہو کہ یہ نہیں بولتے۔ ابراہیم نے کہا: تو پھر تم اللہ کو چھوڑ کر انہیں کیوں پوجتے ہو جو تمہیں نہ کوئی فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان؟۔ تف ہو تم پر اور ان معبودوں پر جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پوجتے ہو کیا تم عقل نہیں رکھتے؟۔ وہ کہنے لگے: اگر تمہیں کچھ کرنا ہے تو اسے جلا دو اور اپنے خداؤں کی نصرت کرو۔ ہم نے کہا: اے آگ! ٹھنڈی ہو جا اور ابراہیم کیلئے سلامتی بن جا اور انہوں نے ابراہیم کے ساتھ اپنا ترہہ استعمال کیا لیکن ہم نے خود انہیں ناکام

بتا دیا“ (انبیاء/ ۵۱: ۷۰)

ابراہیم علیہ السلام کے سوالیہ انداز میں بیک وقت استفہام، اعتراض اور باطل کا مذاق اڑانا شامل تھا ابراہیم علیہ السلام ابھی ایک تازہ نوجوان ہیں اس اجتماعی میں واحد دیکتا ہیں لیکن اپنی عقل و فراست سے ان لوگوں سے ایک ایسا سوال کرتے ہیں کہ پوری قوم حیران و سرگرداں ہوتی ہے اور بہانہ سازی پر اتر آتی ہے ابراہیم علیہ السلام نے اپنے سوال سے انکی عقل و فکر کو چیلنج کیا اور اپنے اس مختصر جملہ میں آپ نے چند نکات اٹھائے:

- ۱۔ اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے اس پتھر کے سامنے تم خضوع و خشوع اور شکستگی میں کیوں جھکے پڑے ہو۔ اس پتھر کی کیا حقیقت اور قدر و قیمت ہے۔
 - ۲۔ یہ پتھر تمہاری زندگی میں کیا مثبت کردار رکھتا ہے۔
 - ۳۔ یہ پتھر دوسرے پتھروں کی بہ نسبت جنگی تم پوجا نہیں کرتے کن امتیازات کا حامل ہے، کون سے اسرار اسکے اندر پوشیدہ ہیں اسکی موجودہ شکل و صورت اس کی اپنی پیدا کردہ ہے یا اسکے بنانے والے تم ہو ایک عابد اور معبود میں کیا رشتہ ہونا چاہیے اسی طرح معبود عابد کی زندگی میں کیا کردار رکھتا ہے یہ وہ مختصر سوالات ہیں جو ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے کیے اور انھیں جنبش دی۔
- جواب قوم:

قوم کے تجربہ کار اور اہل حل و عقد نے اس نوجوان کے حکمت سے پُر سوالات کا ایک ہی احمقانہ جواب دینے پر اکتفاء کیا اور وہ بھی جو عقل و منطق سے عاری اور وجدان سے کوسوں دور تھا انھوں نے کہا ہم اس عمل کے فلسفہ و حکمت سے آگاہ نہیں ہم نے صرف اپنے آباء اجداد کو انکی پرستش کرتے اور انکے سامنے خاضع ہوتے ہوئے پایا ہے ہمارے بزرگان انکی تقدیس و احترام کرتے تھے۔ اور انھوں نے ہی ہمیں اس سنت کو زندہ رکھنے کی وصیت کی ہے لہذا ہم ایک اولاد صالح و مطیع و فرمانبردار کا کردار ادا کرتے ہوئے ان کی پوجا کرتے ہیں ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنے آباء اجداد کی سیرت

سے روگردانی کریں ابراہیم علیہ السلام نے قوم کا یہ احمقانہ جواب سننے کے بعد انھیں ایک جاہل قوم قرار دیا اور کہا تم اور تمہارے آباؤ اجداد سب کھلی گمراہی میں ہیں۔

قوم نے ابراہیم علیہ السلام سے کہا تم یہ باتیں ہوش و حواس میں کر رہے ہو یا ہمارے ساتھ مذاق کر رہے ہو ابراہیم علیہ السلام نے بغیر کسی عذر و خواہی خوف و پریشانی کے واضح انداز میں ان سے کہا تمہارا رب وہی ہے جس نے زمین و آسمان کو خلق کیا اور میں اسکی گواہی دیتا ہوں اور یہ بت چکی تم پوجا کرتے ہو یہ تمہارے خدا نہیں یہ کیسے ممکن ہے ایک جامد پتھر جسے تم نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے تمہارا خدا بنے۔ خدا کی قسم میں تمہارے بتوں کے بارے میں سوچوں گا چنانچہ ایک تقریب کے موقع پر جب پورا شہر خالی تھا ابراہیم علیہ السلام بت خانے میں گئے اور بڑے بت کے علاوہ تمام چھوٹے بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تاکہ ابتدائی مرحلہ میں لوگوں کے اذہان میں یہ بات آئے اس بڑے بت نے چھوٹے بتوں کو توڑا ہے کیونکہ بت پرستوں کے عقیدہ کے مطابق یہ بت نفع و نقصان کا بت تھا لہذا یہ لوگ بڑے بت کی طرف رجوع کریں گے اور جواب نہ ملنے پر ان کے اندر ایک منفی سوچ پیدا ہوگی یا یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر الزام لگائیں گے کیونکہ آپ ہی وہ واحد شخصیت تھے جو ان بتوں کے خلاف تھے ابراہیم علیہ السلام یہ یقین رکھتے تھے کہ الزام انھی پر آئے گا لیکن آپ پہلے مرحلہ میں بڑے بت کی سلامتی سے ان کے اذہان کو جھنجھوڑنا چاہتے تھے۔

ابراہیم علیہ السلام اپنا کام مکمل کرنے کے بعد اپنی پناہ گاہ میں چلے گئے لوگ جب بت پرستی کی مراسم ادا کرنے کی خاطر بت خانے میں آئے تو انھوں نے ایسا منظر دیکھا جو انکی غیرت و میت کو جوش دلانے والا تھا لہذا وہ درد بھرے لہجے میں اس واقعہ پر ایک دوسرے سے گفت و شنید کرنے لگے انکی مقدمات پر یہ جرم و جنایت کس نے کیا ہے سب نے کہا جو بھی ہو جس نے یہ کام کیا وہ ظالم ہے اور ہم اسے اسکے انجام تک پہنچائیں گے کیونکہ اس نے ہمارے خداؤں کے ساتھ جسارت کی ہے لہذا ہمیں اس مجرم کی تلاش کرنی چاہیے۔ اسی دوران ایک گروہ نے کہا سنا ہے اس شہر میں ایک

نو جوان جس کا نام ابراہیم ہے وہ ہماری بت پرستی کو مسترد کرتا ہے اور بت پرستی کرنے والوں کو گمراہ اور رجعت پسند قرار دیتا ہے واحد وہی شخص ہے جو اس جرم و جنایت کا مرتکب ہو سکتا ہے لہذا ہمیں اپنی تمام تر توجہ کو اسکی طرف مرکوز کرنا چاہیے سب لوگوں نے کہا اسے اجتماع کے سامنے لایا جائے اور جو عمل اس نے کیا ہے وہ سب کے سامنے اسکا اقرار کرے۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام کو پکڑ کر اس اجتماع کے سامنے لایا گیا اور ان سے سوال کیا گیا کہ آپ نے ہمارے بتوں کے خلاف یہ جسارت کی ہے کیونکہ تم ہی واحد وہ شخص ہو جو بت پرستی نہیں کرتے کیونکہ ممکن نہیں جو شخص بت پرستی کرے وہ بتوں کی اہانت بھی کرے۔

ان سوالات کے جواب میں ابراہیم علیہ السلام نے ایک ایسا جملہ ارشاد فرمایا تاکہ انکے اذہان کو جھنجھوڑیں اور انہیں اپنے گریبان میں جھانکنے پر مجبور کریں آپ نے کہا یہ کام اس بڑے بت نے انجام دیا ہے کیونکہ یہ ہی تنہا باقی بچا ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے یہ کارنامہ اس نے انجام دیا ہے اور یہ دوسروں کی نسبت زیادہ طاقت ور بھی دکھائی دیتا ہے لہذا حیرت منجھ سے سوال کر رہے ہو اسی طرح اس سے پوچھو تا کہ یہ تمہیں جواب دے سکے ابراہیم علیہ السلام اس طریقہ سے ان کے عقیدے سے ٹکرائے اور ان سے گفتگو کو آگے بڑھایا جب آپ نے بت پرستوں سے کہا کہ وہ اس بت سے کشف حقیقت دریافت کریں تو بت پرست اپنے ضمیر کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور اپنے بتوں کی عجز و ناتوانی ان پر عیاں ہوئی اور خود کو عقل و منطق اور وجدان کے سامنے ناتواں پایا تو کوئی پناہ گاہ تلاش کرنے لگے۔ کیونکہ بڑے بت کو جھٹلانے میں انکے عقیدہ کا بطلان تھا اور وہ اس سے دستبردار ہونا بھی نہیں چاہتے تھے۔ انہیں اپنی غلطی پر اسرار ہی کرنا تھا لہذا وہ بت سے سوال کرنے کی بجائے دوبارہ ابراہیم علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا ہم جانتے ہیں یہ بت بات نہیں کر سکتے لہذا ہم کیسے بڑے بت پر الزام لگائیں پس اگر کوئی مجرم ہے تو وہ صرف تم ہی ہو۔

منطق و استدلال کی جنگ:

قدیم زمانے سے لیکر عصر حاضر تک اہل حق اور باطل کا یہ دستور رہا ہے وہ ایک دوسرے کے خلاف نیر دآزما ہونے اور خونی جنگ چھیڑنے سے پہلے سرد جنگ کا آغاز کرتے ہیں۔ اور مخالف کو کمزور کرنے کے بعد خونی جنگ کے مرحلہ میں داخل ہوتے ہیں اہل باطل کا یہ وطیرہ رہا ہے وہ ہمیشہ سے مختلف تہمتوں اور بہانوں سے نئے نئے مسائل پیدا کر کے اہل حق کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے اور ان کے خلاف بے بنیاد جواز ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ پندرہویں صدی کے تیسویں اور چوبیسویں سال میں امریکہ نے گیارہ مئی کے واقعہ کے مجرموں کو کفر کرادار تک پہنچانے کے نام سے امت اسلامی کو اس حادثہ کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے ان کے خلاف پہلے سرد جنگ اور پھر جلد ہی خونی اور تباہ کن جنگ کا آغاز کیا، مسلمانوں کے دو ملکوں پر یکے بعد دیگرے قبضہ کیا اس جنگ میں امریکہ نے ہزاروں مسلمانوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگیں کیے جبکہ اس کے برعکس اہل حق کا یہ طرز عمل نہیں ہوتا وہ ہمیشہ سے جھوٹ افتراء اور تہمتوں سے گریز کرتے چلے آ رہے ہیں وہ حقائق کو روز روشن کی طرح عیاں کرتے ہیں اور عقل و منطق اور وجدان سے استدلال کرتے ہیں۔ لوگ انکے سامنے قائل ہوں یا نہ ہوں وہ کسی بھی صورت دوسرے فریق کو اپنے قہر و غضب کا نشانہ نہیں بناتے اور ہر صورت میں لوگوں کی عزت جان و مال کے تحفظ کی کوشش کرتے ہیں لیکن اہل باطل مخالف فریق کے ناکردہ جرائم کو بہانہ بنا کر اور اہل حق کو حق گوئی سے باز رکھنے کی دھمکی کے ساتھ ساتھ دردناک عذاب کی سزا بھی سناتے ہیں تاریخ بشریت میں اس طرح کے کئی ایک تلخ اور ظلم سے بھرپور ادوار ہو گزرے ہیں کہ جنہیں سن کر ہر درد دل انسان غم و اندوہ کی کیفیت میں مبتلا ہو کر آنسو بہانے پر مجبور ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ بھی ایسی ہی ایک رو داد کا حصہ ہیں کہ جنہوں نے بت پرستی کے خلاف عقل و منطق اور استدلال سے جنگ کا آغاز کرتے ہوئے سب سے پہلے اپنے چچا آزر جو بت پرستی

میں مشہور تھے ان سے ان کلمات میں جواب طلبی کی:

﴿اذ قال لایہ یا بابت لم تعد ما لا یسمع ولا یبصر ولا ینعی عنک شیئا﴾ ”جب انہوں نے اپنے باپ سے کہا اے ابا آپ اسے کیوں پوجتے ہیں جو نہ سننے کی اہلیت رکھتا ہے اور نہ دیکھنے کی اور نہ ہی آپ کو کسی چیز سے بے نیاز کرتا ہے“ (مریم/۳۲) ﴿یا بابت انی قد جاءنی من العلم ما لم یاتک فتابعنی اهدک صراطا سویا﴾ ”اے ابا تحقیق میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا پس آپ میری بات مانیں۔ میں آپ کو سیدھی راہ دکھاؤں گا“ (مریم/۳۳) ﴿قال هل یسمعونکم اذ تدعون﴾ ”ابراہیم نے کہا جب تم انھیں پکارتے ہو تو کیا یہ تمہاری سنتے ہیں“ (شعراء/۷۲) ﴿او ینفعونکم او یضرون﴾ ”یا تمہیں فائدہ یا ضرر دیتے ہیں“ (شعراء/۷۳)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جواب میں آزر نے کہا:

﴿قال اراغب انت عن الہی یا برہیم لئن لم تنتہ لا رجعتک و اھجرى ملیا﴾ ”اس نے کہا اے ابراہیم کیا تو میرے معبودوں سے برگشتہ ہو گیا ہے اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے ضرور سنگسار کروں گا اور تو ایک مدت کے لیے مجھ سے دور ہو جا“ (مریم/۳۶)

ابراہیم اور بتوں کا توڑنا:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب تمام تردلائل و براہین پیش کرنے کے بعد بت پرستوں سے منفی رویہ کا سامنا ہوا تو ابراہیم نے خدا سے قسم کھا کر کہا تمہارے یہاں سے جانے کے بعد میں تمہارے ان بتوں کی جن کی تم پرستش کرتے ہو بندوبست کروں گا:

﴿و نالہ لا کیدن اصنامکم بعدتو لو امدبرین﴾ ”اور خدا کی قسم میں تمہاری غیر موجودگی میں ضرور تمہارے بتوں کی خیر لوں گا“ (انبیاء/۵۷)

اس وقت کے لوگ سال میں ایک دفعہ ایک میلے کا اہتمام کرتے تھے اس میں آزر نے ابراہیم

کو بھی شرکت کی دعوت دی تو ابراہیمؑ نے ستاروں کی طرف دیکھ کر کہا میں مریض ہوں اور ابراہیمؑ تنہا گھر میں رہے جب سارا شہر خالی ہو گیا تو چپکے سے گھر سے نکلے بتوں کو آراستہ دیکھا جن کے سامنے تقرب کی خاطر انواع و اقسام کے کھانے رکھے تھے ابراہیمؑ نے مزاج اور اہانت سے ان سے خطاب کیا تم لوگ کھاتے کیوں نہیں ہو؟ اور بات کیوں نہیں کرتے ہو یہ کہہ کر اپنے ہاتھ میں موجود کلہاڑی سے بڑے بت کے علاوہ تمام کو پاش پاش کیا:

﴿فَنُوحِلُوا فِي مَدْيَنَ ۖ فَارَاغَ إِلَيْهِ الْهَيْهَتُمْ فَقَالَ لَا تَأْكُلُون ۚ مَا لَكُمْ لَا تَنْتَقُونَ﴾

”ان کے پیچھے وہ چپکے سے ان کے معبودوں کے مندر میں گھس گیا اور بولا آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں ہیں؟ کیا ہو گیا ہے آپ لوگ بولتے کیوں نہیں؟ اس کے بعد ان پر پل پڑا اور سیدھے ہاتھ سے خوب ضربیں لگائیں“ (سافات/ ۹۳ تا ۹۰) ﴿فَجَعَلْنَاهُمْ جُلُودًا لَا يَسْمُونَ﴾ ”اس نے ان کو نکلے نکلے کر دیا اور صرف ان کے بڑے کو چھوڑ دیا“ (انبیاء/ ۵۸) صرف ان کے بڑے بت کو رکھا اور اس کے کندھے پر کلہاڑی کو رکھا یہ بتانے کیلئے کہ اس کو غصہ آیا ہے کہ اس کے ساتھ چھوٹے بتوں کو کیوں رکھا ہے جب وہ لوگ عید سے واپس آئے تو اپنے بتوں کا یہ حال دیکھا غصہ میں آکر کہا:

﴿قَالُوا مَن فَعَلَ هَٰذَا بِآلِهَتِنَا﴾ ”کہنے لگے ہمارے خداؤں کا یہ حال کس نے کروا دیا؟“ (انبیاء/ ۵۹)

اگر یہ لوگ عقل رکھتے تو ان کیلئے یہ کافی تھا جو کچھ ان کے بتوں کے ساتھ ہوا تھا جن کی وہ پوجا کرتے تھے اگر وہ خدا ہوتے تو اپنے دفاع کر سکتے لیکن انھوں نے جہالت و نادانی، بے وقوفی، گمراہی اور غرور پر قائم رہتے ہوئے کہا کہ ہمارے خداؤں کے ساتھ جس نے یہ سلوک کیا ہے یقیناً وہ ظالمین میں سے ہوگا: ﴿وَإِنَّ لِمَن ظَلَمُوا ظَمًا مَّا تَوَادُّوا﴾ (انبیاء/ ۵۹)

ان میں سے بعض نے کہا کہ اس کا نام ابراہیم علیہ السلام ہے:

﴿قَالُوا اسْمَعْ أَقْسَىٰ بِذِكْرِهِمْ يُقَالُ لَٰهٖ اِبْرٰهٖمُ﴾ ”بولے ہم نے ایک نوجوان کو ان کا ذکر کرتے

سنا تھا جس کا نام ابراہیمؑ ہے“ (انبیاء/۶۰) وہ ہے جس نے بتوں کو توڑا ہے اس کو لوگوں کے سامنے لائیں تاکہ لوگ دیکھیں کہ وہ کیا کہتا ہے یہی مقصد ابراہیمؑ خلیل اللہ تھا کہ سب لوگ جمع ہو جائیں اور تمام بت پرستوں کے سامنے یہ بات کریں اہل حق ہمیشہ اپنا مدعی اجتماع عام میں پیش کرتے ہیں جس طرح حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو کہا تھا کہ یہ پروگرام عید کے دن رکھو:

﴿قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمَ الزَّيْنَةِ﴾ ”موسیٰؑ نے کہا جشن کا دن طے ہوا“ (طہ/۵۹)

جب سب جمع ہوئے تو انھوں نے کہا اے ابراہیمؑ تو نے یہ کیا کیا ہے تو ابراہیمؑ نے کہا ان کے بڑے نے کیا ہے اس سے کیوں نہیں پوچھتے؟

﴿قَالُوا انت فعلت هذا بالهتتنا يا ابراهيم۔ قل بل فعله كبيرهم

هذا فاستلوهم ان كانوا ينطقون﴾ ”کہا: اے ابراہیمؑ! کیا ہمارے معبودوں کا یہ حال تم نے کیا ہے؟ ابراہیمؑ نے کہا: بلکہ ان کے اس بڑے (بت) نے ایسا کیا ہے سو ان سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہوں“ (انبیاء/۶۲-۶۳)

حضرت ابراہیمؑ کا مقصد یہ تھا کہ یہ لوگ خود اس بات پر آجائیں کہ یہ تو بات نہیں کر سکتا اس سے کیا پوچھیں انھوں نے اپنے ضمیر سے ملامت کی اور ایک دوسرے سے کہا کہ ہم سب ظالم ہیں ان کیلئے کوئی محافظ کیوں نہیں چھوڑ کر گئے سب کے سر حضرت وندامت سے جھک گئے:

﴿فَرَجَعُوا إِلَىٰ أَنفُسِهِمْ فَقَالُوا إِنَّكُمْ أَنْتُمُ الظَّالِمُونَ۔ ثُمَّ نَكَسُوا أَعْيُنَهُمْ فَذُكِرُوا بِهِمْ لَقَدْ عَلِمْتُمُ اهْوِلُوا بِأَنفُسِكُمْ﴾ ”یہ سن کر وہ اپنے ضمیر کی طرف پلٹے اور (اپنے دلوں میں) کہنے لگے واقعی تم خود ہی ظالم ہو مگر پھر ان کی مت پلٹ گئی اور بولے تو جانتا ہے کہ یہ بولتے نہیں ہیں“

(انبیاء/۶۳-۶۵)

پھر انھوں نے سراٹھائے اور ابراہیمؑ سے کہا یہ تو بات نہیں کرتا اس سے کیا پوچھیں۔ اس وقت ابراہیمؑ نے کہا کہ اس کی پرستش کرتے ہو جو نہ تمہیں فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان، آیا تم اس

چیز کی پرستش کرتے ہو جس کو تم نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے یہ کس طرح صحیح ہے کہ ایک مخلوق اپنی ہی مخلوق کے سامنے جھک جائے۔

جب ابراہیم سے دلائل و گتھگوئیں ہار گئے اور ان سے کوئی بات نہ بنی تو وہ طاقت و قدرت سے متصل ہوئے تاکہ اپنے ظفیان و سرکشی کی مدد کریں کہا کہ ایسی جگہ بنا دیں، اس میں آگ سلگائی جائے اور اس میں ابراہیم کو پھینک دیا جائے:

﴿قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْحَبِيمِ ۖ فَرَادَاهُ بِهِ كَيْدًا مِّنْهُمُ الْاَسْفَلِينَ﴾ ”انھوں نے آپس میں کہا کہ اس کیلئے ایک الاؤ تیار کرو اور اسے دہکتی ہوئی آگ کے ڈھیر میں پھینک دو انھوں نے اس کے خلاف ایک کارروائی کرنی چاہی تھی مگر ہم نے انہی کو نیچا دکھایا“ (سافات/ ۹۸۴-۹۸۵) ﴿قَالَ وَاحْزِقُوهُ وَانصُرُوا الْاَهْتَكَمَ اِنْ كُنْتُمْ فَعٰلِينَ ۚ قُلْنَا يٰۤاِسْرٰ كُوْنِي بِرَدَاۤءِ سُلْمٰعٰلٰى اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَارَادُوْا بِهِ كَيْدًا فَعَلْنٰهُمْ الْاٰخِسْرُوْنَ﴾ ”انھوں نے کہا جلاؤ الواس کو اور حمایت کرو اپنے خداؤں کی اگر تمہیں کچھ کرنا ہے ہم نے کہا اے آگ، ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیم پر۔ وہ چاہتے تھے کہ ابراہیم کے ساتھ برائی کریں مگر ہم نے ان کو بری طرح ناکام کر دیا“ (انبیاء/ ۶۸-۷۰)

اس کے تحت سب نے لکڑیاں جمع کرنی شروع کر دیں اور ایک عرصہ تک یہ لوگ لکڑیاں جمع کرتے رہے، یہاں تک کہ کہا جاتا ہے اگر کوئی عورت بیمار ہوتی تو وہ نذر کرتی تھی کہ اگر مجھے صحت ملی تو میں اتنی لکڑیاں ابراہیم کو جلانے کیلئے جمع کروں گی ان تمام لکڑیوں کو ایک میدان میں جمع کیا اور آگ لگائی گئی پھر ابراہیم کے ہاتھ پاؤں باندھ کر مخیلق میں ڈال کر اس آگ میں پھینک دیا گیا جب ابراہیم کو آگ میں پھینکا جا رہا تھا تو حضرت ابراہیم کی زبان پر یہ دعا جاری تھی: ﴿لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ

سُبْحٰنَكَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الْمُلْكُ لَا شَرِيْكَ لَكَ﴾۔

ہجرت حضرت ابراہیم علیہ السلام:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کے بارے میں گفتگو کرنے سے پہلے ضروری ہے ہم کلمہ ہجرت کے لغت اور قرآن کریم کی رو سے اس معانی اور کم و کیفیت کے حوالہ سے آشنا ہو جائیں۔

ہجر جیسا کہ راغب اصفہانی نے کہا ہے ہجر و ہجران انسان ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں یہ جدائی کبھی دل سے، کبھی زبان سے اور کبھی پورے بدن سے ہوتی ہے۔

طبری نے کہا ہجرت کا معنی ارتباط ہے قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات میں ہجرت چھوڑنے اور ترک کرنے کے معنوں میں آیا ہے:

﴿وَاٰخِرَتِيْ مِلًّا﴾ ”بس تو ہمیشہ کیلئے مجھ سے الگ ہو جا“ (مریم/۳۶) ﴿وَالرَّحْزَافُ حَرًّا﴾ ”اور گندگی سے دور رہو“ (مدثر/۵)

﴿وَالْحَرَوْنَ فِي الْمَضَاجِعِ﴾ ”خواب گاہوں میں اُن سے علیحدہ رہو“ (نساء/۳۴) ہذا بیان کو بھی ہجر کہتے ہیں کیونکہ انصاف یہ ہے کہ اس کو چھوڑا جائے جیسا کہ قرآن کو چھوڑنے والوں کے بارے میں سورہ فرقان آیت ۳۰ میں آیا ہے:

﴿هٰذَا الْقُرْآنُ مَحْجُوْرٌ﴾ ”اس قرآن کو نشانہ تضحیک بنالیا تھا“

ہجرت قلبی یعنی دل سے ارتباط یا دل سے ساتھ رہنے کو گوارا نہ کرے جیسا کہ انبیاء کرام بعثت سے پہلے دل نالان و ناراض کے ساتھ زندگی گزارتے تھے گویا وہ اس معاشرے میں ہوتے ہوئے دل سے ان سے جدا تھے چنانچہ زیارات کے فقرات میں آیا ہے کہ جاہلیت کی آلودگیاں انھیں مس نہیں کرتیں: ﴿عَصَمَكُمْ اللّٰهُ مِنَ الزَّلَلِ﴾

ہجرت زبان (زبان سے دوری کا اعلان) چنانچہ حضرت ابراہیم نے اپنے قوم سے کہا کہ میں تم سے دوری اختیار کرتا ہوں اور تمہارے اعمال سے بیزاری کا اعلان کرتا ہوں۔

ہجرت ترک جگہ جیسا کہ سورہ نساء آیت ۱۰۰ میں آیا ہے:

﴿وَمَنْ يَهِاجِرْ فَيَسِيلِ اللَّهُ﴾ ”اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کیلئے نکلے“

جہاں معاشرہ کفر و شرک میں مبتلا ہو اور دینی اعمال پر ہر قسم کی پابندیاں ہوں اور انسان خدا کی طرف دعوت نہ کر سکتے ہوں اور اپنے دین پر بھی پابند نہ رہ سکتے ہوں تو ایسی صورت میں ہجرت واجب ہو جاتی ہے اور ان حالات میں ہجرت نہ کرنے والوں کو خدا کی طرف سے وعدہ عذاب ہے:

﴿قَالُوا لِمَ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ﴾ ”کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے“ (نساء/۷۰)

ایسی حالات میں پہلے اوسط اور آخر میں ہجرت کرنے والوں کے مراتب میں فرق ہے:

﴿وَالنَّبِقُونَ الْأُولُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ﴾ ”وہ مہاجر و انصار جنہوں نے سب سے پہلے دعوت ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی“ (توبہ/۱۰۰)

ہماری گفتگو حضرت ابراہیمؑ کی آخری ہجرت کے بارے میں ہے جیسا کہ قرآن میں آیا ہے:

﴿وَقَالَ إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَىٰ رَبِّي﴾ ”ابراہیمؑ نے کہا میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں“

(عنکبوت/۲۶)

حضرت ابراہیمؑ نمرود کی آتش قبر و عذاب سے نجات حاصل کرنے کے بعد بابل چھوڑ کر سرزمین فلسطین شام کی طرف روانہ ہوئے۔ جس شہر کی شان میں خداوند عالم نے سورہ انبیاء آیت نمبر ۷۱ میں تعریف کی ہے:

﴿وَنَحْنُ لَوْ طَالَى الْأَرْضُ الَّتِي بَرَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ﴾ ”اور ہم ابراہیمؑ اور لوطؑ کو بچا کر اس سرزمین کی طرف لے گئے جسے ہم نے عالمین کیلئے بابرکت بنایا ہے“ (انبیاء/۷۱) اس طرح آیت سورہ اسراء میں بھی تعریف کی ہے:

﴿سَبِّحْهُنَّ الذِّیْ اَسْرٰی بَعْدَ لَیْلَامِنْ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بَرَكْنَا﴾ ”پاک

ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور کی اُس مسجد تک جس کے ماحول کو اُس نے برکت دی ہے“ (اسراء/۱)

اس سفر ہجرت میں حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ ایک قلیل گروہ بھی تھا:

﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ﴾ ”تم لوگوں کیلئے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں بہترین نمونہ ہے“ سورہ محمدہ آیت نمبر ۱۲ اور لوطؑ بھی ساتھ تھے:

﴿فَامِنْ لَهُ لُوطٌ وَقَالَ إِنِّیْ مُهَاجِرٌ إِلَىٰ رَبِّیْ﴾ ”اس وقت لوط ان پر ایمان لے آئے اور کہنے لگے: میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں“ (عنکبوت/۲۶)

صافات ۹۹، انبیاء ۷۱ سے ۷۳ تک اور خود انکی زوجہ محترمہ بھی انکے اس سفر ہجرت میں ساتھ تھیں لوط انکے بھائی کا بیٹا تھا اور انکا بھائی ناہور بھی ساتھ تھے۔ حضرت سارا انکے چچا حاران کی بیٹی تھی۔ دس سال بیت المقدس میں گزرنے کے بعد حضرت ابراہیمؑ اور سارہ جب وقت پیری میں پہنچے۔ تو خداوند عالم سے دعا کی جیسا کہ سورہ مبارکہ صافات ۸۹ میں ہے سارا نے جو کہ یا تسہ تھیں اپنے شوہر کو لا ولد ہونے اور اس کرب و اضطراب میں دیکھ کر اپنی کثیر ہاجرہ کو انہیں بہہ کر دیا چنانچہ خداوند کریم نے حضرت ہاجرہ کو اسماعیلؑ دیا۔ تو یہاں سے حضرت ابراہیمؑ حضرت ہاجرہ کی طرف متوجہ رہنے لگے۔

حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام اپنی قوم اور بابل کے بادشاہان کے عذاب اور مصیبتوں کو جھیلنے کے بعد خاص کر جب آپ کو منجیقوں کے ذریعے آگ میں پھینکا گیا نجات پانے کے بعد حکم خدا سے شہر بابل چھوڑنے کا ارادہ کیا کیونکہ جس جگہ خدا کی عبادت و بندگی پر پابندی ہو اور ایک نبی کی دعوت کی کوئی اثر پذیر نہ ہو بلکہ وہاں دشمن کا غلبہ ہو تو اس جگہ سے حکم عقلی کے ساتھ حکم شریعت بھی ہے کہ ہجرت کریں حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام نے ہجرت سے پہلے یہ کلمات ارشاد فرمائے:

﴿وَقَالَ إِنِّیْ ذَٰهِبٌ إِلَىٰ رَبِّیْ سَیِّدِیْ﴾ ”اور ابراہیمؑ نے کہا: میں اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں

وہ مجھے راستہ دکھائے گا“ (صافات/۹۹)

ابراہیم علیہ السلام کا بیت المقدس کی طرف سفر کرتے ہوئے شہر حران سے گذر ہوا جو عراق کے شمال میں موصل اور دیار مصر کے قریب واقع ہے یہاں کے لوگ ستارہ پرست تھے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو یہاں بھی ایک نئے انداز کی بت پرستی کا سامنا ہوا یہاں لوگ چاند ستاروں اور سورج کی پوجا کرتے تھے۔

ابراہیم اور تعمیر بیت اللہ:

سورہ مبارکہ ابراہیم سے پتہ چلتا ہے کہ بیت اللہ خدا کا یہ گھر حضرت ابراہیمؑ سے پہلے موجود تھے ﴿وَبَنَانِي اِمْكُنْت مِّنْ ذَرِيَّتِي هُوَ اِدْعِيْ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ﴾ ”پروردگار، میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس

لابساہیے“ (ابراہیم / ۳۷)

لیکن کب سے موجود ہے یہ قرآن سے ثابت نہیں ہے لیکن سورہ بقرہ آیت ۱۲۷ سے واضح ہے اس بیت کی بنیاد کو اٹھانے والے حضرت ابراہیمؑ اور ان کے معاون ان کے پہلے فرزند حضرت اسماعیلؑ ہیں:

﴿وَاذْفِرْعَ الْبَرْهِيمَ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاسْمِعِيلَ﴾ ”اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ابراہیم و اسماعیل اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے“

سورہ ابراہیم آیت ۳۷ سے واضح ہوتا ہے جس وقت حضرت ابراہیم نے اپنے فرزند اسماعیل اور ان کی ماں ہاجرہ کو اس سرزمین مکہ میں لایا تو اس گھر کے کنارے پر چھوڑا اس وقت یہ گھر ہر قسم کی آثار آبادی سے خالی تھے وہیں پر ابراہیم نے خدا کی درگاہ میں یہ دعا کی کہ لوگوں کے دلوں کو اس گھر کی طرف موڑ دے اور انہیں ثمرات و ارزاق سے نوازیں:

﴿فاجعل افئدة من الناس تهوى إليهم وارزقهم من الثمرات لعلهم يشكروا﴾ ﴿الذات القهار﴾

لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور انھیں پھلوں کا رزق عطا فرماتا کہ یہ شکر گزار بنیں۔“
 اس بیت کا ذکر قرآن کریم میں سولہ بار آیا ہے اس میں چند آیات میں خدا نے اس گھر کو اپنا گھر کہا ہے چند دیگر آیات میں لوگوں کا گھر کہا ہے اور چند آیات میں بغیر کسی نسبت سے اس کا ذکر آیا ہے اس گھر کی خصوصیت اس گھر کے بارے میں چند زاویے سے گفتگو ہے ایک اس گھر کی خصوصیات جن کا ذکر قرآن کریم میں سورہ آل عمران آیت ۹۶ میں آیا ہے:

﴿ان اول بیت وضع للناس للذى ببكة ميثا وهدي للعلمين﴾ ”سب سے پہلا گھر جو لوگوں (کی عبادت) کیلئے بنایا گیا وہ وہی ہے جو مکہ میں ہے جو عالمین کیلئے بابرکت اور راہنما ہے“ جہاں اس گھر کے معمار حضرت ابراہیم خلیلؑ ہے اور ان کے معاون حضرت اسماعیل ذبیح ہے وہاں اس گھر کی مراسم عبادت کا معاملہ بھی ابراہیم خلیلؑ ہیں ابراہیم خلیل کو قہرمان تو حید کہا جاتا ہے شاید اس کی بنیاد پر ابراہیم کے تو حید خداوندی کے راہ میں دعوت دینے میں سب سے زیادہ کردار ہے تو حید کی راہ سے شرک و بت پرستی کے دور ختم کرنے کی کوشش میں نازمرد میں گئے تمام بت اور بت پرستی کو ختم کرنے لوگوں کو تو حید کے گرد گھومنے کے لیے اس گھر کو اٹھانے والے ابراہیم خلیلؑ ہیں۔ لہذا خداوند عالم نے اس گھر کی مراسم عبادت کے معلم بھی ابراہیم خلیل کو بنایا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ دونوں اس گھر کے معمار ہیں یہ گھر بہت پہلے موجود تھا لیکن بیت کی شکل میں نہیں تھا کیونکہ اس کی دیواریں منہدم تھیں جس کے بیت ہونے پر آیات قرآنی شاہد و گواہ ہیں:

۱۔ روئے زمین میں سب سے پہلا گھر بندگان خدا کیلئے وہ ہے جو مکہ میں ہے:

﴿ان اول بیت وضع للناس للذى ببكة ميثا وهدي للعلمين﴾ ”بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کیلئے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے“ (آل عمران/ ۹۶)

۲۔ جب حضرت ابراہیمؑ حضرت اسماعیلؑ کو لائے تو یہیں اسی گھر کے کنارے پر رکھا جہاں کوئی

دیوار نہیں تھی:

﴿ربنا انی اسکت من ذریتی بواد غیر ذی ذرع عندیتک المحرم﴾

”پروردگار، میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لایا ہے“ (ابراہیم/۳۷)

۳۔ خداوند عالم نے حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کو اس گھر کا موسس و بنیاد رکھنے والا نہیں کہا بلکہ اس کے معمار یعنی تعمیر کرنے والے کہا ہے:

﴿واذترفع ابرہیم القواعد من البیت واسمعیل﴾ ”اور یاد کرو ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ جب اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے“ (بقرہ/۱۲۷)

دعائے حضرت ابراہیم علیہ السلام:

اس گھر کی تعمیر کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے درگاہ خدا میں دعائیں کیں جو کہ درج ذیل ہیں:

۱۔ خداوند الوگوں کے دلوں کو اس گھر کی طرف متوجہ کر:

﴿فاجعل افئسۃ من الناس تہوی الیہم﴾ ”لوگوں کے دلوں کو اس کا مشتاق بنا“ (ابراہیم/۳۷)

۲۔ خداوند ایہا بنے والوں کو مختلف قسم کے ثمرات کے رزق سے نواز:

﴿وارزقہم من الثمرات﴾ ”اور انہیں کھانے کو پھل دے“ (ابراہیم/۳۷)

۳۔ خداوند ہمارے اس عمل کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما:

﴿ربنا تقبل منا﴾ ”اے ہمارے رب ہم سے یہ خدمت قبول فرمائے“ (بقرہ/۱۲۷)

۴۔ خداوند اہم دونوں کو اپنی بارگاہ میں سر تسلیم ہونے والوں میں قرار دے:

﴿ربنا واجعلنا مسلمین لك﴾ ”اے رب ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیع و فرمان) بنا“

(بقرہ/۱۲۸)

۵۔ خداوند اس گھر کو امن و امان قرار دے:

﴿وَمِنْ دَحْلِهِ كَانَ امْنًا﴾ ”جو اس میں داخل ہوا وہ محفوظ ہو گیا“ (آل عمران/ ۹۷)

۶۔ خداوند مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچائے رکھنا:

﴿وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ﴾ ”اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا“ (ابراہیم/ ۳۵)

۷۔ خداوند مجھے نماز قائم کرنے والوں میں قرار دے:

﴿رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ﴾ ”اے میرے پروردگار مجھے نماز قائم کرنے والا بنا“ (ابراہیم/ ۴۰)

۸۔ خداوند ہماری دعائیں اپنی درگاہ میں قبول فرما:

﴿وَمِنَاوَقَبِلْ دُعَاءِ﴾ ”پروردگار میری دعا قبول کر“ (ابراہیم/ ۴۰)

۹۔ خداوند مجھے اور میرے والدین اور تمام مومنین کو قیامت کے روز بخش دے:

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ﴾ ”پروردگار مجھے اور میرے

والدین کو اور سب ایمان لانے والوں کو اس دن معاف کر دیجیو جبکہ حساب قائم

ہوگا“ (ابراہیم/ ۴۱)

ابراہیم اور مردوں کا زندہ ہونا:

سورہ بقرہ کی آیت ۲۶۰ کے تحت حضرت ابراہیم نے اللہ تبارک تعالیٰ سے درخواست کی میرے

مالک مجھے دکھا دے تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے استفسار کیا ”کیا تو اس پر

ایمان نہیں رکھتا تو ابراہیم نے عرض کیا:

﴿قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي﴾ ”کہا: ایمان تو رکھتا ہوں لیکن چاہتا ہوں میرے دل کو اطمینان

مل جائے“ تو خداوند عالم نے فرمایا تو چار پرندے لے اور انہیں اپنے سے مانوس کر لے اور پھر

انہیں ذبح کر کے ان کا ایک ایک ٹکڑا ایک ایک پہاڑ پر رکھ دے پھر انہیں ان کے نام سے پکارو یہ

تیرے پاس دوڑے چلے آئیں گے اللہ تعالیٰ ہر کام کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے اور اس کے ہر کام

میں حکمت بھی ہوتی ہے اس آیت کو پڑھنے کے بعد بہت سے لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہوئے اور وہ سوچنے لگے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے حضرت ابراہیم جیسے اولوالعزم پیغمبر کو معاد پر ایمان نہ ہو۔ کسی انسان کے نزدیک کسی بات یا کسی عقیدے پر ایمان ہونے اور نہ ہونے کی کسوٹی سکون قلب ہے اگر سکون قلب نہیں تو وہ حالت شک میں ہے شک میں ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ایمان نہیں رکھتا ابراہیم نے واضح کیا ہے کہ ایمان تو رکھتا ہوں مگر چاہتا ہوں میرے دل میں اطمینان پیدا ہو جائے تاکہ اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کے نفوذ کی گنجائش باقی نہ رہے عقیدہ کو عقیدہ اسی لیے کہتے ہیں کہ انسان تو حید، معاد اور نبوت جیسے مسائل کو دل سے گرہ باندھے تاکہ یہ ناقابل انحلال و انفتاق ہو جائے اور دل میں ایمان نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دل ایمان سے خالی ہے یہاں پیدا ہونے والے شبہ کے ازالہ کے لیے اس مثال پر غور کریں کسی مریض کو شفا کے لیے ڈاکٹر نے ایک گولی دی، مریض اس گولی کو اس یقین کے ساتھ کھاتا ہے اس گولی کے کھانے سے اسے شفا مل جائے گی لیکن وہ گولی کس طریقے سے بنی ہے یہ بات اسے معلوم نہیں ہے اور وہ جاننا چاہتا ہے کہ یہ گولی کس طریقے سے بنی ہے حضرت ابراہیم کا ایمان کامل ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مردوں کو دوبارہ زندہ کرے گا لیکن ابراہیم کو یہ علم نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے لہذا کیفیت میں اطمینان حاصل ہونا تکمیل اعتقاد کے لیے ضروری نہیں ہے کیونکہ عقائد کا اثبات دلائل سے ہونا ہے اور کیفیت کا اثبات عمل سے ہوتی ہے حضرت ابراہیم نے خداوند متعال سے مزید دلائل کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ یہ دیکھنے کی درخواست کی کہ عملاً مردے کس طرح زندہ ہوتے ہیں لہذا خدا نے ابراہیم کو حکم دیا وہ چار مختلف اقسام کے پرندوں کو اپنے سے مانوس کرنے کے بعد ذبح کریں اور ان کا ایک ایک ٹکڑا ایک ایک پہاڑ پر رکھ دیں اور ذبح کرنے سے پہلے ہر ایک کو اچھی طرح پہچان لیں تاکہ ان کے زندہ ہونے پر یہ اشتباہ نہ ہو کہ کوئی دوسرا پرندہ آگیا ہے مفسرین نے لکھا ہے چاروں پرندے مختلف قسموں کے تھے ان میں ایک کوا تھا، ایک طاؤس، ایک دق اور ایک کبوتر تھا ہر ایک کی شکل

دوسرے سے مختلف تھی خدا نے ابراہیم سے کہا کہ ان چاروں کو اچھی طرح دیکھنے اور پہچانے کے بعد ذبح کریں ہر ایک کا ایک ایک جز ایک ایک پہاڑ پر رکھ دیں پھر انہیں اپنے طرف بلائیں تو وہ زندہ ہو کر آپ کی طرف لوٹ آئیں گے۔ یہ طریقہ احیائے اموات ہے آیہ کریمہ سے یہ واضح نہیں ہوا کہ خداوند متعال نے ابراہیمؑ کو احیائے اموات کا یہ ایک ہی طریقہ بتانے پر اکتفاء کیا یا ابراہیم نے اسی ایک طریقہ پر عمل کیا۔

خدا نے ابراہیمؑ کو اپنا خلیل انتخاب کیا:

خلیل مادہ خلل سے ہے خلل دو چیزوں کے درمیان فاصلے یا شکاف کو کہتے ہیں خلیل کی جمع خلال ہے جیسا کہ سورہ نور آیت ۴۳ میں آیا ہے کہ بارش بادلوں کے بیچ سے نکلتی ہے:

﴿فَنُزِّلُ الْمَاءَ الْوَدْقَ يُعْرِجُ مِنْ خَلَلِهِ﴾ ”پھر آپ بارش کے قطروں کو دیکھتے ہیں کہ بادل کے درمیان سے نکل رہے ہیں“

چنانچہ خداوند عالم پیغمبر اور مسلمانوں سے خطاب کر کے فرماتے ہیں منافقین تمہارے درمیان جھوٹی اور فتنے کی باتیں چھوڑیں گے۔ اس طرح اور جگہوں پر قرآن کریم میں یہ لفظ آیا ہے:

﴿لَوْ عَصَىٰ جُوفَا فَيْكُم مَّا زَادُوكُم إِلَّا عِبَالًا وَلَا وَاعِلًا﴾ ”اگر وہ تمہارے ساتھ نکلتے بھی تو تمہارے لئے صرف خرابی میں اضافہ کرتے اور تمہارے درمیان فتنہ کھڑا کرنے کیلئے دوڑ دھوپ کرتے“ (توبہ ۴۷) ﴿وَبَعَثْنَا عَلَیْکُمْ عِبَادًا نَّالُوا بِاسْ شَدِیْدِ فَحَاسُوا عَلَی الدِّیَارِ﴾ ”ہم نے اپنے زبردست طاقتور جنگجو بندوں کو تم پر مسلط کیا پھر وہ گھر گھر گھس گئے“ (اسراء ۵۵) اس مادے سے خلا مودت و دوستی کے معنی میں آتا ہے۔ صاحب مجمع البیان نے خلا کے معنی مودت خالص کیا ہے کیونکہ محبت و دوستی انسان کے دل کے وسط میں جگہ بناتی ہے یا نفس کو شکاف کر کے اس میں اثر رکھتی ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ خلیل دوستی کے معنوں میں مندرجہ ذیل آیات میں آیا ہے:

﴿وَلَا خَلَّةَ وَلَا شُفَاعَةَ﴾ ”اور نہ دوستی کا فائدہ ہوگا اور نہ سفارش چلے گی“ (بقرہ/۲۵۳)
 ﴿إِنَّ يَوْمَ لَإِيعَادٍ فِيهِ وَلَا خُلَّةَ﴾ ”اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ سودا ہوگا نہ دوستی
 کام آئے گی“ (ابراہیم/۳۱)

کافر منافقین اپنے لیے قیامت کے دن دوست نہ بنانے پریشان ہوں گے:
 ﴿يُوَلِّتُنِي لِئَنِّي لَمْ اتَّخِذْ لَكَ خَلِيلًا﴾

”ہائے تباہی! کاش میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا“ (فرقان/۲۸) نہ، ۱۲۵
 بعض دوست قیامت کے دن ایک دوسرے کے دشمن بنیں گے:

سورہ زخرف آیت ۲۷، صاحب تفسیر کبیر شعر اوی کہتا ہے اس آیت سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم
 نے حضرت ابراہیمؑ کو خصوصی طور پر دوستی کے لیے انتخاب کیا ہے۔ کیونکہ دوستی میں بہت سے افراد
 شریک ہو سکتے ہیں جب کہ خداوند عالم فرماتا ہے جب خلوت میں اپنے ساتھیوں سے ملتے ہیں:
 ﴿وَاللّٰهُ مَعْرُجٌ مَا كُنْتُمْ تَكْمُلُوْنَ﴾ ”لیکن جو بات تم چھپا رہے تھے اللہ اسے ظاہر کرنے
 والا ہے“ (بقرہ/۷۲)

خدا صابریں سے دوستی کرتا ہے:

﴿وَاللّٰهُ يَحِبُّ الضَّعِيفِينَ﴾ ”اللہ تو صابروں کو دوست رکھتا ہے“ (آعران/۱۳۶)
 خدا محسنین سے محبت کرتا ہے:

﴿وَاللّٰهُ يَحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ ”اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے“ (آعران/۱۳۸)
 خدا عدالت کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے:

﴿وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ إِنَّ اللّٰهَ يَحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ ”اور اگر آپ فیصلہ
 کرنا چاہیں تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیں بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست
 رکھتا ہے“ (آعران/۳۲) لیکن خداوند عالم نے ابراہیمؑ کا نام لے کر فرمایا کہ خدا نے ابراہیمؑ کو اپنا

خلیل منتخب کیا ہے۔

شعراوی کہتے ہیں کہ کلمہ خلیل اس راستے کو کہتے ہیں کہ جو ریت میں ہوتا ہے جیسے ہم عربی میں مدک کہتے ہیں مدک ہمیشہ ایک تنگ راستہ ہوتا ہے چنانچہ جہاں دو انسان ایک ساتھ ایک ہی راستہ پر چلیں گے انھیں خلیل کہتے ہیں گویا دونوں ایک دوسرے میں گھس گئے ہیں اور ایک دوسرے کے خلل کو پر کھتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور مجادلہ ملائکہ:

دین اسلام جو کہ تمام انبیاء و مرسلین کا دین ہے یہ مسلمات فطری اور عقل کے اصولوں پر قائم ہے اس دین مبین میں زمان و مکان کے گزرنے سے تغیر و تبدل نہیں آتا اسی اصول کے تحت ہم یہاں حضرت ابراہیم کے مجادلہ کا ذکر کریں گے۔

حضرت ابراہیمؑ کے دوران نبوت و رسالت میں کئے گئے چار مجادلوں کا ذکر قرآن میں آیا ہے:

۱۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے چچا آذر سے مجادلہ کیا ہے۔

۲۔ آپ نے اپنی قوم سے مجادلہ کیا ہے۔

۳۔ وقت کے بادشاہ نمرود سے مجادلہ

۴۔ ملائکہ سے مجادلہ کیا جب ملائکہ قوم لوط پر عذاب نازل کرنے کے لئے آئے تھے۔

یہاں پر ہم چوتھے مجادلے کے بارے میں گفتگو کریں گے:

حضرت ابراہیمؑ کے پاس تین مرد آئے تو حضرت ابراہیمؑ ان کی خدمت کی طرف متوجہ ہوئے کیونکہ آپ مہمان نوازی کو بہت پسند کرتے تھے اس لئے ایک صہتمند چھڑا ذبح کیا اس کو کاٹ کر کباب بنا کر ان مہمانوں کے سامنے رکھا لیکن جب انھوں (مہمانوں) نے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھائے تو ابراہیمؑ ان کی طرف سے خوف زدہ ہو گئے اور ان سے سوال کیا تم کون ہو تو انھوں نے جواب دیا ہم خدا کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں ہم اہل سدوم و عمور پر عذاب نازل کرنے کیلئے

بڑھیا ہوں اور یہ میرے میاں بھی بوڑھے ہیں؟ یقیناً یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ انھوں نے کہا: کیا تم اللہ کے فیصلے پر تعجب کرتی ہو؟ تم اہل بیت پر اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں۔ یقیناً اللہ قابل ستائش بڑی شان والا ہے۔ پھر جب ابراہیم کے دل سے خوف نکل گیا اور انھیں خوشخبری بھی مل گئی تو وہ قوم لوط کے بارے میں ہم سے بحث کرنے لگے بے شک ابراہیم بردبار نرم دل اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ (فرشتوں نے ان سے کہا) اے ابراہیم! اس بات کو چھوڑ دیں بے شک آپ کے رب کا فیصلہ آچکا ہے اور ان پر ایک ایسا عذاب آنے والا ہے جسے ٹالا نہیں جاسکتا۔“ (ہود/ ۶۹-۷۰) ذاریات ۲۳-۳۱۔

قصہ ابراہیم میں عبرتیں:

۱۔ اگر انسان میں عقیدہ حق نفوذ کر جائے تو یہ انسان کی فکر پر بھی حاکم ہوتا ہے اور اس کے دل کا احاطہ کرتا ہے ایسے حالات میں انسان کیلئے آگ، تور، ہر قسم کی اذیت سے گزرنا آسان ہو جاتا ہے لیکن اس کے لئے عقیدہ سے برگشت ممکن نہیں ہوتی۔ حضرت ابراہیمؑ اس میدان میں اقوام و مل کیلئے پہلی ضرب المثل چھوڑنے والوں میں سے ہیں۔

۲۔ حضرت ابراہیمؑ کا انقلاب بت و بت پرستی کی ایک گفتگو تک محدود نہیں تھا بلکہ یہ ایک انقلاب عمل تھا لہذا آپؑ نے بتوں کو پاش پاش کیا پھر اسی عمل کو ان سے گفتگو کرنے کا وسیلہ بنایا یہاں تک کہ انھیں ساکت و خاموش کیا بت پرست ان کے مقابلے میں انتہا پسندی اور قتل کرنے کی حد تک آگے بڑھے جس کے نتیجے میں حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینک دیا گیا۔

۳۔ حضرت ابراہیمؑ اپنی گفتگو میں اپنے مدعا کو ثابت کرنے کیلئے کسی قسم کا طریقہ وضع کرنے میں نرمی و سہل انگاری سے کام نہیں لیتے تھے اسی طرح ستاروں کی مدد سے جب انھیں سمجھایا کہ آسمان کے ستارے خدا بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اس گفتگو میں پہلے مرحلہ میں ان سے

برائت کا اعلان نہیں کیا بلکہ انھیں بت پرستی ثابت کرنے میں عاجز کیا اور کہا کہ کوئی بھی بت پرستی کے لائق نہیں ہے۔

۴۔ حضرت ابراہیمؑ اس بات کے اہل تھے کہ جہاں خدا نے ان کی شان میں فرمایا کہ ہم نے اپنی دلیل ابراہیمؑ کو دی ہے تاکہ قوم کے مقابلے میں دلیل سے بات کر سکیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے وقت کے بادشاہ سے بغیر خوف و تردد کے بات کی جس سے بادشاہ کو دلائل میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

۵۔ حضرت ابراہیمؑ رحمہ اللہ اور رفیق القلب تھے یہ چیز اس وقت ظاہر ہوئی جب آپؑ سے آزرنے کہا کہ ”تم اپنی دعوت سے باز نہ آئے تو تمہیں سنگسار کر دیں گے ہم سے دور ہو جاؤ“ تو حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا: ابا جان! میرا سلام ہو آپؑ پر میں آپؑ کیلئے خدا سے مغفرت کی دعا کروں گا میرا خدا مغفرت کرنے والا ہے۔

۶۔ انسان جب حق پر ایمان لائے اور اس کا دل مطمئن ہو جائے تو اس کا نتیجہ اطاعت و بندگی ہے جب خدا نے حضرت ابراہیمؑ سے نیند میں بیٹے کی قربانی طلب کی تو ابراہیمؑ نے رضائے خدا کو مقدم رکھا اور بچے کو ساتھ لے کر میدان میں آ گئے۔

۷۔ حضرت ابراہیمؑ بہت مہمان نواز تھے اپنے مہمانوں کی خدمت کرنے کیلئے گھر تک محدود نہیں بلکہ بیابان میں بھی مہمان نوازی کرتے تھے۔

۸۔ نفس ابراہیمؑ ہمیشہ تحقیق طلب تھا آپؑ ہمیشہ حقائق کو حقائق سے سمجھنا جانتے تھے لہذا آپؑ نے خدا سے درخواست کی انھیں ان حقائق سے آگاہ کیا جائے کہ مُردے کیسے زندہ ہوتے ہیں

۹۔ حضرت ابراہیمؑ اواخر خدا کو نافذ کرنے کیلئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے:

﴿اذ قال له ربه اسلم قال اسلمت لرب العلمین﴾ ”اُس کا حال یہ تھا کہ جب اس کے رب

نے اس سے کہا: مسلم ہو جا تو فوراً کہا میں مالک کائنات کا مسلم ہو گیا“ (بقراءہ ۱۳۱)

(کتاب قصص الانبیاء تالیف عبدالوہاب بخاری صفحہ ۱۱۶)

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر قرآن کریم میں:

نام سورہ	سورہ نمبر	آیات نمبر
البقرہ	۲	۱۲۵، ۱۲۷، ۱۳۳، ۱۳۶، ۱۴۰
آل عمران	۳	۸۴
النساء	۴	۱۲۳
الانعام	۶	۸۶
ابراہیم	۱۴	۳۹
مریم	۱۹	۵۴
الانبیاء	۲۱	۸۵
ص	۳۸	۴۸

حضرت ابراہیم سرزمین بابل کو چھوڑ کر اپنی بیوی سارا اور برادر زادے لوط کے ساتھ کلدانیوں کے شہر کی طرف گئے اور وہاں سے حران (فلسطین) کی طرف گئے حضرت ابراہیم اور حضرت سارا ایک عرصہ قناین کے علاقہ میں رہے جب وہاں خشک سالی آئی تو مصر کی طرف رخ کیا اس وقت وہاں پر رعات عمالک ہیکسوس کی حکومت تھی۔ حضرت سارہ کی عمر ستر سال سے زائد تھی یعنی وہ بچہ جننے کے قابل نہیں تھیں۔ انھیں بادشاہ مصر کی طرف سے ایک کنیز دی گئی جس کا نام ہاجرہ تھی حضرت سارا نے حضرت ابراہیم کی نسل کو ختم ہوتے اور خود کو بھی بانجھ پایا تو انھوں نے ہاجرہ کو ابراہیم کو بخشا یہاں حضرت ابراہیم نے درگاہ خدا میں دعا کی:

﴿رب هب لی من الصالحین﴾

”پروردگار! مجھے صالحین میں سے (اولاد) عطا کر“ (صافات/۱۰۰)

سورہ مریم ۵۴ میں خداوند عالم نے اسماعیل علیہ السلام کو وعدہ کو بچ کر دکھانے والا کہا ہے:

﴿وَإِذْ كَرَّمْنَا الْكَتُبَ اسْمُعِيلَ أَنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا﴾ ”اور اس کتاب میں اسماعیل کا ذکر کیجئے وہ یقیناً وعدے کے سچے اور نبی مرسل تھے“

حضرت اسماعیل کی ولادت کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے حضرت سارا کی خواہش پر آپ کے فرزند حضرت اسماعیل کو شہر بیت المقدس سے نکال کر سرزمین مکہ بیت اللہ کی جوار میں چھوڑ کر درگاہ خداوندی میں یوں دعا کی:

﴿رَبَّنَا انِّى اسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ﴾ ”اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو تیرے محترم گھر کے نزدیک ایک بخر وادی میں بسایا ہمارے پروردگار! تاکہ یہ نماز قائم کریں لہذا تو کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور انھیں پھلوں کا رزق عطا فرما تاکہ یہ تیرے شکر گزار بنیں“ (ابراہیم/۳۷)

اس وقت سرزمین مکہ میں نہ پانی نہ کوئی سایہ تھا ان کے پاس ایک بوری یا تھیلا رکھا جس میں کھجور اور تھوڑا سا پانی تھا ان دونوں کو چھوڑ کر ابراہیمؑ نے واپسی کی طرف توجہ کی تو ہاجرہ نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا آپ کہاں جاتے ہیں آپ ہمیں ایسی وادی میں چھوڑ رہے ہیں جہاں نہ انسان ہے نہ کوئی چیز دو تین بار تکرار کیا لیکن ابراہیمؑ نے جواب نہیں دیا آخر میں ہاجرہ نے کہا یہ خدا کا حکم ہے تو ابراہیمؑ نے کہا ہاں یہ خدا کا حکم ہے ہاجرہ نے کہا تو پھر خدا ہمیں ضائع نہیں کرے گا پھر ابراہیمؑ واپس آگئے ہاجرہ کی نظروں سے جب ابراہیمؑ اوچل ہونے لگے تو انھوں نے اس طرح دعا جیسا کہ سورہ ابراہیم آیت ۳۷ ہاجرہ نے اپنے بچے کو دو دوہ پلایا وہ پانی بھی پلایا پانی ختم ہوا تو خود اور بچے کو پیاس لگ گئی۔

(قصص قرآن جلد ۱۲ صفحہ نمبر ۹۴)

حضرت اسحاق و حضرت اسماعیل علیہما السلام آیات قرآن کی روشنی میں:

سورہ کا نام	سورہ نمبر	آیات نمبر
البقرہ	۲	۱۳۰، ۱۳۶، ۱۳۳
آل عمران	۳	۸۴
النساء	۴	۱۶۳
الانعام	۶	۸۴
ہود	۱۱	۷۱
یوسف	۱۲	۲۸، ۶
ابراہیم	۱۴	۴۹
مریم	۱۹	۴۹
الانبیاء	۲۱	۷۲
العنکبوت	۲۹	۲۹
الصفات	۳۷	۱۱۳، ۱۱۲
ص	۳۸	۴۸

حضرت اسحاق علیہ السلام

آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے فرزند ہیں۔ حضرت ابراہیم اور حضرت سارہ جب بڑھاپے تک پہنچے اور انکی عمر ایسی تھی اب اور اولاد پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن خداوند عالم نے انھیں اس وقت اولاد کی بشارت دی جیسا کہ سورہ ہود ۷۲ میں ذکر ہے:

﴿و امرتہ قائمۃ فاضکحت فیشرئھا باسحق ومن وراء اسحق یعقوب﴾

”اور ابراہیم کی بیوی کھڑی تھیں پس وہ ہنس پڑیں تو ہم نے انھیں اسحاق کی اور اسحاق کے

بعد یعقوب کی بشارت دی۔“

ملائکہ جب قوم لوط کو غرق کرنے کیلئے آئے تو حضرت ابراہیمؑ کے پاس گئے اور انھیں سلام کیا ابراہیم بہت مہمان نواز تھے لہذا فوراً ہی اٹھے اور انکے لیے پکھڑے کا بھنا ہوا گوشت لے کر آئے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ مہمان ہاتھ آگے نہیں بڑھا رہے تو پریشان ہوئے کیونکہ مہمان گھر میں آئے اور کھانا نہ کھائے اسکی کیا وجہ ہے۔ تو ملائکہ نے حضرت ابراہیمؑ سے فرمایا آپ پریشان نہ ہوں ہم خدا کی طرف سے قوم لوط کیلئے عذاب لیکر آئے ہیں۔ حضرت سارا جو دروازہ پر کھڑے تھیں ہنس پڑیں کیونکہ انھیں خوشی ہوئی کہ ایسی قوم پر خدا کا عذاب نازل ہوگا لیکن جب انھوں نے انھیں اسحاق اور پھر یعقوب کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی تو انھوں نے اپنے ہاتھ اپنے منہ پر مار کر کہا کیا میں جو ایک بوڑھی ہوں اور میرے شوہر بھی بوڑھے ہیں ہمارے ہاں اب اولاد پیدا ہوگی فرشتوں نے جواب دیا کہ تم خدا کی رحمت پر تعجب کرتے ہو۔ سورہ صود ۶۹ سے ۷۳۔

اس حوالے سے سلسلہ انبیاء میں حضرت اسحاق اور یعقوب بھی ایک غیر عادی طریقہ سے پیدا ہوئے ہیں۔

ان آیات میں خداوند عالم نے حضرت اسحاق کو غلامِ علیم کا لقب دیا ہے:

﴿قَالُوا لَا تَوْحَلْ إِنْ مَنِشْكَ عِلْمٌ﴾ ”کہنے لگے: آپ خوف نہ کریں ہم آپ کو ایک دانائے کے کی خوشخبری دیتے ہیں“ (حجر/۵۴) ﴿وَبَشِّرْهُ بِغُلَامٍ عِلْمٍ﴾ ”اور انھیں ایک دانائے کے کی بشارت دی“ (ذاریات/۲۸) صافات ۱۱۳۔

سورہ صود ۷۱ سے ثابت ہوتا ہے خداوند عالم نے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت سارا کو حضرت اسحاق اور یعقوب کی بشارت دی ہے:

﴿وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ﴾

”اور ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاق اور یعقوب عنایت کیے“ (انعام/۸۵) ابراہیم ۳۵ سے ۳۶۔

فرزندان حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام

حضرت ابراہیم خلیل اپنے بڑھاپے کی عمر میں اولاد سے یاس و ناامیدی ہونے کے بعد جس کی تصریح قرآن کریم نے ان کے زبان سے نقل کیا ہے ان کا صاحب اولاد ہونا اور اولاد بھی ان کے دعاؤں کا ثمر ہونا یہ دونوں باتیں خدا پرستان اور خدا جو یا نوں کیلئے نمونہ کامل ہے جس کی تفصیل بعد میں بیان کریں گے آیات قرآن کریم کے مطابق خداوند عالم نے انھیں دو فرزندوں کی بشارت دی اور ان کے نسل سے ایسے انبیاء پیدا کئے ہیں جن سے روئے زمین کو تو حید و خدا پرستی کی وزن ثقل کے ساتھ زینت بخشی ہے، یہ دونوں فرزند آپ کی الگ الگ بیویوں سے پیدا ہوئے ہیں ان دونوں زوجات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے ورنہ صفحات ناقص رہیں گے۔

ان دونوں نبی اور نبی زاد کی حیات کو پیش کرنے سے پہلے ہر ایک کی والدہ طاہرہ کی حیات کو پیش کریں گے۔

سارہ و ہاجرہ

ایک فرزند کی ماں ہاجرہ ہے کہا جاتا ہے ہاجرہ پہلی بیوی کی کنیز تھی انھوں نے اپنی کنیزہ کو اپنے شوہر کیلئے نسل کی خاطر انھیں بہہ کیا۔ جس سے حضرت اسماعیل ذبح پیدا ہوئے اسی اسماعیل سے روئے زمین پر زب و زینت مہر انبیاء پیدا ہوئے یہ اس زوجہ کیلئے باعث افتخار ہے لیکن یہ دوسری زوجہ پہلی بیوی (سارہ) کی بہہ کردہ کنیزہ ہونے کے بارے میں قرآن کریم میں کوئی تصریح اشارہ نہیں ملتا لیکن جو سلوک حضرت ابراہیم خلیل صاحب شریعت عظمیٰ کے مالک نے اس زوجہ کے ساتھ روا رکھا، اسے اپنے گھر بار اور وطن سے دور دشت بے آب و گیاہ زمین پر نومو لو د بچے کے ساتھ تنہا چھوڑا اس آیت کریمہ کے سراسر خلاف نظر آتا ہے جہاں خداوند عالم نے خطاب کیا ہے اگر بیوی کے درمیان عدالت نہیں کر سکتے ہو تو ایک بیوی پر اکتفا کرو۔ تو ابراہیم نے ایک کی خوشنودی کی

خاطر دوسری بیوی کو طلاق و زوجیت کے درمیان میں بغیر کسی سہارے چھوڑا ایسا کرنا ایک ادنیٰ سے دیندار سے روانہ نہیں بلکہ بے دینوں سے بھی روانہ نہیں سمجھا جاتا۔ چہ جائے کہ ابراہیم خلیلؑ سے ہو لیکن نص آیہ قرآن کے تحت ابراہیم نے اس زوجہ کے ساتھ یہ سلوک کیا یقیناً ابراہیم اس زوجہ سمیت پہلی زوجہ کے احسان مند ہو گئے۔ اسی وجہ سے خداوند متعال نے اپنے خلیل کو ان کی رضایت کا پاس رکھنے کا حکم دیا۔

پہلی زوجہ سارہ بنت حاران ابن باخور (حضرت ابراہیمؑ کے چچا) کی بیٹی ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کی دعوت توحید میں ان کے ساتھ تھی ایسے ہی جیسے حضرت خدیجہ الکبریٰ نے خاتم الانبیاءؐ کا ساتھ دیا۔ حضرت سارہ کی اس احسان مندی کی وجہ سے خداوند متعال نے بیک وقت سارہ کی نسل سے دونوں کو پیدا کرنے کی بشارت دی یعنی حضرت اسحاقؑ و حضرت یعقوبؑ، جبکہ حاجرہ کو اپنی احسان مندی فراموش نہ کرنے، اپنے شوہر خلیل رحمان کی اطاعت میں سر تسلیم ہونے پر ان کے فرزند اسماعیلؑ کی اولاد سے خاتم الانبیاءؐ کو پیدا کیا۔ حضرت خدیجہ کو حضرت محمدؐ کی دعوت میں غربت کے عالم میں شریک دعوت بننے پر حضرت زہرا سلام اللہ علیہا اور ان کے فرزندان عصمت و طہارت عنایت کئے۔

دونوں فرزندوں کے نام گرامی

۱۔ اسماعیل: اسماعیل کے نام سے قرآن کریم میں دو تہذیبوں کا ذکر ملتا ہے:

(۱) اسماعیل بن ابراہیم ہے جن کا ذکر قرآن کریم کے ان آیات میں آیا ہے:

﴿وَعَهْدًا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَنَّ مَلَكًا مِنَّا يَذْكُرُ لَهُمْ السُّبْحَانَ وَلِلْطَّافِينَ وَالْعَاقِبِينَ وَالرَّكْعَ السُّجُودَ﴾

”اور ہم نے اور ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ پر یہ ذمہ داری عائد کی کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف“

احکاف رکوع اور سجدہ کرنے والوں کیلئے پاک رکھو“ (نور ۱۲۵، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰) آل عمران ۸۳، نساء

۱۶۳، ابراہیم ۳۹۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام وہ جستی ہیں چنکاؤ کر خداوند کریم نے اپنی کتاب میں حضرت ابراہیم خلیل کے ساتھ ساتھ کیا ہے:

﴿وَعَهْدُنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ﴾ ”اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل پر یہ ذمہ داری عائد کی“ (بقراءہ) ۱۳۵، ۱۳۹، ۱۳۳، ۱۳۶، ۱۴۰) آل عمران ۸۳، نساء ۱۶۳، انفصام ۸۶۔

(۲) دوسرے اسماعیل انبیاء بنی اسرائیل میں سے تھے جنکا ذکر قرآن کریم کے ان آیات میں آیا ہے:

﴿وَاسْمِعِ الْيَسَعَ وَيُونُسَ وَلُوطًا وَكُلًّا فَضْلًا عَلَى الْعَالَمِينَ﴾ ”اور اسماعیل، یسع، یونس اور لوط سب کو عالمین پر فضیلت ہم نے عطا کی ہے“ (انعام/۸۷) انبیاء/۸۵ ص ۱۲۸، ان آیات میں مذکورہ اسماعیل سابق آیات میں مذکور اسماعیل سے مختلف ہیں کیونکہ سابق اسماعیل ابراہیم کے فرزندوں میں سے ہیں وہ اولاد یعقوب نہیں تھے بلکہ وہ حضرت یعقوب کے چچا تھے جبکہ سورہ مریم کی آیات ۵۸ تا ۶۱ کے تحت آٹھ پیغمبروں کے بعد ذکر ہوا ہے یعنی ان چار انبیاء کی اولاد ہے

بعض نے دوسرے اسماعیل کا نام اسماعیل بن حزقیل کہا ہے۔ حضرت اسماعیل بن ابراہیم کو سورۃ مریم آیات ۵۴، ۵۵ میں ”صادق الوعدہ“ کہا ہے روایت میں اسے دوسرے اسماعیل قرار دیا ہے بعض آیات قرآنی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ نام کے دو پیغمبر تھے جن میں سے ایک وہ اسماعیل بن حضرت ابراہیمؑ ہیں کہ جو زنج ہوئے اور چنکا ہمیشہ ابراہیمؑ اور اسحاق کے ساتھ ذکر ہوا ہے اور ایک دفعہ صادق الوعدہ کہہ کر ان کا ذکر ہوا ہے لیکن سورۃ مبارکہ انعام کی آیات نمبر ۸۶-۸۷ اور سورۃ مبارکہ ص آیات نمبر ۴۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور اسماعیلؑ بھی ہیں چنانچہ سورۃ مریم میں اسماعیلؑ کا انبیاء بنی اسرائیل کے ساتھ ذکر ہوا ہے حضرت اسماعیلؑ کی صفات قرآن کریم میں یوں بیان ہوئی ہیں سورۃ بقرہ آیت نمبر ۱۳۶ سورۃ عمران آیت نمبر ۸۴ اور سورۃ نساء آیت نمبر ۱۶۳ میں حضرت اسماعیلؑ کا حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسحاق کے درمیان ذکر ہوا ہے۔

۲۔ ”مرضی“ یعنی خدا ان سے راضی ہے:

﴿.....وكان عندربه مرضياً﴾ ”.....اور وہ اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھے“ (مریم/۵۵، ۵۶)

۳۔ صابرين میں سے ہیں:

۴۔ صالحين:

﴿انهم من الصالحين﴾ ”یقیناً یہ صالحین میں سے تھے“ (انبیاء/۸۶)

۵۔ حلیم:

﴿فبشرته بغلام حلیم﴾ ”چنانچہ ہم نے انھیں ایک بردبار بیٹے کی بشارت دی“ (صافات/۱۰۱)

۶۔ اخیار:

﴿.....وكل من الاخيار﴾ ”.....یہ سب نیک لوگوں میں سے ہیں“ (س/۴۸)

وفات حضرت ابراہیم:

حضرت ابراہیم کا قرآن کریم میں کثرت سے ذکر ہونے، ان کے اولی العزم اور عظیم المرتبت پیغمبر ہونے کے باوجود قرآن کریم میں کہیں بھی نہ تو ان کی تاریخ پیدائش کا کوئی ذکر ہے اور نہ ہی یہ بتایا گیا ہے انہوں نے اس دار فانی سے کتنے برس کی عمر میں کوچ کیا اگرچہ موجودہ تورات میں ان کی عمر ایک سو پچھتر (۱۷۵) سال بیان ہوئی ہے۔ لیکن تورات میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم مکفیلہ مزرعہ عفرون بن صرصر لُحی میں حضرت اسماعیل اور اسحاق نے دفنایا یہیں پر سارہ بھی مدفن ہیں اعداد بن ابراہیم ان کی بیوی کا نام قطورئی ہے ان سے یہ اولادیں پیدا ہوئی ہیں:

۱۔ زمران

۲۔ یقشان

۳۔ مدان

۴۔ مدیان

۵۔ یشبان

۶۔ شوخا

اس وقت فلسطین کی حبروں نامی جگہ میں دفن ہیں اس وقت اسے مدینہ خلیل کہتے ہیں قرآن کریم میں حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کے سلسلے میں صرف حضرت اسمعیلؑ و اٰلِہٖٓسَلٰٓمٌ وَاٰلِہٖٓسَلٰٓمٌ کا ذکر ہے لیکن تورات میں لکھا ہے کہ ان کی اور بھی اولاد تھی۔

حضرت اسحاقؑ:

جیسا کہ آیات کریمہ میں آیا ہے حضرت ابراہیمؑ اور ان کی زوجہ جب اپنی عمر کی آخری دور میں داخل ہو چکے تھے اور حضرت سارہ کی عمر نوے سال ہو چکی تھی تو ان کے ہاں بچے کی ولادت کے آثار نمودار ہوئے اور بچے کی پیدائش کے بعد ان کی والدہ نے اس کا نام یسحق رکھا جسے عربی میں یسحق کہتے ہیں یعنی حضرت اسحاقؑ کی والدہ نے ان کی پیدائش پر یہ تصور کیا جو بھی اتنے بوڑھے والدین کے ہاں بچے کی پیدائش کی خبر سنے گا، وہ اس خبر کو سن کر ہنسے گا اس لیے اس بچے کا نام اسحاق رکھا گیا جسے عبرانی میں یسحق کہتے ہیں اور اس کے عربی معنی یسحق یعنی ”ہنسا“ ہیں۔

حضرت اسحاقؑ نے ایک سو اسی (۱۸۰) سال کی عمر پائی۔ ان کی قبر مغارہ مدفیلہ میں ہے جسے آج کل مدینہ خلیل کہتے ہیں حضرت اسحاقؑ کا اسم گرامی سترہ بار قرآن کریم میں تکرار ہوا ہے لیکن ان کا نام ہمیشہ ہی حضرت اسمعیلؑ کے نام کے بعد آیا ہے جس وقت حضرت اسمعیلؑ قربان ہوئے، اس وقت حضرت اسحاقؑ پیدائش ہوئے تھے موجودہ تورات نے یہ کوشش کی ہے کہ سورہ صافات میں جس فرزند ابراہیمؑ کے ذبح کا ذکر ہوا ہے وہ اس کی بجائے حضرت اسحاقؑ کو ذبح ہوتے ہوئے دکھائیں اور لوگوں کے ذہنوں میں یہ بٹھانے کی کوشش کریں کہ حضرت اسمعیلؑ نہیں بلکہ حضرت اسحاقؑ ذبح ہوئے تھے کیونکہ قوم بنی اسرائیل حضرت اسحاقؑ کی نسل سے پھیلی ہے لیکن تمام قرآن و

شواہد اور آیات قرآنی حضرت اسماعیلؑ کے ذبح ہونے کے بارے میں ہیں۔

ہم سیرت طیبہ ابراہیمؑ بت شکن پر قلم اٹھاتے ہوئے سر شرم سے جھک جاتا ہے، کیونکہ جو رویہ حضرت ابراہیمؑ خلیل نے بتوں اور بت پرستوں کے ساتھ اپنایا اسکی تائیدی و پیروی کرنا ہمارے لئے مختلف وجوہات کے تحت ممکن نہیں۔ چنانچہ ہم ابراہیمؑ خلیل اور انکے پیروکاروں سے اس کوتاہی پر معذرت پیش کرنے سے پہلے ان وجوہات کے بیان کو ضروری سمجھتے ہیں۔ جس بت پرستی کا ابراہیمؑ خلیل اور دیگر انبیاء کرام کو سامنا تھا، وہ بت پرستی آج کل کی بت پرستی سے چندین حوالوں سے فرق رکھتی ہے۔

۱۔ اس وقت کے بت مختلف شکل و صورت میں ہونے کے باوجود ایک قدر مشترک کے حامل تھے۔ وہ سب مادے سے بنے تھے۔ جبکہ اس دور میں بتوں کی مختلف انواع و اقسام ہیں۔ یہاں ایک بت سے جان چھڑانا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کسی دوسرے بت سے وابستگی قائم نہ کی جائے۔

۲۔ اس وقت کے بت پرستوں نے کہا ہم اپنے بتوں سے دستبردار نہیں ہو گئے، یعنی وہ بتوں کو بت سمجھتے تھے۔ جبکہ آج کل کے بت پرست اپنی بت پرستی کو عین دین خدا سمجھتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے نہ یہ بت پرستی ہے اور نہ ہی وہ بت پرست ہیں۔ یہاں سوال ہے اگر کوئی ایسے حالات میں انکی مخالفت کرے تو وہ کوئی زبان اور لہجہ استعمال کرے گا۔

لہذا ہمارے لئے حضرت ابراہیمؑ خلیل کا وہ فیصلہ سامنے رہ جاتا ہے، جہاں آپ نے فرمایا میں تم اور تمہارے بتوں سے بیزاری کا اعلان کرتا ہوں، میں اپنے رب کی طرف ہجرت کر رہا ہوں۔ لہذا اس وقت ندا تو حید، عمل و زبان سے ممکن نہیں، ہم صرف دل میں ہی انکے خلاف نفرت رکھ سکتے ہیں، اسے لیکر اپنے گھروں کے تہہ خانوں میں بیٹھ سکتے ہیں۔ یہاں اگر کوئی کھلی فضا کا خواہشمند ہے، تو اسے اس دنیا سے کوچ کرنے کیلئے خدا سے دعا گو ہونا چاہئے۔

کلمات اختتامیہ

اس کتاب شریف کے اختتامی کلمات میں سورہ مطففین کی آیت ۲۶ کے کلمہ ”ختم مسک“ سے متمسک ہوتے ہیں:

﴿عِظْمُهُ مَسْكٌ، وَفِي ذَلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ﴾ جس پر مشک کی مہر لگی ہوگی اور سبقت کرنے والوں کو اس امر میں سبقت کرنی چاہئے۔

ختم مسک ایک ایسے اختتام کو کہتے ہیں جس کا انجام طیب و طاہر خوشبو سے ہوتا ہے۔ ختم مسک و غیر مسک میں امتیاز و فرق رکھتے ہوئے خداوند عالم فرماتے ہیں، ختم مسک میں اہل اللہ مقابلہ و مسابقت میں حصہ لیتے ہیں۔ اور اسی طرح ختم غیر مسک میں اہل دنیا حصہ لیتے ہیں۔ ختم مسک ایک ایسی خوشبو ہے جس کی تلاش میں اہل اللہ ہوتے ہیں۔ جیسا کہ سورہ اعراف آیت ۷۰ اور زخرف ۴۳ میں آیا ہے، ختم غیر مسک وہ اختتام ہے جو بدبودار ہے۔

اس کے مقابل میں ”ختم غیر مسک“ جس کا معنی دنیا طلبی و دنیا داری ہے۔ اس میں مقابلہ و مسالہ کرنے والے اہل دنیا ہیں، ان کا مطلوب و مقصود عیش و نوش دنیا ہے۔ ان کی اڑان کی آخری منزل اور ہدف و نشانی زندگانی اہل مغرب ہے۔ اس مسابقت میں شامل ہونے والوں کے وسائل و ذرائع اور شرائط و درج ذیل ہیں:

۱۔ مغربی زبان ۲۔ مغربی ٹیکنالوجی ۳۔ مغربی صنعت ۴۔ مغربی اقدار ۵۔ مغربی سکونت

۶۔ مغربی بینک اکاؤنٹ ۷۔ خود مغربی ہونا

ایسی شرائط میں سبقت لیجانے والے ہی اس مقابلے میں کامیاب قرار پاتے ہیں۔ اس مقابلہ

دنیا پرستی میں شریک ہونے والوں کا انجام قارئین نے دیکھا ہے، ان کے کھاتے میں سوائے چند دنوں کی خورد و نوش کے اور کچھ بھی نہیں آیا۔ مولا امیر المومنین کے فرمان کے مطابق ان کی قیمت وہی ہے جو اس خورد و نوش کے ہضم ہونے کے نتیجے میں ظاہر ہوتی ہے۔ جہاں تک عزت نفس کا سوال ہے، تو اس سلسلہ میں تمام مسلمان دیکھ رہے ہیں جس شکست و ریخت اور ذلت و رسوائی اور ناکامی سے یہ دوچار ہیں، یہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ کس خامی کا شکار رہے ہیں، وہ کونسی غلطی ہے جس کا انہوں نے ارتکاب کیا، تاکہ اس کا تکرار نہ ہونے پائے۔ کیا زبان نہیں جانتے تھے، ٹیکنالوجی نہیں رکھتے تھے، صنعت نہیں رکھتے تھے، اقدار کا احترام نہیں کرتے تھے، بینک اکاؤنٹ نہیں رکھتے تھے، آخر وہ کونسی وجہ تھی جو انہیں شکست فاش ہوئی۔

اب دوسرے مقابلے کی بات کرتے ہیں جس کے میدان کی نشانی موت کے دہانے پر لگی ہوئی ہے۔ اور اس مقابلے کا عنوان رضا و خوشنودی ہے۔ اس مقابلے میں کامیابی کا اعلان آخرت میں ہوگا۔ اس مقابلے کیلئے درکار وسائل مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ زبان قرآن ۲۔ ایمان بہ آخرت ۳۔ خدا کی عدالت پر ایمان ۴۔ راہ انبیاء کی پیروی ۵۔ دنیوی زندگی میں قناعت۔

اہل مشرق گر چہ خود مسلمان نہ بھی ہوں لیکن جس قوم و نژاد کو وہ اپنی پہچان سمجھتے ہیں، اُسے اہل مغرب کسی طور پر بھی اپنے ساتھ مقابلہ و مسابقت میں شرکت کا اہل قرار نہیں دیتے، مسلمان اگر ذرہ برابر بھی شعور و بصیرت اور غیرت و حمیت رکھتے ہیں تو انھیں چاہئے کہ وہ پیغمبر اکرم کے فرمان مبارک پر عمل کرتے ہوئے پلٹ کر اپنے اسلام کی طرف آجائیں، مغربی دنیا کی طرف سے اپنے اوپر مسلط کی جانے والی اس خطرناک اور بے امان جنگ میں ان مورچوں

سے جہاد کو اپنا شعار قرار دیں۔

تمام مقامی و علاقائی اور اجنبی زبانوں کو اپنی زندگی کی لغت سے نکال کر صرف دو ہی زبانوں ”اردو“ اور ”زبان قرآن“ میں گفت و شنید کو فروغ دیں۔ اب تو یہاں کے مسلمانوں پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی چاہئے کہ وہ سرسید احمد کی پیروی کرتے ہوئے سعادت و کامرانی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔ بلکہ انکی سعادت کا واحد ذریعہ قرآن و سنت کی پیروی میں مضمر ہے۔ لہذا انھیں چاہئے انکی روزمرہ لغات میں جہاں کہیں سرسید احمد خان کی زبان ہو اسکی جگہ کلمات قرآن کو جاگزین کریں۔

بعثت انبیاء کے اہداف: سورہ مبارکہ حدید ۲۵ میں بعثت انبیاء کے بنیادی اہداف کو ”قیام و بالقسط“ قرار دیا ہے: ﴿لَقَوْمٍ بِالْقِسْطِ﴾ ”تا کہ لوگ عدل قائم کریں“

قیام مادہ قوم سے ہے اس کلمہ کیلئے ماہرین لغت عرب نے چند معانی ذکر کئے ہیں، ایک کسی چیز کو ہمیشہ نظر میں رکھنا اور غفلت نہ برتنے کے معنوں میں آیا ہے سورہ مائدہ آیت ۸ میں ہے کہ ہمیشہ خدا کو نظر میں رکھیں اور اپنے قیام کو خدا کیلئے مختص کریں:

﴿كُونُوا قَوْمًا لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ﴾ ”اللہ کیلئے بھرپور قیام کرنے والے

اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بن جاؤ“

چنانچہ سورہ فرقان آیت ۶ میں آیا ہے کہ ہم نے اپنے دین میں قیام رہیں یعنی دستور روپا سیدار اور راہ راست پر رہیں ذرہ بھر انحراف نہ کریں۔

﴿وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا﴾ ”بلکہ ان کے درمیان اعتدال رکھتے ہیں“

قسط: (ق س ط)، ان تینوں حروفوں سے مرکب کلمہ قسط کے ارباب لغت نے کتب لغت میں دو متضاد معنی نقل کئے ہیں۔ (ق) کو زبر لگا کر پڑھنے کی صورت میں اس کلمہ کو ظلم

قراردیا ہے یعنی دوسروں کے حقوق کو ہڑپ کرنا، تجاوز کرنا اور راہ حق سے انحراف کرنے کیلئے استعمال ہوا ہے چنانچہ اس معنی میں سورہ مبارکہ جن کی آیت ۱۵ میں آیا ہے قاسطین جہنم کا ائند بن ہیں:

﴿وَمَالِقَاسُطُونَ فَكَانُوا الْحٰقِمِينَ﴾ ”اور جو منحرف ہو گئے وہ جہنم کا ائندھن بن گئے“
 اس کلمہ کے ”ق“ کو زیر لگا کر پڑھنے کی صورت میں اس کے معنی عدالت خواہی و ادگیری عدل و انصاف پسند ہونا، راہ راست پر ہونا اور عدالت رواج دینے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے چنانچہ اس معنی میں سورہ حجرات ۹ میں آیا ہے:

﴿فَاَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوا اِنَّ اللّٰهَ الْمُقْسِطُ﴾ ”ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرادو اور انصاف کرو یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے“
 خداوند عالم عدالت خواہی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے سورہ اسراء ۳۵ اور سورہ شوریٰ ۸۲ میں انہی معنوں کیلئے آیا ہے:

ان دو کلمات کے آیات کے مطابق معنی واضح ہونے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت ہم عالمی استعماری طاقتوں کے زرخے میں آگئے ہیں، قوم ہو دیکھئے آنے والے مہلک بادل ہمارے سروں پر منڈلا رہے ہیں۔ یہ صورت حال حسب قرآن کریم ہمارے ہاتھوں کی کمائی ہے۔ پیغمبر اکرم کی حدیث کے مطابق جب بھی ظلم و ستم کی تاریکی رات کی مانند تمہارے اوپر چھا جائے تو تم قرآن کریم کی طرف رجوع کرو تا کہ معلوم ہو سکے کہ اس روزگار کا ہمیں کیوں سامنا کرنا پڑا ہے۔ قرآن کریم میں ہمیشہ دو ایسے نجات دہندگان کی طرف رہنمائی کی گئی ہے، ایک کتاب خدا یعنی قرآن کریم اور دوسرا انبیاء کرام ہیں۔

انبیاء کرام کی سیرت طیبہ جو قرآن کریم میں موجود ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے گزشتہ

قیام اللہ کیلئے نہیں تھے کیونکہ خدا کی راہ میں قیام کرنے والوں کیلئے وعدہ خدا ہے کہ وہ انکی صحیح راستہ کی راہنمائی کرے گا۔ ہم اپنے گزشتہ قیاموں کی طرف توجہ کریں تو ان تین قیاموں میں دو قسم کے قیام ہمارے اوپر حاوی تھے۔ ایک قسم کے قیام کا فقدان تھا، ہمارا ایک قیام جماعت اور قومیت یعنی قوم و ملت کیلئے تھا اور دوسرا قیام تنظیمی، یہ دونوں قیام قرآن کریم اور سیرت انبیاء سے اجنبی ہیں۔ قرآن کریم نے قیام قوم پرستی اور قیام تنظیمی کو شیطانی قیام قرار دیا ہے۔ قوم پرستی، عصیت و جاہلیت کی نمائندگی کرتی ہے جبکہ تنظیم ان کی سربراہ آوردہ شخصیات کے نفس امارہ کی ترجمانی کرتی ہے۔ یہ دونوں آخر میں قیام شیطانی سے جا ملتے ہیں، لہذا ہمیں قرآن اور سیرت انبیاء پر قائم رہنے کیلئے آنے والے دنوں میں ان دو شیطانی قیام سے اجتناب کرنے کی ضرورت ہے۔

قرآنی فتویٰ

تاریخ انبیاء میں ملتا ہے، مفاد پرستوں نے انبیاء کی دعوت میں مزاحم ہونے کیلئے ہمیشہ ان پر فتنہ سازی کی تہمت لگائی ہے۔ کیونکہ جب بھی کوئی نبی آتا تو معاشرہ دو گروہوں میں تقسیم ہوتا، ایک گروہ انبیاء کی دعوت کو قبول کرتا جبکہ دوسرا انکی مخالفت کرتا۔ یہ تسلسل معاویہ کے دور میں بھی جاری رہا، یہاں تک کے جمعہ کے خطبوں میں حضرت علیؓ کو فساد و فتنہ پھیلانے والا قرار دے کر ان پر سب و شتم کرنے کو رواج دیا گیا۔ اسی طرح جب امام حسین علیہ السلام نے قیام کیا تو یزیدی دسترخوان پر پلنے والوں نے آپ پر فتنہ پھیلانے کی تہمت لگائی۔ لہذا باطل کو فروغ دینے والوں کی یہ سیرت ہے جو تسلسل سے جاری ہے۔ آج بھی اسے جدید فتویٰ کا نام دے کر فروغ دیا جا رہا ہے، اہل بصیرت کو ان فتوؤں سے آگاہ رہنا چاہئے۔

مصادر و ماخذ کتاب انبیاء قرآن

مصادر و مأخذ کتاب انبیاء قرآن

تفاسیر اور قرآنیات

☆ معجم المفهرس الفاظ قرآن کریم	محمد فؤاد عبدالباقی
☆ معجم المفهرس الفاظ القرآن الکریم	محسن بیدارفر
☆ کشاف الموضوعی القرآن الکریم	دار القرآن الکریم
☆ معجم مفصل لمواضع القرآن	محمد خلیل عیستانی
☆ المقطف من عیون التفاسیر	مصطفی الحصن منصوری
☆ التفسیر التبیان	الشیخ طوسی
☆ التفسیر المجمع البیان	طبرسی
☆ التفسیر الشبر	سید عبد اللہ شبر
☆ التفسیر الصافی	فیض کاشانی
☆ التفسیر ذر المنثور	جلال الدین سیوطی
☆ التفسیر الکبیر	علی امام فخر الرازی
☆ التفسیر البیان	آیت اللہ ابو القاسم الخوئی
☆ تفسیر المیزان	آیة اللہ محمد حسین طباطبائی
☆ تفسیر الفرقان	آیة اللہ محمد صادق تهرانی
☆ التفسیر المنیر	الدکتور وهبه الزحیلی
☆ تفسیر الشعراوی	الشیخ محمد متولی الشعراوی

☆ ایسر التفاسیر	ابوبکر جابر الجزائری
☆ تفسیر فی ظلال القرآن	سید قطب شهید
☆ تفسیر جلالین	جلال الدین سیوتی
☆ امالی سید مرتضی	سید مرتضی علم الهدی
☆ تفسیر المنار	شیخ محمد عبده
☆ صفوفه التفاسیر	الصابونی
☆ من وحی القرآن	السید محمد حسین الفضل الله
☆ تفسیر نظم الدرر فی تناسب الآیات و السور	البقائنی
☆ تفسیر النور الثقلین	الشیخ عبد علی بن جمعة الحویزی
☆ التفسیر البرهان	علامة بحرانی
☆ تفسیر الوجیز	وهبة الزحلی
☆ تفسیر تفهیم القرآن	ابو اعلیٰ مودودی
☆ تفسیر نمونه	آیت الله مکارم شیرازی
☆ تفسیر موضوعی	آیت الله جواد آملی
☆ تفسیر موضوعی	آیت الله مکارم شیرازی
☆ تفسیر موضوعی	آیت الله جعفر سبحانی
☆ من هدی القرآن	آية الله محمد تقی مدرس

☆ تفسیر قرآن	محی الدین ابن عربی اندلیسی
☆ تفسیر مهمات القرآن	البیلسی
☆ تفسیر الکاشف	علامه جوادمغنیہ
☆ تفسیر ابن بادیس	علامہ ابن بادیس
☆ التفسیر و المفسرون فی ثوبہ القشیب	آیت اللہ ہادی معرفت
☆ تفسیر و المفسرون	دکتر محمد حسین ذہبی
☆ علوم القرآن عند المفسرین	مرکز ثقافت و المعارف القرآنیہ
☆ تفسیر نوین	بانوئی ایران
☆ تفسیر بہ راء ی	آیت اللہ مکارم شیرازی
☆ تفسیر القرآن الکریم	محمد علی تسخیری و نعمانی
☆ تفسیر ابن عربی	محی الدین العربی
☆ نحو التفسیر موضوعی لسور القرآن الکریم	مہمد الغزالی
☆ منهج البیان فی التفسیر القرآن	السید ابن حسن الرضوی
☆ محاضرات فی تفسیر القرآن الکریم	سید اسماعیل الصدر
☆ تسنیم تفسیر القرآن	آیت اللہ جواد آملی
☆ زاد التفسیر	جمال الدین قریشی بغدادی
☆ التفسیر و المفسرون	الدکتر محمد حسین الذہبی
☆ قواعد التفسیر	عابدین عثمان السبت

عبد القادر الرازی	☆ تفسیر اسئلة القرآن المجید و اجوبتها
محمد علی بن محمد الشوکانی	☆ تفسیر فتح القدر
بهاالدین خرمشاهی	☆ دانش نامه قرآن
زمخشری	☆ الکشاف عن حقائق غوامض التزیل
دکتر حبیب الله طاهری	☆ در سہائی از علوم قرآنی
راغب اصفہانی	☆ معجم مفردات الفاظ قرآن
محمد ادریس	☆ معجم التعبیرات القرآنیة
سید علی اکبر قرشی	☆ قاموس قرآن
استان قدس رضوی	☆ لافرنہنگ نامہ قرآنی
علامہ شیخ محسن علی نجفی	☆ مترجمہ قرآن کریم
علامہ جوادی	☆ مترجمہ قرآن کریم
ابو الاعلیٰ مودودی	☆ مترجمہ قرآن کریم
آیت الله محمدی گلپایگانی	☆ پرسی و ترجمہ انفال
پاسدارش ۵۰ ص ۶۷	☆ الحركة الجہادیة فی سورة الناس
آیة الله سید محمد باقر الصدر	☆ المدرسة القرآنیة
آیت الله محمد الیزدی	☆ اساس الایمان فی القرآن
علامہ جلال الدین السيوطی	☆ الاتقان فی علوم القرآن
محمد بن ابی بکر رازی	☆ پرسش و پاسخهای قرآنی

- | | |
|--|---------------------------------|
| ☆ منهاج الجدل | الدكتور زاهر عواض الالمعي |
| ☆ احكام القرآن | قاضی ابی بکر ابن عربی |
| ☆ فتوحات مکیہ | محمی الدین ابن عربی |
| ☆ الکون و الارض و الانسان فی القرآن العظیم | عبد الحمید |
| ☆ در سہائی از علوم قرآنی | دکتر حبیب اللہ طاہری |
| ☆ روش شناسی تفسیر قرآن | محمود رحبی |
| ☆ علوم القرآن عند المفسرین | مرکز الثقافہ و المعارف القرآنیہ |
| ☆ فی ضلال القرآن | محمد جعفر الشس الدین |
| ☆ پژوہشی پیرامون تدبیر در قرآن | ولی اللہ نقی پورفر |
| ☆ الاعجاز فی نظم القرآن | الدكتور محمود السيد شیخون |
| ☆ الانسان فی القرآن | عباس محمود عقات |
| ☆ الحوار فی القرآن | آیت اللہ فضل اللہ |
| ☆ اسرار الآیات | صدر الدین شیرازی |
| ☆ التعریف و الاعلام | عبدالرحمن السہیلی |
| ☆ الاشتراك اللفظی فی القرآن الکریم | محمد نور الدین المنجد |
| ☆ معجزۃ القرآن الحدیدہ بنیۃ الآیات و السور | عمر النجد |
| ☆ اسلوب دعوت فی القرآن | آیت اللہ فضل اللہ |

☆ الفرقان و القرآن	الشیخ خالد عبدالرحمن العک
☆ القرآن فی السلام	السید محمد حسین طباطبائی
☆ قرآن و عرفان و برهان	استاد حسن زاده آملی
☆ اطلس القرآن	الدکتور شوقی ابو خلیل
☆ گنجینه معارف قرآن	ابو الفضل فخر السلام
☆ القرآن حکمة الحیاة	السید محمد تقی المدرسی
☆ اسرار التکرار فی القرآن	عبدالقادر احمد عطا
☆ البیان فی روائع القرآن	الدکتور تمام حسان
☆ دراسات فی القرآن الکریم	الدکتور محمد ابراهیم الحفناوی
☆ النہی فی القرآن الکریم	الدکتور جمال ادین المصری
☆ الکتاب و القرآن	الدکتور محمد شحرور
☆ القواعد الحسان لتفسیر القرآن	شیخ عبد الرحمن بن ناصر
☆ موجز علوم القرآن	الدکتور دالود العطار
☆ إدارة الرزیل وغرة التأویل	ابی عبد الله خطیب الاسکا فی
☆ المدخل لعلم تفسیر کتاب الله تعالی	ابی النضر حدادی
☆ ملاءک التأویل	احمد بن زبیر الغرناطی
☆ قواعد التدبر الامثل	عبد الرحمن حسن جنبکه المیدانی

☆امن وحی القرآن	آیة اللہ محمد حسین فضل اللہ
☆محازات القرآن	شریف الرضی
☆معالم القرآن فی عوالم الاکوان	الشیخ احمد محی الدین العجوز
☆۵۰۵ معمای قرآنی	محمد حسین قاسمی
☆التصویر الفنی فی القرآن	سید قطب
☆القرآن فی شهر القرآن	الدکتور عبدالحلیم محمود
☆شناخت قرآن	محمود درجی، محمود اعراقی
☆التعریف و اعلام	عبد الرحمن السہلی
☆امن قضایا الاعلام فی القرآن	رمضان الاوند
☆مسیر تحول قرآن و حدیث	علی فاضل عبد الرحمن انصادی
☆معرفت شناسی در قرآن	سید حسین ابراہیمیان
☆افی رحاب اللہ اصواء علی دعاء کمیل	عز الدین بحر العلوم
☆النتھی فی القرآن الکریم	جمال الدین المصری
☆الفرقان و القرآن	الشیخ خالد عبد الرحمن العک
☆مجموعہ سخنرانیہا و مقالات	کنفرانس تحقیقاتی و مفاہیم قرآن
☆القیامۃ بین العلم و القرآن	الدکتور داود سلمان السعدی
☆اعجاز قرآن	علامہ سید مہمد حسین طباطبائی

☆ قرآن باب معرفت الله

امام خمینی

☆ العلاقة الجنسية في القرآن الكريم

محمد مهدي الاصفی

☆ الظواهر الجغرافية بين العلم و القرآن

عبد العليم عبد الرحمن خضر

☆ معطيات آية المودة

السيد مهمود الهاشمی

☆ پایه های اساسی شناخت قرآن

عبد الفتاح طباره

☆ الكون والارض والانسان في القرآن الكريم

رجا عبد الحمید عربی

☆ برهان قرآن

صدر الدين بلاغی

☆ معیارها و عوامل تمدن از نظر قرآن

بنیاد باقر العلوم

☆ نقدی و بر سیر تحول القرآن

علی الرضا صدر الدين

☆ من الدرة الى المحجرة

حمادة احمد العالدي

☆ قرآن ثقل اكبر

سید علی کمالی دزفولی

☆ دراسات تاريخية من القرآن الكريم

محمد بیومی مهران

☆ البرهان في نظام القرآن

محمد عناية الله اسد سبحانی

☆ الجنس في التصور الاسلامی

محسن محمد عطوی

☆ حول القرآن

آية الله الفاني الاصفهانی

☆ قرآن در عصر فضا

دكتور سيد عبد الرضا حجازی

☆ دكتور الخلاق في القرآن

دكتور محمد عبد الله دراز

☆ الانحرافات الكبرى

سعيد ايوب

☆ اسالیب البیان فی القرآن	سید الجعفر الحسینی
☆ قیس من نور القرآن الکریم	الشیخ محمد علی الصابونی
☆ ملاحم القرآن	الشیخ ابراهیم انصاری
☆ متشابهات القرآن و مختلفه	محمد بن علی شهر آشوب
☆ قاموس القرآن	عبد العزیز سید الاہل
☆ تلخیص البیان فی محازات القرآن	سید شریف الرضی
☆ مباحث فی علوم القرآن	الدکتور صبیح الصالح
☆ الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل	زمخشری
☆ رحمة من الرحمن فی تفسیر و اشارات القرآن	محمی الدین ابن العربی
☆ حقائق ہامہ حول القرآن الکریم	سید جعفر جعفر مرتضیٰ العاملی
☆ سوکندهای قرآن	استاد جعفر سبحانی
☆ زوال اسرائیل	شیخ اسعد بیوض التمیمی
☆ ادیان آسمانی و مسئلة تحریف	سید مرتضیٰ عسکری
☆ لباب نقول فی اسباب النزول	جلال الدین عبد الرحمن السیوطی
☆ درآستانہ قرآن	وکتور محمود رامیار
☆ نامہ ہدایت	دکتور محمد مہدی رکنی
☆ الفصحی لغة القرآن	انور الجندی

☆ آسمان وزمین و ستاره گان از نظر قرآن۔ آیت اللہ محمد صادق

☆ بشارت عہدین۔

☆ بشارت و المقارنات۔

☆ نہایۃ الکنون بین العلم و القرآن محسن عبد الصاحب المظفر

☆ تفسیر القرآن الکریم

صدر المتالہین

☆ پژوہشی درباره قرآن و تاریخ آن سید محمد باقر حجتی

☆ واژه های قرآن سید حسین شفیعی دارابی

☆ الایات العجائب فی رحلة الانجاب حامد احمد حامد

☆ عجائب القرآن السید الجمیلی

☆ وجوہ قرآن ابو الفضل حبیب بن ابراہیم تفلیمی

☆ مباحث فی تفسیر الموضوعی الدكتور مصطفی مسلم

☆ در اسات فی القرآن الکریم علی مہمد الاصفی

☆ من اشعه القرآن محمد امین زین الدین

☆ شگفتیہا از اعجاز در قرآن الدكتور محمد جمال الدین فندی

☆ کلید های فہم قرآن علی رضا صدر لدینی

☆ القرآن و الاحوال المناخیہ محسن عبد الصاحب المظفر

☆ علوم طب فی القرآن۔ استاد خلیل

☆ تفسیر الآیات فی کتاب التکامل فی الاسلام استاد احمد امین

☆ رحلة المدرسية -

آیت الله جوادی بلاغی

☆ سیر تحول قرآن و حدیث

علی فاضل عبدالرحمن انصاری

☆ افسانه تحریف قرآن

رسول جعفریان

☆ رسالت قرآن

آیت الله جوادی آملی

☆ آشنائی با قرآن

استاد مرتضی مطهری

☆ علوم قرآن یا تفسیر موضوعی

آیت الله مرتضی حائری یزدی

☆ علوم القرآن

السید محمد باقر الحکیم

☆ المسنن التاريخية في القرآن المجيد

الشیخ الزکابی

☆ بحوث في تاريخ القرآن و علومه

ابو الفضل میر محمدی

☆ الكون والانسان بين العلم و القرآن

بسام دفعع

☆ اسرار الکوب في القرآن

الدکتور داؤد سلمان السعدی

☆ القرآن الکریم و روایات المدرستین

السید مرتضی العسکری

☆ شناخت شناسی در قرآن

آیت الله جوادی آملی

☆ بحوث في اصول التفسير و مناهجة

فهد بن سلیمان الرومی

☆ منهج القرآن في تطوير المجتمع

الدکتور محمد البهی

☆ القرآن الکریم و التوراة و الانجیل و العلم

موريس بوكائی

☆ مستهائی اجتماعی در قرآن کریم

احمد حامد مقدم

☆ سورة اعلی و زلزال

ملا صدرا

☆ هدایت در قرآن

آیت الله جواد آملی

☆ قرآن و کتابهای دیگر آسمانی شهید سید عبد الکریم هاشمی نژاد

☆ الی لقرآن الکریم

الامام محمود شلتوت

☆ الظاهرة القرآنية

مالک بن نبی

☆ الاعتدال محمد و القرآن

جان دیون پورت

☆ المبادئ العامة لى تفسير القرآن الکریم دکتر محمد حسین علی الصغیرا

☆ فرهنگ رائد الطلاب

جبران مسعود

☆ النظرية الاجتماعية فى القرآن الکریم

ڈاکٹر زهیر العرجی

☆ الاستشراق فى میزان نقد الفكر الاسلامی ڈاکٹر احمد عبد الکریم صاحب

☆ تاریخ از دیدگاه امام علی

علامه محمد تقی جعفری

☆ استناد به قرآن کریم در کلام معصومین

محمد تقی واحدیان

☆ آیت های و هدایت های پیامبران

ابو القاسم تجری

☆ تاریخ الانبیاء حماسه بت شکنان

عزیز الله کاسب

☆ الظاهرة القرآنية

مالک بن نبی

ترجمه و شروحات نهج البلاغه

☆ شرح

محمد عبده

☆ لاشرح نهج البلاغه۔

ابو القاسم الخوئی علیہ الرحمہ

☆ لاشرح نهج البلاغه ۔

ابن ابی الحدید

☆ لاشرح نهج البلاغه

میشم بحرانی

☆ لاشرح و ترجمہ ۔

علامہ محمد تقی جعفری

☆ فی ضلال نهج البلاغه

علامہ محمد جواد مغنیه

☆ لا ترجمہ

علامہ ذیشان حیدر جوادی

☆ لا ترجمہ

علامہ مفتی جعفر

☆ لا قاموس نهج البلاغه

محمد علی شرقی

☆ لا معجم نهج البلاغه

علامہ محمد دشتی و محمد کاظم

☆ لا ترجمہ نهج البلاغه ۔

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی

☆ لا ترجمہ ۔

محمد جواد فاضل

☆ لا الدلیل الی موضوعات نهج البلاغه

☆ لا معجم موضوعی نهج البلاغه

☆ لا مصادر نهج البلاغه

☆ لا خوارج از دیدگاه نهج البلاغه

آیة اللہ نوری ہمدانی

☆ لافى رحاب نهج البلاغه . آية الله شهيد مرتضى مطهرى

☆ نظام حکم دالأرادہ فى نهج البلاغه مہدی شمس الدين

☆ شرح نهج البلاغه آية الله منتظري

☆ فرہنگ آفتاب حميد معاديخواہ

☆ تصنيف نهج البلاغه لفيف يبضون

☆ نهج البلاغه صبحي سالم

☆ ترجمہ نهج البلاغه علامہ جوادی

☆ ترجمہ ہنج البلاغه علامہ مفتی جعفر

دعا و عرفان

☆ صحيفه سجاديہ امام زين العابدين

☆ سلوك عرفان آيت الله جواد ملكي تبريزي

☆ شرح الصحيفه السجاديہ محمد باقر بن محمد شفيع الحسيني

☆ شرح دعاى صباح آقا نجفی قوجانی

☆ شرح دعاى صباح مصطفى بن محمد هادی خوئی

☆ شرح دعاء الصباح الحاج ملاهادی السبزواری

☆ انيس الليل در شرح دعاى كميل شيخ محمد رضا كلباسي

☆ سراج الصعود ليمعارج الشهود محسن بينا

☆ فصوص الحکم

محمی الدین ابن عربی

☆ فصوص الحکم برفصوص الحکم

آیت اللہ حسن زاده آملی

☆ شرح دعاء مکارم اخلاق

استاد محمد تقی فلسفی

☆ شرح دعاء عرفه

ملا محمد فاضل خراسانی

☆ وصال العارفین شرح دعاء عرفه

احمد زمر و دیان

☆ شرح دعاء ندبه

☆ شرح دعاء افتتاح

☆ عشق و رستگاری

☆ لافی رحاب دعاء افتتاح

آیه اللہ فضل اللہ

☆ لافی رحاب دعاء کمال

آیه اللہ فضل اللہ

☆ شرح زیارت جامعہ

آیه اللہ احمد الاحسانی

☆ العرفان الاسلامی

آیه سید محمد تقی مدرسی

☆ معرفت شناسی در عرفان

سید حسین ابراهیمان

☆ شرح دعاء جوشن کبیر

محمد علی رامهر مزی

☆ سلوک عرفان

آیه اللہ جوادمکی تبریزی

☆ تازیانه سلوک از

آیت اللہ استاد حسن حسن زاده آملی

☆ نور علی نور

آیت اللہ حسن حسن زاده آملی

☆ اسماء اللہ الحسنی

عبد اللہ بن صالح بن الغضن

- ☆ اسماء الله الحسنى دكتور حسن عز الدين
- ☆ اسماء و صفات شيخ عماد الدين احمد حيدر
- ☆ اسماء الله الحسنى محمد بن ابى بكر الزرعى دمشقى
- ☆ شرح اسماء الله الحسنى دكتورة حصه بن عبد العزيز الصغير
- ☆ الله اسم الاعظم دكتور عبد الله بن عمر الدميحي
- ☆ القول الاسنى فى شرح اسماء الله الحسنى مجدى منصور شورى
- ☆ مقحم اسماء الله الحسنى سيد احمد محاسب مرسى
- ☆ كتاب الدعاء مصطفى عبد القادر عطا
- ☆ فلاح السائل و نجاح المسائل السيد ابن طاووس
- ☆ شرح الاسماء و شرح دعا الجوشن الكبير الحاج ملا هادى سبزوارى
- ☆ كميل محرم اسرار امام على ناموس عرفان
- ☆ اسماء الهى ازديد گاه قرآن و عرفان رضا رمضانى گيلانى
- ☆ اسماء الله الحسنى عيد العظيم ابراهيم فرج
- ☆ معرفت شناسى در عرفان سيد حسين ابراهيميان
- ☆ خواص الاسماء الحسنى و شرح معانيها ضياء الدين الاعلى
- ☆ فى رحاب الله اصواء اعلى دعاء كميل عز الدين بحر العلوم
- ☆ الدعاء عند اهل البيت محمد مهدي الآصفى

☆ تصحیح الدعاء

بکر بن عبد اللہ بن ابو زید

☆ موسوعة له الاسماء الحسنی

الدكتور احمد الشرباصی

☆ اصول النظام اجتماعي في السلام

الامام محمد الطاهر بن عاشور

☆ الاسلام بين العلماء والحكام

عبد العزيز البدری

کتاب تاریخ و سیرت

☆ احکام السرة و البيت المسلمه

شيخ محمد متولى شعراوى

☆ السيرة النبويه-

شيخ محمد متولى شعراوى

☆ تشريع الاسلامی، مناهجه و معاصره

سلمان العید،

☆ الاسلام والتطور الاجتماعی-

عبد العالی المظفر

☆ ابعاد عالمية في عقيدة الاسلامية، عبد الكريم فكر اسلامی ش ۸ ص ۱۷۳

☆ الاسلام في مشاكل المجتمعات الاسلامية دکتر محمد البهی

☆ العودة الى الاسلام لمنهاج وحل لمشكلات محمد سعيد رمضان البوطی

☆ الثورة الاسلامية عقباتها و مكاسبها خطب هاشمی رفسنجانی

☆ طلاغوت-

محمود حکیمی

☆ الحرية و الفكرية، ادواتها اطرها رئیس التحریر فکر اسلامی ش ۱۱

☆ الحركة الاسلامية، هموم و قضايا آية الله فضل الله

☆ دور الشعار في النظرية الاسلامية سيد محمد باقر الحكيم فكر اسلامی

☆ حداثۃ الفکر و متانۃ الطرح، کلمۃ ہیئۃ التحریر مجلہ فکر اسلامی ش ۱۷ ص ۴

☆ تاریخیۃ، ہانی ادیس، مجلہ بصائر ش ۱۱

معاجم وقوامیس

ابن منظور

☆ لسان العرب

☆ تاج العروس

☆ المنجد

☆ لسان للسان تہذیب لسان العرب ابی الفل جمال الدین محمد بن مکرم

☆ قاموس اللغات

☆ قائد اللغات

☆ انوار اللغات

معجم الموضوعات المطروقة

☆ آئینہ اردو لغت

☆ اظہر اللغت

☆ فیروز اللغت

☆ حسن اللغت

☆ فرہنگ فرہنگ رائد الطلاب

☆ فرہنگ آصفی

☆ فرهنگ عمید

☆ لغات علمی

☆ کشف اصطلاحات

☆ معجم فقه جواهری

☆ کشف الفنون

☆ معجم و مؤلفین

☆ موسوعة کشف اصطلاحات

☆ الفنون و العلوم

علامه محمد التحانوی

فرهنگ فرق و مذہب اسلامی و کتب عقائد شیعه

☆ فرهنگ فرق شیعه اشکوری

☆ فرق معاصر

☆ قاموس المذاهب والادیان

حسین علی حمد

☆ دائرة المعارف الاسلامیة الشیعة (۱۱ جلد) حسن الامین

دارالتعارف للمطبوعات بیروت

☆ الفرق بین الفرق

☆ قاموس مذاهب وادیان

☆ معیار شرك فی القرآن

☆ دراسات في العقيدة الإسلامية محمد جعفر شمس الدين دار المتعارف

☆ تحليل وحی از دیدگاه اسلام و مسیحیت محمد باقر سعیدی روشن

☆ دعوة التقريب بين المذاهب الإسلامية دار الجواد

☆ فلسفه دین محمد حسین زاده

☆ عقلیات اسلامی محمد جواد مغنیه ۲ جلد دار الجواد

☆ تمهيد الاصول در علم کلام اسلامی الشيخ محمد بن الحسن الطوسي

☆ الاسلام دروس في اصوله و أحكامه نخبة من الاساتذة

☆ اصول العقيدة في التوحيد والعدل ۲ جلد السيد مهدي الصدر دار الزهراء

☆ معاد شناسی آية الله الطهراني

☆ الله شناسی آية الله الطهراني

☆ حقائق الاسلام وابطال خصومه عباس محمود العقاد

المكتبة العصرية بيروت

☆ اديان معتقدات العرب قبل الاسلام ڈاکٹر سیح دغیم

☆ الفرق بين الفرق عبد القاهر بغدادی اسفرانی

☆ نصرانية و التبشير توحيد ۴۶، ۴۷ ص ۲۲، ۱۳۳

☆ اصل اصول شيعه آيت الله محمد حسين كاشف الغطاء

☆ عقائد اماميه آيت الله شيخ محمد رضا مظفر

☆ عقائد اماميه آيت الله سيد ابراهيم جنجاني

☆ شیعه در اسلام آیت الله سید محمد حسین طباطبائی

☆ عقائد امامیه علامه جوادمغنیه

☆ عقائد الامامیه الاشی عشریة آیت الله ابراهیم الزنجانی النجفی

۳ جلد مؤسسه الوفاء بیروت

☆ نهج الحق و كشف الصدق للامام الحسن بن يوسف العلامة الحلی

مؤسسه دارالهجرة

☆ مجموعه رسائل اعتقادی علامه محمد باقر مجلسی

☆ عقائد الاسلام من القرآن الکریم السید مرتضی العسکری ۲ جلد

☆ روح التشیع سماحة الشيخ عبد الله نعمة دارللفکر اللبنانی

☆ دراسات فی عقائد الشيعة الامامية السید محمد علی الحسنی العاملی

مؤسسه النعمان

☆ العقائد الاسلامیه محمد جواد مالک مؤسسه البلاغ بیروت

☆ الإمامة من أبقار لأفکار فی اصول الدین سیف الدین الأمدی

دارللكتاب العربی

☆ الشيعة واهل بيت احسان ألهی ظهير اداره ترجمان السنة

☆ الشيعة والتشیع فرق و تاريخ احسان ألهی ظهير اداره ترجمان السنة

☆ تاريخ الامامية وأسلافهم من الشيعة الدكتور عبد الله قياض

مؤسسه الاعلمی للمطبوعات

☆ اظهر الحق رحمه الله بن خليل الرحمن الهندي دار الكتاب العلمي بيروت

☆ شبهات حول الشيعة عباس علي الموسوي

☆ الا امامه في ضوء الكتاب والسنة الشيخ مهدي السماوي

☆ السقيفة والخلافة عبد الفتاح عبد المقصود مكتبة غريب

☆ الشيعة في العيزان محمد جواد مغنیه دار التعارف للمطبوعات

☆ الشيعة في التاريخ محمد حسين الدين مكتبة النجاح

☆ التشيع نشوؤه و مراحلُه مقومات عبد الله العرفقي

☆ جهاد الشيعة الدكتور سميرة مختار الهادي دار الحيل بيروت

☆ اليوم الموعود محمد الصدر مكتبة الامام امير المؤمنين ايوان

☆ پاسخ شبهاتی پیرامون مکتب تشیع عباس علي موسوي

☆ الوحدة العقائدية عند السنة والشيعة الدكتور عاطف سلام دار البلاغة

☆ امام شناسي آية الله الطهراني

☆ ولايت و علم امام مؤسسه انتشارات امير كبير

☆ اراهنما شناسي آيت الله استاد محمد تقی مصباح يزدي

☆ عقائدنا الدكتور محمد الصادقي مؤسسه الصادق بيروت

☆ في الضلال التشيع محمد علي الحسنی

☆ امامت استاد علامه حسن زاده آملی انتشارات قیام

- ☆ الخلافه و الامامة عبد الكريم الخطيب دارالمعرفة - بيروت
- ☆ التشيع در مسیر تاریخ دکتر سید حسین جعفری دفتر نشر فرهنگ اسلامی
- ☆ لا کذبوا علی الشیعه
- ☆ نشأت الشيعة الامامية نبیله عبد المنعم داوود دارالمؤرخ العربی بیروت
- ☆ پیرامون وحی و رهبری آیت الله جواد آملی
- ☆ مذهب اهل بیت* (اردو ترجمه) آیت الله عبدا لحسین شرف الدین موسوی
- دارالثقافة الاسلامیة پاکستان
- ☆ النص والاجتهاد آیت الله عبدالحسین شرف الدین موسوی
- ☆ التشيع نشاته معالمه هاشم الموسوی مرکز الغدير دراسات الاسلامیه
- ☆ الانقراضات الشيعة عبر التاريخ هاشم معروف الحسینی دارالکتب الشعبیه بیروت
- ☆ بین التصوف والتشيع هاشم معرف حسینی دارالقلم بیروت
- ☆ الامامت و القيادة دکتر احمد عزالدین
- ☆ رسالت القرآن دارالقرآن الکریم ش ۱ تا ۱۲ قم ایران
- ☆ پیژوهشهای قرآنی ش ۱ تا ۸ - ۲۳ تا ۲۶
- ☆ محله بینات ش ۱۰، ۶، ۹، ۱۲، ۹، ۱۲ قم ایران
- ☆ المعارج ش ۱۸، ۱۹، ۲۰ - ۱۸، ۱۹، ۲۰
- ☆ سیارة ذاتجست قرآن نمبر ۱-۲-۳

☆ ترجمان وحی	ایران
☆ ترجمان القرآن	لاهور
☆ محله نقد و نظر	دفتر تبلیغات اسلامی قم
☆ محله ثقافة الاسلامیة	رایزنی ایران دمشق ش ۷۰/۱
☆ محله الرصد	رایزنی جمهوری اسلامی ایران لبنان
☆ کیهان اندیشه	-----
☆ محله التوحید	سازمان تبلیغات اسلامی تهران
☆ محله المنطلق	لبنان
☆ محله البینات لبنان - خطابات مصاحبات	آية الله فضل الله
☆ محله نور الاسلام	جامعة المدرسين
☆ محله حوزة	ش ۸۰، ۷۹، ۴۲ تا ۳۹، ۳۱، ۲۰، ۱۹
☆ محله مشکوة	مشهد
☆ مجلات العربی	الکویت
☆ رسالة الاسلام	کلیه اصول الدین بغداد
☆ مجلات النجف -	نجف
☆ مجلات - الاضواء النجف -	نجف
☆ الاعتصام - سازمان تبلیغات اسلامی	ایران
☆ نامه فرهنگ -	وزارة ارشاد

☆ نور الاسلام۔	موسسہ امام حسین لبنان
☆ اخبار جنگ۔	راولپنڈی
☆ اخبار نوائے وقت۔	راولپنڈی
☆ مجلہ ثقافت اسلامیہ	رائٹزنی جمہوری اسلامی ایران دمشق
☆ مجلہ رسالت الثقلین	مجمع اہل البیت ایران
☆ مجلہ دارالتقريب	ایران
☆ مجلہ رسالت الاسلام۔	دارالتقريب الاسلامی مصر
☆ مجلہ فکر اسلامی	-----
☆ مجلہ فکر جدید۔	لندن
☆ مجلہ پاسدار۔	ایران
☆ مجلہ فکر وثقافت۔ سوالات و جوابات	آیت اللہ محمد حسین فضل اللہ
☆ مجلہ اندیشہ حوزہ	ش ۱ ص ۱۰۷
☆ مجلہ کیہان اندیشہ	ش ۳۲ ص ۵۸-۸۴
☆ مجلہ کیہان اندیشہ	ش ۱۶ ص ۳۳-۴۷
☆ مجلہ کیہان اندیشہ	ش ۱۷ ص ۳۷
☆ مجلہ رسالہ تقریب	-----

سماجیات وثقافت

- ☆ نظام الحکم و الادارہ محمد باقر شریف القریشی
- ☆ نظام مجتمع والحکم عبد الہادی فضلی
- ☆ نظام الحکم و الادارہ دکتور محمد نوری
- ☆ نظام المال فی الاسلام محمد مہدی الآصفی
- ☆ نظام التشريع فی الاسلام محمد مہدی الآصفی
- ☆ منهج التفسیر صادق م بصائر ش ۱۲، ۱۳، ص ۲، ۴
- ☆ تكوين الاسرة فی السلام الدکتور علی القاضی
- ☆ نقش کتاب در تمدن و فرهنگ اسلامی -----
- ☆ اسلام و ایران آیت اللہ شہید مرتضی مطہری
- ☆ سیمای مسجد رحیم نو بہار
- ☆ موسوعہ سین و حیم۔ احمد سالم بادویلان
- ☆ منہاج الرسل۔ السید احمد القبانیجی
- ☆ علماء والمسئولیت تثقیف الامة حسن الصفاء بصائر ش ۱۰ ص ۶۵
- ☆ نصرانیة و التبشر توحید ۴۶، ۴۷ ص ۱۳۳، ۲۲۰
- ☆ تاریخ الحركة الإسلامية المعاصرة فی العراق الخطیب ابن النجف
- ☆ صراع الارادات ، سلیم الحسینی

☆ قضایا معاصره

هاشمی نژاد

☆ الثقافی الحديد مسالیه و آثاره

توحید ۱۶ ص ۱۸۱

☆ الاسلام و الاسطورة

حسن الباش، مجله بصائر ش ۱۰

☆ خصوصية ثقافية و مشکلات النخبة في المغرب الاقصى بقارية

☆ الحيات ، محمد رضا حکیمی

☆ الامامت و القيادة

دكتور احمد عز الدين

☆ الى و کلاننا فی البلاد

آية الله مهدي حسینی شیرازی

☆ كيف تدبير الامور لتحديد دين و احيائه و واقعا للمسلمين و سبيل الفهوض بهم،

ابو الاعلیٰ مودودی

☆ الحوار فی الاسلام آیت الله محمد حسین فضل الله مجله منطلق عدد ۹۸

☆ الثقافة الرسالية

احمد ناکز

☆ خطاب الاسلامی و تحدیة المتقابل

☆ احزاب بعد از مشروطیت پاسدار اسلام ش ۱

☆ احزاب سیاسی پس از مشروطیت ، پاسدار اسلام ش ۲

☆ نقش کتاب در تمدن و فرهنگ اسلامی ، ضیاء الدین

☆ مفهوم التعليم عند الغربیین ۹

☆ الدعوة و الخطابة ، علی عبد العظیم

☆ علامه شیخ غلام محمدایک بی داغ قیادت امامیه آرگنائزیشن بلتستان ریجن

سیرت آنکہ اور حسنیات

- ☆ اثورۃ الحسینیہ محمد نعمہ السماوی
- ☆ الامام حسین فی مکہ مکرمہ شیخ نیم الدین الطیبی
- ☆ نگاہ بہ حماسہ حسینی۔ صالحی نجف آبادی
- ☆ حماسہ حسینی۔ آیۃ اللہ شہید مرتضیٰ مطہری
- ☆ لؤلؤ مرجان آیۃ اللہ نوری
- ☆ لافی رحاب الحسین۔ آیۃ اللہ حسین فضل اللہ
- ☆ لطیفہ کربلا۔ آیۃ اللہ حسین فضل اللہ
- ☆ اثورۃ الحسین " یقظۃ الضمیر و تحریر الادارۃ سید باقر الحکیم
- ☆ تحریفات عاشورا۔ محلہ فکر اسلامی ش ۱۶
- ☆ حقیقۃ الاسلام و مسلمین آغا پشوائی
- ☆ الاثمۃ الاثنی عشر درامۃ تحلیلۃ فی المنهج راشد الراشد
- ☆ حیات فکری و سیاسی امامان شیعہ۔ رسول جعفریان
- ☆ الندوۃ۔ آیۃ اللہ سید محمد حسین فضل اللہ
- ☆ مجاہد اعظم۔ علامہ سید شاکر حسین امروہوی
- ☆ موسوعۃ مقتل الامام الحسین۔ محمد عیسیٰ آل مہاکس
- ☆ الفکر التربوی عند شہید ثانی محمد تھامی، محلہ بصائر ش ۱۱
- ☆ تاریخ غیب صغراء۔ آیۃ اللہ سید محمد صدر

☆ سیرت آئمہ اثنی عشر -

امستاد عادل ادیب

☆ فی رجاہ الاہلبیت -

آیۃ اللہ حسین فضل اللہ

☆ میزاری شیرازی -

سید محمود مدنی

☆ سیمائی مسجد

رحیم نوبہار

☆ ازمتہ المدرسۃ بین تصنیفات الحل واستراتجیہ الحل الاحتمائی

عدد ۲، ۳۰۷۵ الدکتور صیام المولیٰ ۴۹

☆ حیات امام حسن علیہ السلام تالیف علامہ محمد باقر شریف قرشی

☆ حیات امام حسین علیہ السلام

☆ حیات امام زین العابدین

☆ حیات امام محمد باقر

☆ حیات امام موسیٰ ابن جعفر

☆ حیات امام رضا علیہ السلام

☆ حیات امام علی نقی علیہ السلام

☆ حیات امام حسن عسکری علیہ السلام

☆ تاریخ غیبت صغریٰ

شہید آیت اللہ سید محمد الصدر

☆ تاریخ غیبت کبریٰ

☆ یوم موعود

☆ الزام الناصب

فهرست مضامین کتاب
انبیاء قرآن

فہرست مضامین کتاب

۳	عرض ناشر
۱۱	تمہید
۱۵	فلسفہ ضرورت بعثت انبیاء
۱۹	نبوت خاصہ
۲۶	نبی اور رسول میں فرق
۳۱	انبیاء انسان و بشر ہیں
۳۵	تمام انبیاء اُمّی ہیں
۴۱	انبیاء اور علم غیب
۴۳	اقسام غیب
۴۹	ایمان بالغیب اور علم غیب
۵۲	خدا اور انبیاء کے علم غیب میں بنیادی فرق
۵۴	حقیقت وحی
۵۶	وحی کے معنی

- ۶۲۔ عصمت انبیاء کی دلیل
- ۶۲۔ ۱۔ دلیل اعتماد
- ۶۳۔ ۲۔ دلیل اخلاقی
- ۶۴۔ ۳۔ دلیل اطاعت
- ۷۱۔ عصمت انبیاء
- ۷۶۔ حدود عصمت
- ۸۲۔ انسان سے گناہ سرزد ہونے کے اسباب و وجوہات
- ۸۴۔ عصمت انبیاء کے خلاف قرآنی آیات سے استدلال
- ۸۹۔ معصوم اور غیر معصوم کی شناخت کیسے ممکن ہے؟
- ۹۱۔ عقیدہ عصمت کا تاریخی پس منظر
- ۹۴۔ تعداد انبیاء عقل و نقل کی روشنی میں
- ۹۹۔ حضرت آدم علیہ السلام
- ۱۰۳۔ آدم علیہ السلام اور نبوت
- ۱۰۶۔ قصہ حضرت آدم چند عناصر سے مرکب ہے
- ۱۰۷۔ حقیقت ملائکہ
- ۱۱۱۔ اقسام ملائکہ
- ۱۱۴۔ ”جن“

- ۱۱۷۔ ”ابلیس“
- ۱۱۹۔ آدم نمونہ کامل انسان
- ۱۲۰۔ خلافت کی انواع ہیں
- ۱۲۱۔ اہداف و مقاصد خلافت
- ۱۲۲۔ تربیت گاہ سے اخراج
- ۱۲۸۔ حضرت اور لیس
- ۱۳۰۔ حضرت نوح علیہ السلام
- ۱۳۱۔ حضرت نوح آیات قرآنی میں
- ۱۳۳۔ حضرت نوح علیہ السلام اور اُن کی دعوت
- ۱۳۶۔ قصہ حضرت نوح علیہ السلام
- ۱۳۹۔ معجزات حضرت نوح علیہ السلام
- ۱۴۲۔ قوم کونوٹ کا جواب
- ۱۴۷۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام
- ۱۵۶۔ مردہ مشرکین کیلئے مغفرت طلب نہیں کی جاسکتی
- ۱۵۶۔ والد حضرت ابراہیم کا تعین
- ۱۵۷۔ ذبح عظیم کا فدیہ
- ۱۵۸۔ ارماں و آرزوں کی خاطر انسانی قربانی

قتل نفس

۱۶۲

عبدالمطلب اور نذر ذبح فرزند

۱۶۵

حضرت عیسیٰ کی قربانی

۱۶۷

حضرت ابراہیم کا اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو ذبح کرنا

۱۶۸

ذبح، اسماعیلؑ ہے یا اسحاقؑ

۱۷۱

توحید اور شرک میں تضاد

۱۷۴

تاریخ بت پرستی، بت سازی اور بتوں کو فروغ اور ترویج دینا

۱۸۰

اسباب و عوامل بت پرستی

۱۸۲

فلسفہ عبادت و بندگی

۱۸۵

عبودیت و بندگی

۱۸۸

بت پرستی اور خدا پرستی

۱۹۲

قرآن کریم میں بت کا تصور اور انکے نام

۱۹۳

بتوں سے راز و نیاز

۲۰۲

بتوں کی شکل و صورت

۲۱۰

انواع و اقسام بت اور بت پرستی

۲۱۶

جن سے حاجت طلب کی جاتی ہے خود نیاز مند اور محتاج ہیں

۲۱۷

بت اور بت پرستوں کے خلاف قرآن اور انبیاءؑ کا رویہ

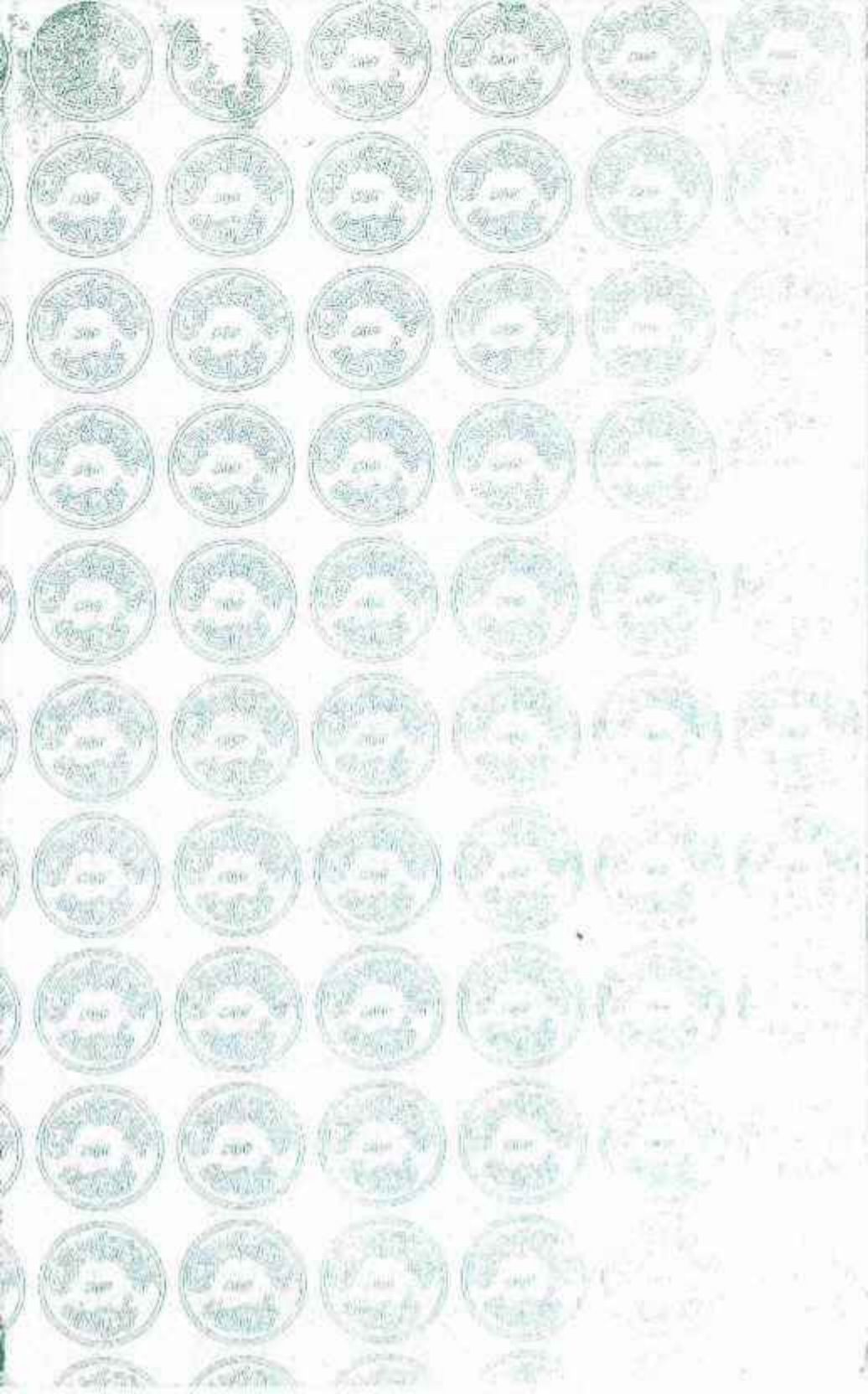
۲۲۰

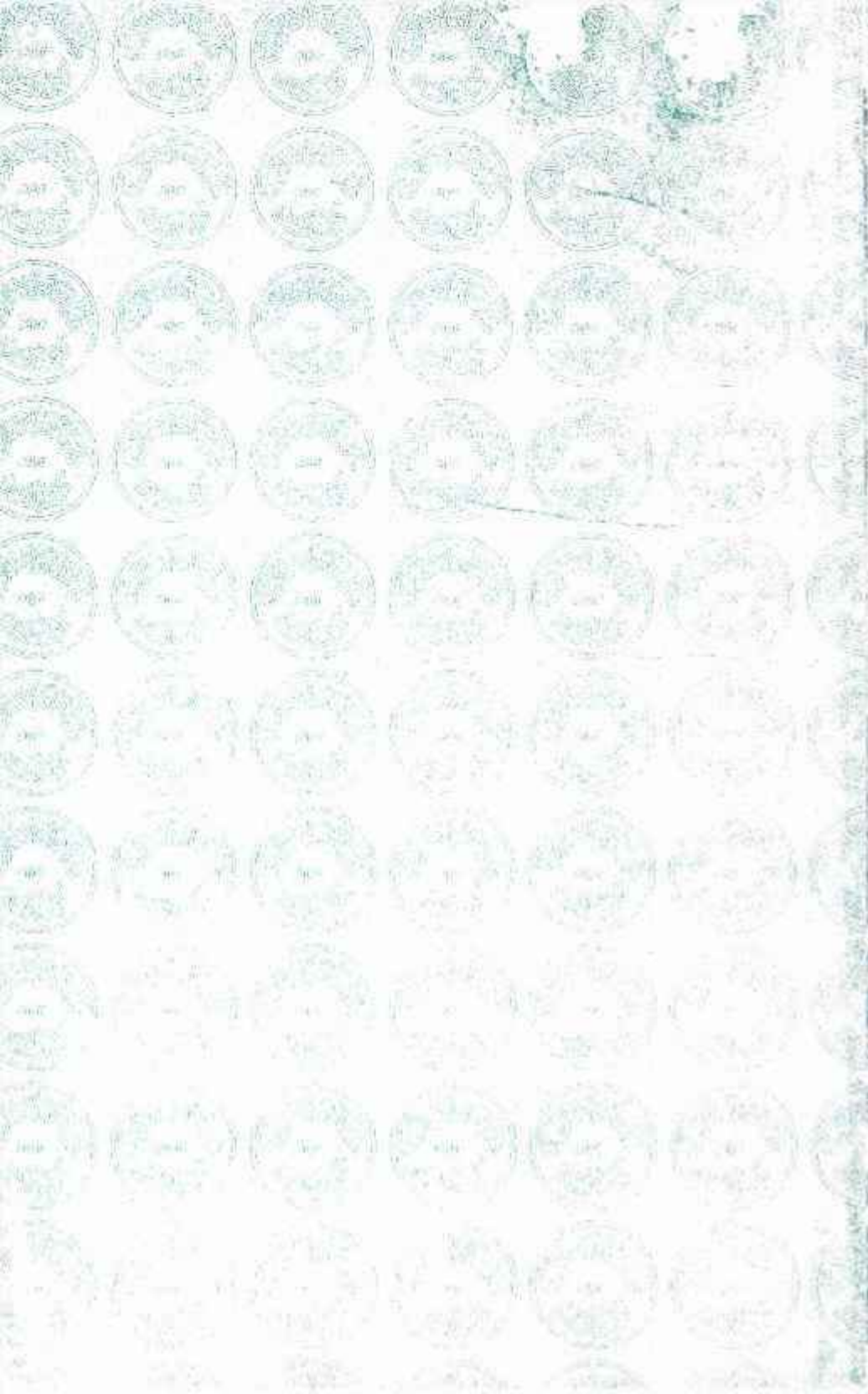
- ۲۲۳۔ بت اور بت پرستی کا نتیجہ۔
- ۲۲۵۔ شبیہ سازی۔
- ۲۲۶۔ کسی چیز کو شعائر قرار دینے کیلئے شبیہ سازی۔
- ۲۳۰۔ شبیہ سازی یا ظلم روا کی یا ظلم کی ترویج۔
- ۲۳۳۔ ستارہ پرستان۔
- ۲۳۷۔ حضرت ابراہیمؑ اور علم نجوم۔
- ۲۴۲۔ ستاروں کے ہماری زندگی پر اثرات۔
- ۲۴۶۔ شمس اور سعادت میں ستاروں کا کردار۔
- ۲۴۷۔ نحوست اور سعادت کلمات امیر المومنینؑ کی روشنی میں۔
- ۲۴۹۔ ایام میں نحوست و سعادت اور اسکی حقیقت۔
- ۲۵۱۔ عناصر ترکیبی زمان۔
- ۲۵۴۔ معاشرہ میں نحوست کو، کون فروغ دیتا ہے۔
- ۲۵۹۔ تاریخ اور دنوں کی نحوست قرآن و سنت کے منافی ہے۔
- ۲۶۰۔ نحوست کہاں سے آئی۔
- ۲۶۳۔ عبادت غیرین۔
- ۲۶۶۔ سورج اور اسکی حرارت۔
- ۲۶۹۔ زمین۔











اس قرآن کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟



